اضافوں کے ساتھ جدید ایڈیشن

اسلام اور مغرب تعلقات

ڈاکٹر محمود احمد غازی

Research Academy for Higher Education & Technology
RAHET

دار العلم والتحقیق
برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

Marfat.com

MF No 213233

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام اور مغرب تعلقات

Marfat.com

دار العلم والتحقیق

برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

Marfat.com

مطبوعات:۲

اسلام اور مغرب تعلقات

مجموعہ محاضرات

جدید اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن

دنیائے اسلام اور دنیائے مغرب کے روابط، کش مکش اور باہمی تعلقات کی مختلف جہتوں اور حیثیتوں کا مطالعہ اور اس باب میں دنیائے اسلام کی ذمے داریاں

مؤلف

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ترتیب وتدوین

سید عزیز الرحمٰن

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب:	اسلام اور مغرب تعلقات
مؤلف:	ڈاکٹر محمود احمد غازی
ترتیب وتدوین:	سید عزیز الرحمٰن
پہلا ایڈیشن:	دسمبر ۲۰۰۹ء
دوسرا ایڈیشن:	نومبر ۲۰۱۲ء
اشاعت سوم:	نومبر ۲۰۱۶ء
تعداد:	ایک ہزار
کمپوزنگ:	سید قادر معین (بابر)
صفحات:	۳۶۸
قیمت:	۳۹۰ روپے

297.472
57
169364

اہتمام

دارالعلم والتحقیق برائے اعلیٰ تعلیم وٹیکنالوجی

www.rahet.org

ناشر

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر۴، کراچی

Marfat.com

۵۵۲۹۸/۱/۱۲

فہرست

انتساب		۶
پیش گفتار	سید عزیز الرحمٰن	۷
عالم گیر اسلامی معاشرہ		۱۱
یورپ پر اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات		۲۹
اسلام اور مغرب۔ موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز		۴۷
مکالمہ بین المذاہب۔ مقاصد، اہداف، اصول وضوابط		۹۵
عالمی امن کے قیام کے لئے تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت		۱۴۹
مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج۔ اور علما کی ذمے داریاں		۱۹۹
جدید تہذیبی تصادم اور اسلام		۲۴۱
اسلامی دنیا اور نیا عالمی نظام		۲۴۹
نئے عالمی نظام کی تشکیل اور امت مسلمہ کی ذمے داریاں		۲۷۳
دفاعِ اسلام اور مطالعہ مسیحیت		۲۹۷
مسیحیت کے بین الاقوامی عزائم		۳۱۷
علامہ اقبالؒ کی تنقید مغرب		۳۴۳

Marfat.com

انتساب

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام

جنہوں نے اپنی عالمانہ تحریروں کے ذریعے
مغرب شناسی اور مغرب فہمی کی طرف توجہ دلائی اور
امت مسلمہ کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے عمل میں
مغرب فہمی کی اہمیت کو واضح کیا

محمود احمد غازی

Marfat.com

پیشِ گفتار

اسلام اور مغرب تعلقات آج کا تازہ اور زندہ ترین موضوع ہے۔ مگر چوں کہ یہ موضوع نہایت وسعتوں کا حامل ہے اور کثیر الجہت ہونے کے سبب اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں سے نہایت دقتِ نظر، اصابتِ فکر اور اپنی تمام جہتوں سے واقفیت کا تقاضا کرتا ہے، اس لئے اس موضوع پر خصوصاً اردو میں مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس بنا پر اس موضوع پر عام قاری سے لے کر اہل قلم تک کسی کے لئے مکمل راہ نمائی کا سامان موجود نہیں ہے۔

موجودہ کتاب عالم اسلام کی معتبر شخصیت جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مختلف اوقات میں دیئے گئے محاضرات (لیکچرز) کا مجموعہ ہے۔ چوں کہ یہ تمام محاضرات علیحدہ علیحدہ اوقات میں، علیحدہ علیحدہ مجالس میں، علیحدہ علیحدہ سامعین کے سامنے پیش کئے گئے، اس لئے مجموعے کا اسلوب کسی مرتب انداز میں تحریر شدہ کتاب کے اسلوب سے مختلف ہے۔ اگر چہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ مباحث میں تکرار یا زیادہ بے ربطی نہ ہو۔

یہ موضوع جس قدر ہمہ جہت ہے، اسی قدر حساس بھی ہے، فاضل مؤلف ایک طرف مشرق کی علمی، دینی اور تہذیبی روایات کے امین ہیں، تو دوسری جانب وہ مغربی فکر، اسلوب تحقیق، اندازِ زیست، مغرب کی موجودہ سیاسی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی صورت حال اور اس کے تاریخی پس منظر سے بہ خوبی واقف ہیں، اس بنا پر اسلام اور مغرب تعلقات کے حوالے سے ان کا تجزیہ ایک صاحب نظر مبصر اور دیدہ ور مفکر کا تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی اہم خوبی یہ ہے کہ انتہائی حساس موضوع پر بھی وہ خام جذباتیت اور افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتی۔ یہ خوبی ان

Marfat.com

تحریروں میں بھی موجود ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ تمام محاضرات علیحدہ علیحدہ اوقات میں دیئے گئے، مگر ان کا مرکزی خیال اور پیغام ایک ہے، اور پیغام کی اہمیت کے سبب ہی راقم نے ڈاکٹر صاحب سے ان تحریروں کو یک جا کرنے کی اجازت چاہی، جو انہوں نے ازراہِ عنایت عطا فرمادی، جس پر راقم شکرگزار ہے۔

راقم نے کوشش کی ہے کہ یہ زبانی گفتگو تحریری اسلوب میں ڈھل جائے، اور قرآن و حدیث کے ضروری حوالہ جات بھی حاشیے میں دے دیئے گئے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ فاضل مقرر نے ان محاضرات پر نظر ثانی بھی فرمائی ہے، جس کے سبب اس مجموعے کی افادیت و استناد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ کتاب ایک ایسے موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے جب اسلام اور مغرب تعلقات دوراہے پر کھڑے ہیں، اس موقعے پر حالات کا صحیح تناظر میں جائزہ لینا اور آئندہ کے لئے مفید لائحہ عمل کی تیاری ہمارے لئے انتہائی ناگزیر ہے۔ راقم کو یہ کہنے میں ادنیٰ تامل نہیں ہے کہ یہ کتاب اس ضرورت کی تکمیل میں انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ان سطور کو فاضل مؤلف، مرتب اور تمام عالم اسلام کے لئے مفید بنائے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین

سید عزیز الرحمٰن

۲۷ر ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ

۱۵ر دسمبر ۲۰۰۹ء

Marfat.com

طبع دوم

اس مجموعۂ محاضرات کی پہلی اشاعت صاحب محاضرات ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کی حیات ہی میں ۲۰۰۹ء کے اواخر میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ اور بہت سی خواہشات، آرزوئیں، منصوبے اور تمنائیں تشنۂ تکمیل رہ گئیں۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تو نئی اشاعت کے بارے میں سوچنا شروع کیا، مگر ڈاکٹر صاحب کی بہت سی چیزیں، مضامین اور محاضرات بکھرے ہوئے تھے، انہیں یک جا کرنا بھی ایک کام تھا۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحب کے ایک عقیدت مند نے ان کے نام سے جب ویب سائٹ کا اجرا کیا(۱) تو مزید بہت سی چیزیں سامنے آئیں۔ اس وقت یہ خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے سلسلۂ محاضرات کی ہر جلد ۱۲ خطبات پر مشتمل ہے۔ اس لئے اگر یہ مجموعے میں بھی اس عدد کا اہتمام ہو جائے تو اس کا تسلسل محاضرات کی تعداد کے لحاظ سے بھی معتبر ہو جائے گا۔ سو الحمد للہ اب یہ مجموعہ ۱۲ خطبات و محاضرات پہ مشتمل ہے۔ اس طرح اس ایڈیشن میں درج ذیل محاضرات کا اضافہ کیا گیا ہے:

۱۔ عالم گیر اسلامی معاشرہ

۲۔ یورپ پر اسلامی تہذیب و ثقافت کے اثرات

۳۔ عالمی امن کے قیام کے لئے تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت

۴۔ جدید تہذیبی تصادم اور اسلام

۱۔ ویب سائٹ کا پتہ ہے: www.dr mahmood ghazi.org

Marfat.com

۵۔اسلامی دنیا اور نیا عالمی نظام

۶۔مسیحیت کے بین الاقوامی عزائم

اس دوران ڈاکٹر صاحب کے کراچی میں دارالعلم والتحقیق کے زیر اہتمام ہونے والے مولانا سید زوار حسین شاہ رحمہ اللہ یادگاری خطبات ''خطبات کراچی'' کے عنوان سے مرتب وشائع کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی، الحمدللہ۔ نیز محاضرات علمی کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے مختلف موضوعات پر بکھرے ہوئے خطبات مرتب ومدون کرنے کے منصوبے پر بھی کام جاری ہے، اس سلسلے کی کئی جلدیں متوقع ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس سلسلے کی بھی ہر جلد ۱۲ خطبات پر ہی مشتمل ہو۔ اس ایڈیشن میں ۶ خطبات ومحاضرات کے اضافوں کے ساتھ ساتھ پوری کتاب کے پروف دوبارہ پڑھے گئے ہیں اور ان محاضرات کی نوک پلک سنوارنے پر بھی مزید توجہ دی گئی ہے۔ اس لئے امید ہے موجودہ کاوش زیادہ پسند کی جائے گی۔ اور قارئین نقش ثانی کو نقش اول سے مفید تر پائیں گے۔

سید عزیز الرحمٰن

۹ رذی الحجہ ۱۴۳۳ھ

۲۵ اکتوبر ۲۰۱۲ء

Marfat.com

عالم گیر اسلامی معاشرہ

تعارف اور خدخال

Marfat.com

عالم گیر اسلامی معاشرہ

آج کل دنیا میں اس بات کا بڑا چرچا ہے، خاص طور پر مغرب میں کہ ایک کثیر العناصر یعنی ''پلورلسٹک'' معاشرہ کیسے وجود میں لایا جائے۔ یعنی ایک ایسا انسانی معاشرہ کیسے وجود میں لایا جائے جس میں تمام رنگوں، نسلوں، اور عقیدوں کے انسان عزت سے زندگی گزار سکیں۔ بعض معاشرے بڑے یک عنصری معاشرے ہوتے ہیں۔ جن میں ایک ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن ماضی میں ایسا آسانی سے ہوسکتا تھا کہ کسی معاشرے میں ایک ہی رنگ، نسل یا زبان کے لوگ بس سکیں اور دوسروں کو وہاں بسنے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن آج ایسا نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا کا ہر بڑا شہر ایک کثیر العناصر شہر ہے، جہاں دنیا سے ہر قسم کے لوگ آ کر بستے ہیں۔ دنیا بھر کی ثقافتیں اور تہذیبیں بڑے بڑے شہروں میں آ کر مل گئی ہیں۔ دنیا بھر کے عقائد و نظریات ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ آج دنیا کا ہر بڑا شہر اسی طرح کا کثیر العناصر شہر ہے۔ ایسے ماحول میں جو آئندہ بڑھتا اور پھیلتا ہی جائے گا اور جس میں ہر بڑا شہر زیادہ سے زیادہ کثیر العناصر ہوتا چلا جائے گا، اس ماحول میں کوئی یک عنصری نظام نہ چل سکتا ہے اور نہ کام یاب ہوسکتا ہے۔ اس صورت حال میں تو وہی نظام کام یاب ہوسکتا ہے جو کثیر العناصر ہو۔ یہ نظام صرف اسلام کا بین الاقوامی قانون ہی فراہم کرسکتا ہے۔ جس میں دنیا کے سارے انسانوں کی ضروریات کا سامان موجود ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرے بین الاقوامی قوانین میں جو مختلف اقوام میں پیدا

Marfat.com

ہوئے، ایک ایسا ناقابل تبدل اندرونی تصور موجود ہے جو ان کو کثیر العناصر بننے سے روکتا ہے۔ یہ نظام اور قوانین کسی کثیر العناصر یا ''پلورلسٹک'' معاشرے کو خوش دلی کے ساتھ آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ان میں ایسی جکڑ بندیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ترقی نہیں کر سکتا۔ جو نظام ایک خاص رنگ کے لوگوں کو بالا دست مانتا ہو اور جہاں لوگوں میں اندر سے یہ تعصب پیدا ہو گیا ہو کہ فلاں علاقے کے لوگ دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک کثیر العناصر انسانی معاشرہ قائم کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ارسطو بہت بڑا فلسفی ہے جس کی فلسفیانہ کاوشوں کے سامنے دنیا نے سر اعتراف خم کیا ہے، مشرق و مغرب نے اس کی عقلی و فکری امامت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بھی ان تعصبات سے بالاتر نہیں ہو سکا۔ وہ کہتا ہے کہ غیر یونانیوں کو فطرت نے یونانیوں کی غلامی کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر افلاطون کو دیکھئے جو دنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑا حکیم اور فلسفی ہے، جس کو بعض مسلمانوں نے افلاطون الٰہی کہا ہے۔ جس کی کتاب جمہوریہ ہر دور میں ایک مثالی ریاست کا ایک بڑا نمونہ سمجھی گئی۔ اس نے بھی اپنے مثالی نظام میں کچھ لوگوں کو مستقل غلامی کے لئے لازمی قرار دیا۔

یورپ کا موجودہ نظام جس کی اصل فکری بنیادیں یونانیوں کے تصورات پر قائم ہیں۔ پھر جس پر رومیوں کے مادہ پرستانہ تصورات اور شہنشاہیت زدہ اداروں نے بڑا گہرا اثر ڈالا اور پھر بالآخر جس کو قرونِ وسطیٰ کی مسیحیت سے ایک نئی روح اور زندگی ملی۔ آج وہ نظام ہمارے سامنے ہے۔ یہ سارے عناصر اس نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لئے اس نظام کے لئے یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ جائز طور پر تمام انسانوں کو اپنا حقِ مساوات کے ساتھ دے دے اور پھر کوئی متوازن نظام دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ شاید ان کے لئے فکری، نفسیاتی اور جذباتی طور پر ایک دشوار عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو نظام وہ دنیا کو دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں، اس میں مغرب کی چار بڑی طاقتوں کی بالادستی قائم ہے، اقوام متحدہ کا فیصلہ کن ادارہ سلامتی کونسل ہے جس میں پانچ مستقل ارکان کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، پوری دنیا کے دو اڑھائی سو ممالک ایک طرف ہوں اور ان پانچ میں سے

Marfat.com

صرف ایک ملک بل کہ اس ملک کا ایک شخص جب چاہے پوری دنیا کے متفقہ فیصلے کو مسترد کر سکتا ہے۔ برطانیہ جو انتہائی چھوٹا سا ملک ہے۔ اگر ہمارے سامنے پوری دنیا کا نقشہ موجود ہو تو شاید وہ نظر بھی نہ آئے، اس کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ساری دنیا کی متفقہ رائے کو کالعدم قرار دے دے۔ یہ کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ مغرب میں جبلی طور پر اپنی بالاتری اور بالادستی کا تصور موجود ہے۔ مغرب کے ذہن، مزاج اور نفسیات میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے کہ ہم دنیا کی تمام غیر گوری اقوام کے لئے معلم اخلاق اور مدرس تہذیب ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب گورے انسان کی ذمے داری یا ''وہائٹ مینز برڈن'' کی اصطلاح انہوں نے وضع کی تھی۔ اس پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس پر فلسفے گھڑے گئے۔ اس پر نظریات بنائے گئے کہ ہم دنیا کو اخلاق و کردار سکھانے پر مامور کیے گئے ہیں۔ ہم دنیا کو مہذب بنانے کے لئے مامور کیے گئے ہیں۔ یہ مثالیں کوئی شکایت کے طور پر نہیں عرض کی جا رہی ہیں۔ بل کہ یہ واضح کرنے کے لئے عرض کی جا رہی ہیں کہ دنیا کی مختلف اقوام میں فکری طور پر ایسے تعصّبات موجود ہیں جنھوں نے ان کے نظام اور تصورات کو بین الاقوامی اور بین الانسانی تصورات نہیں رہنے دیا۔

آج سے چند سال پہلے ۱۹۹۳ء میں امریکہ میں ایک پارلیمنٹ کا انعقاد کیا گیا جس میں دنیائے اسلام کے اہلِ علم کو بھی بلایا گیا۔ اس طرح کی ایک پارلیمنٹ ۱۸۹۳ء میں بھی منعقد کی گئی تھی، جس میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے علماء بھی مدعو کیے گئے تھے، جس میں طے کیا گیا تھا کہ سو سال کے بعد دوسری پارلیمنٹ آف ورلڈ ریلیجز کا انعقاد کیا جائے گا جو ۱۹۹۳ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسانوں کی اس کثرت میں وحدت کیسے پیدا کی جائے اور وحدت قائم کرنے کے بعد اس کو کیسے اعتدال کی حدود میں رکھا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنے کے بعد اور دنیا میں ایک نیا عالمی نظام دینے کے بعد بھی یہ ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے کہ وحدت میں کثرت کا علاج تلاش کیا جائے۔ یعنی وحدت اور کثرت میں ایک اعتدال کیسے پیدا کیا جائے کہ وحدت کثرت پر اور کثرت وحدت پر اثر انداز نہ ہو۔ اس طرح کی مساعی سے یہی امر

Marfat.com

واضح ہوتا ہے کہ دنیا کو ابھی تک ایسے بین الانسانی نظام کی تلاش ہے۔

اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں

دنیا کی ہر قوم اور ہر نظام کے ماننے والوں کا یہ حق ہمیشہ تسلیم کیا گیا کہ جب وہ اپنے لئے بین الاقوامی تعلقات کا نظام تشکیل دیں یا بین الاقوامی لین دین کے لئے قواعد وضوابط مرتب کریں تو اپنے اور پرائے کا فرق ملحوظ رکھیں۔ یہ بات انسان کے مزاج میں شامل ہے کہ وہ اپنے اور پرائے میں بہ ہر حال فرق رکھتا ہے۔ جو تعلقات اپنوں سے رکھے جاتے ہیں وہ پرایوں سے نہیں ہوتے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جو معاملہ وہ اپنے قریبی لوگوں سے کرتا ہے وہ معاملہ اجنبی لوگوں سے نہیں کرتا۔ یہ خاصۂ بشریت ہے کہ وہ اپنے کو اپنا اور پرائے کو پرایا سمجھے۔ اپنے کے ساتھ قربت اور مراعات کے روابط رکھنا اور پرائے سے نسبتاً اجنبیت برتنا بڑی حد تک انسان کے لئے فطری سی بات ہے۔ اسلام نے بھی دینِ فطرت ہونے کی حیثیت سے بہت سے احکام میں اس چیز کا خیال رکھا ہے۔

لیکن کس کو اپنا قرار دیا جائے اور کس کو پرایا سمجھا جائے؟ اس کا دارومدار قوموں کے اپنے تصورِ زندگی، نظریۂ حیات، قومی مزاج، تہذیبی پس منظر اور اصول تمدن پر ہوتا ہے۔ دنیا کی بعض اقوام نسلی وحدت اور یک جہتی کو اپنے اور پرائے کی بنیاد قرار دیتی ہیں۔ آج دنیا کی بہت سی بااثر اور بالادست اقوام ایک خاص نسل اور رنگ کے لوگوں کی حقیقی یا مصنوعی اور فرضی برتری کی بنیاد پر اپنے بین الاقوامی تعلقات کو استوار کرتی ہیں۔ آج بین الاقوامی تعلقات میں جس قوم کو ''موسٹ فیورڈ نیشن'' یعنی سب سے زیادہ مراعات اور توجہ کی مستحق قوم قرار دیا جاتا ہے اس کا بنیادی جذبہ اور محرک بھی اپنے اور پرائے کا فرق ہی ہوتا ہے۔ بعض دیگر اقوام رنگ کی بنیاد پر یہ امتیاز برتتی ہیں۔ ابھی ماضی قریب تک جنوبی افریقہ میں رنگ کے امتیاز کو باقاعدہ فلسفے کی حیثیت حاصل تھی، جس کی بنیاد پر سیاست، قانون، دستور، معاشیات، تعلیم حتیٰ کہ صحت اور شہری سہولتوں تک ہر چیز کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ آپ میں سے بہت سے حضرات نے سنا ہوگا کہ بعض نے دیکھا بھی ہو

Marfat.com

گا کہ کس طرح رنگ کے فرق کی بنیاد پر نسلی امتیاز کا یہ نظام بنایا گیا جو کئی سو سال جاری رہا۔ اس نظام میں انسانوں کی چار قسمیں قرار دی گئیں اور ہر قسم کے حقوق و فرائض کو اس طرح الگ الگ مرتب کیا گیا کہ ایک قسم یا گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے آدمی سے، ایک رنگ کا انسان دوسرے رنگ کے انسان سے اور ایک علاقے میں پیدا ہونے والا انسان دوسرے علاقے میں پیدا ہونے والے انسان سے نہ میل جول رکھ سکتا تھا، نہ برابری کی سطح پر لین دین کر سکتا تھا اور نہ ان سب گروہوں کے آپس میں مل جل کر بقائے باہمی کا تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔

آج ہمیں اور آپ کو اور دنیا کے بہت سے انسانوں کو یہ نظام مبنی بر ظلم معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس نظام کو غیر انسانی نظام کہتے ہیں۔ لیکن چند سال پہلے تک جنوبی افریقہ کی چالیس لاکھ آبادی پر مشتمل سفید فام اقلیت اور مغرب میں اس کے کروڑوں حامی اس نظام کا دفاع کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کو یہ نظام عدل و انصاف کے عین مطابق نظر آتا تھا۔ ان کو اس نظام میں خلاف عقل کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔ مجھے ۱۹۸۴ میں وہاں کے وزیر خارجہ بوتھا صاحب سے جو بعد میں نائب صدر بھی رہے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ ان کا تعلق سفید فام نسل سے ہے۔ گفت گو کے دوران انہوں نے نسلی امتیاز کے اس نظام کا بھی ذکر کیا جس کو وہاں کی اصطلاح میں اپارتھیڈ کا نظام کہا جاتا تھا، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا یہ نظام بڑا عجیب و غریب ہے۔ دنیا میں اس کو ناپسند کیا جاتا ہے، ادارہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اس کے خلاف قراردادیں منظور کرتی رہتی ہے، پھر بھی آپ اس نظام پر قائم ہیں، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر انہوں اس نظام کے دفاع میں ایک بڑی مفصل گفت گو کی، اس کی خصوصیات اور اپنی دانست میں اس کے فوائد کا ذکر کیا۔ ضروری نہیں کہ میں اور آپ اس سے اتفاق کریں۔ اور وہ تصور یہ ہے کہ یہ قوانین جس قوم کے ہیں اس قوم کو دیگر اقوام پر ایک نسلی، فطری اور جبلی برتری حاصل ہے۔

ہندوؤں کے ہاں اگر رامائن اور مہابھارت تاریخ ساز کتابیں ہیں تو اس کے ساتھ ایک تصور موجود ہے کہ آریا نسل دنیائے انسانیت پر ایک ایسی برتری رکھتی ہے کہ دنیا

Marfat.com

کا کوئی انسان اس کا مقابلہ یا اس کی برابری کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں کے ہاں چار ذاتیں ہیں جو ان کے ہاں نمائندہ طبقات ہیں۔ سب سے اعلیٰ طبقہ آریائی نسل کی باقیات ہے جو ایک طویل عرصے بل کہ ہزاروں سال سے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ برہمن نسل کی برتری، ہندو نظام اور ہندو معاشرے کے رگ و پے میں شامل ہے۔ ہندو نظام خواہ دور قدیم کا نظام ہو یا دور جدید کا اس کی اساس برہمن طبقے کی بالا دستی پر قائم ہے اور اسی طبقے کے سیاسی کنٹرول کے سہارے بھارت کا نظام چل رہا ہے۔

یہی حال یونانیوں کے ہاں ہے۔ یونان کا سب سے بڑا فلسفی جس کی عظمت کے سامنے پوری دنیا نے سر تسلیم خم کیا، جس کو مسلمانوں نے انتہائی غیر جانب داری سے معلم اوّل قرار دیا، یعنی عقلیات اور منطق کا سب سے پہلا معلم، یعنی ارسطا طالیس، اس نے اپنی کتاب سیاسیات میں جو اساس قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ غیر یونانیوں کو قدرت نے غلام رہنے اور بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ارسطو کے اس جملے کا موازنہ اس ابدی و ازلی اعلان سے کیا جائے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا:

متی استعبد تم الناس وقد ولد تهم امهاتهم احرارا (۱) ۔

تم لوگوں نے کب سے انسانوں کو غلام بنا لیا ہے، حال آں کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مصر کے گورنر عمرو ابن عاص کے صاحب زادے کا جو ایک نوعمر جوان تھے کسی مقامی مصری عیسائی کے ساتھ گھوڑ دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ اتفاق سے عیسائی کا گھوڑا آگے نکل گیا اور گورنر کے صاحب زادے کا گھوڑا پیچھے رہ گیا۔ گورنر کے صاحب زادے نے جوانی کے جوش میں مصری کو چابک مار دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ

۱۔ ابو القاسم عبد الرحمٰن بن عبد اللہ المصری۔ فتوح مصر و اخبارہا۔ بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۶ء: ص ۱۸۳

☆ ابن الجوزی۔ مناقب عمر بن الخطاب: ص ۹۹

Marfat.com

گھوڑے کو چابک مارنا چاہتے ہوں اور لگ مصری کے گیا ہو۔ مصری نے گورنر کو شکایت کی۔ گورنر نے صاحب زادے کو سرزنش کی، لیکن گورنر کی سرزنش کے باوجود مصری مطمئن نہ ہوا۔ مظلوم مصری مدینہ منورہ آیا۔ پتہ چلا کہ خلیفہ حج پر گئے ہیں، وہ بھی مکہ مکرمہ چلا گیا اور پوری دنیا کے حجاج کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ خلیفہ کے سامنے گورنر مصر موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصول بنا رکھا تھا کہ ہر گورنر ہر سال حج کیا کرے اور پبلک میں اگر اس کے خلاف کوئی شکایت ہو تو جواب دیا کرے۔ چناں چہ مقدمے کی سماعت ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاملے کی ساری تحقیق کی اور یہ پایا گیا کہ گورنر کے صاحب زادے نے واقعی زیادتی کی ہے۔ آپ نے مصری کو حکم دیا کہ بدلہ لے لو۔ گورنر مصر کے صاحب زادے کا دعویٰ تھا کہ وہ ابن الاکرمین یعنی شریف زادوں کا بیٹا ہے، لیکن اس دعوے کی اسلامی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت عمر نے مصری سے کہا کہ مار اس شریف زادے کو۔ یہ بات آپ نے اس لئے فرمائی کہ نسلی برتری کا غماز یہ جملہ ایک صحابی زادے کے منہ سے نکلنا گوارہ نہ کیا جاسکتا تھا۔ اسی موقع پر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا تھا:

متی استعبد تم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا

تم لوگوں نے کب سے انسانوں کو غلام بنالیا ہے، حال آں کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

یہ تصور کہ ہمارے علاوہ تمام انسان دوسرے درجے کے انسان ہیں۔ ہندو یا یونانیوں کے ہاں ہی نہیں ہے، بل کہ یہ مستغرانہ تصور دنیا کی کئی قوموں میں رائج رہا ہے۔ یورپ میں یونانیوں کے علاوہ بعد میں اسے رومن ایمپائر نے بھی اسے اپنایا۔ رومن ایمپائر کے جب قوانین مرتب کیے جا رہے تھے اور بین الاقوامی اصول وضوابط کو منظم کیا جا رہا تھا تو انہوں نے پوری نسل انسانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ایک رومن دوسرے غیر رومن۔ غیر رومنوں کو انہوں نے بربری یا غیر مہذب قرار دیا اور ان کے لئے ایک نیا قانون مرتب کیا۔ یہ نیا قانون جن کا انطباق دنیا کی تمام غیر رومن اقوام پر ہوتا تھا وہی قانون ہے جس

Marfat.com

کوانہوں نے Droit desgens یعنی قانون اقوام کا نام دیا۔ یہی وہ وہ قانون ہے جس کی بنیاد سے اور جس کی کوکھ سے یورپ کے موجودہ بین الاقوامی قانون نے جنم لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بڑے عرصے تک بین الاقوامی قانون کو فرانسیسی زبان میں Droit des gens قوموں کا قانون اور انگریزی میں Law of Natoins کہا جاتا رہا ہے۔ قانون یا Law Of Nations سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علاوہ دنیا کی تمام اقوام اور قومیں ہم سے کم تر مقام رکھتی ہیں ان کے لئے قانون علیحدہ ہوگا، اور ہمارے اپنے معاملات کو نمٹانے کے لئے، یا بالفاظ دیگر ہم جیسے برتر لوگوں کے لئے قانون الگ ہوگا۔ چناں چہ رومیوں نے دو الگ الگ قانون وضع کیے۔ یہ قانون جسے وہ قانون اقوام کے نام سے یاد کرتے تھے دراصل غیر رومیوں اور غیر مہذب لوگوں کے لئے بنایا گیا تھا اور اسی کی بنیاد پر آج کا بین الاقوامی قانون مرتب ہوا ہے۔ لہٰذا ''غیر مہذب'' لوگوں کو دوسرے درجے کا انسان سمجھنا اس قانون کی جنم گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔

سب سے پہلا بین الاقوامی یونٹ جو بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں قائم ہوا وہ شہری ریاستیں تھیں۔ یورپ کے مفکرین کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ وہ جب کسی بھی چیز کی تاریخ کو ترتیب دیتے ہیں یا کسی موضوع پر اظہار خیار کرتے ہیں تو ان کی گفت گو کا آغاز بھی یورپ سے ہوتا ہے اور انجام بھی یورپ پر۔ یورپ سے باہر نہ بیشتر مغربی اہل فکر کو دنیا نظر آتی ہے نہ علم و فکر نظر آتا ہے، نہ کسی انسان کا کوئی علمی و عقلی کارنامہ نظر آتا ہے۔ یہی حال بین الاقوامی قانون کے میدان میں بھی ہے۔ وہ بین الاقوامی قانون کا آغاز یونان کی شہری ریاستوں سے کرتے ہیں، جہاں درجنوں شہری ریاستیں اور چھوٹی بڑی، مختلف نظاموں کے تحت چلنے والی ریاستیں موجود تھیں۔ ان کے درمیان سفارتی تعلقات بھی تھے، ان کے درمیان دوسرے مراسم بھی تھے۔ ایک طویل عرصہ جس کی طوالت کا اندازہ کئی سو سال لگایا جاتا ہے اس حال میں گزرا کہ ان کے درمیان تعلقات کو منضبط طور پر قائم کرنے کے لئے کوئی ضابطہ یا قانون موجود نہ تھا۔ پھر وہاں کے فلسفیوں اوز دانش وروں نے نوامیس یونان یا لاز آف دی ہلےنیس کے نام سے قوانین مرتب کیے۔ یہ قوانین جن کا کچھ

Marfat.com

مدون حصہ آج بھی پایا جاتا ہے، بین الاقوامی قانون کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہے۔ ان قوانین میں جو بات واضح طور پر ملتی ہے اور آج بھی مغربی قانون دان اس کو بلا تامل دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ قوانین یونانیوں کے آپس کے تعلقات اور میل جول کو مرتب کرنے کے لئے تھے۔ یہ بربریوں، غیر مہذب لوگوں اور غیر یونانیوں کے لئے نہیں تھے۔

یہ بعینہ وہی بات ہے جو ہندوستان کے برہمنوں اور ہندوؤں میں نظر آتی ہے، گویا صرف یونانیوں کے ہاں ہی نہیں بل کہ دنیا کی تمام اقوام میں دو طرح کے قانون ہوتے تھے۔ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں ایک نظام قانون تو وہ جو اپنوں کے لئے ہے اور دوسرا قانون وہ جو دوسروں کے لئے ہے، اور یہ دوسرا قانون دراصل کوئی باقاعدہ قانون نہ ہوتا تھا، بل کہ اس کا صرف ایک اصول تھا، اور وہ یہ کہ ہماری پسند و ناپسند کی بنیاد پر جو معاملہ دوسروں کے ساتھ طے کیا جائے وہ قانون ہے۔

چناں چہ اس مجموعہ نوامیس میں بھی جو قانون دیئے گئے وہ صرف یونانیوں کے باہمی میل جول کے لئے ہیں۔ یونانیوں کے علاوہ خود یونان میں جو غیر یونانی تھے مثلاً غلام کہ ان کی ذمے داریاں کیا ہوں گی؟ ان کے ہاں اسی سلسلے میں کوئی قانون نہ تھا۔ یونانی غلاموں کے علاوہ دیگر اقوام سے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی؟ ان تعلقات کی کیا بنیاد ہو گی؟ اس سلسلے میں سوائے ان کی ذاتی پسند و ناپسند کے کوئی بنیاد ہی نہ تھی۔ گویا اس سلسلے میں ان کے قوانین تمام تر صواب دیدی تھے۔

یونانیوں کا دور ختم ہوا اور رومیوں کا دور شروع ہوا اور بہت جلد وہ سلطنت قائم ہوئی، جس کا تاریخ میں عظیم رومن ایمپائر کے نام سے ذکر ملتا ہے، جس کے مختلف ارتقائی ادوار بیان کیے گئے ہیں۔ عظیم رومن ایمپائر۔ ہولی (Solly) رومن ایمپائر، دور متوسط کی رومن ایمپائر وغیرہ۔ یہ ساری کی ساری ریاستیں ایک ہی تصور پر قائم تھیں، اور یہ تصور آج تک مغرب کے نظام بین الاقوام میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ رومن ایک بالادست قوم ہے، جس کو تمام دنیا پر حکومت کرنے اور تمام دنیا کو غلام بنانے کا اختیار موجود ہے۔ یہ بات محض

Marfat.com

کسی فلسفی یا مفکر کے ذہن میں نہیں تھی، بل کہ اسے واضح طور پر الفاظ کی صورت میں لکھا گیا ہے، اور بار بار اس کو بیان کیا گیا ہے کہ رومن قوم کرہ ارض کی مالک ہے اور روم سے باہر کی اقوام ان کی مملوکہ اور غلام ہیں، ان سے ہر طرح کا معاملہ کرنے کا رومیوں کو اسی طرح اختیار ہے جس طرح آقا کو غلام سے ہر طرح کا معاملہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے قانون آزاد انسانوں کے لئے ہوتا ہے اور حقوق آزاد انسانوں کے ہوتے ہیں۔ جو غلام ہوتا ہے اس کے لئے نہ قانون ہوتا ہے نہ مراعات ہوتی ہیں نہ حقوق ہوتے ہیں۔ اس لئے عظیم رومن قانون ہو یا دور جدید کا قانون بین الاقوام ہو، اس میں ایشیا اور افریقہ غلاموں کے لئے طے شدہ قوانین کا کوئی تصور موجود نہیں۔ یہ تمام چیزیں ماضی میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں۔

اس سرسری جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب میں آج کل پلوسٹک معاشرے کا جو شور و غوغا ہے اور جس کی آڑ میں وہ مسلمانوں پر معاشرتی تفریق و امتیاز کے الزامات لگا کر ہمیں بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یہ محض آج کل کا ایک نظری تصور ہے۔ عملی طور پر پوری مغربی تاریخ میں ایسے کثیر العنصری معاشرے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اس کے برعکس یہ اسلام ہی ہے جس نے دنیا میں عالم گیر اجتماعی معاشرت کا ڈول ڈالا۔ اس سلسلے میں چند باتیں قابل توجہ ہیں:

ایک یہ کہ کسی بھی قوم نے ماسوائے مسلمانوں کے بین الاقوامی انصاف کی بنیاد پر دنیا کو کوئی قابل عمل عالمی نظام نہیں دیا، جس کے تحت دنیا کی کم زور اور بے اثر اقوام کو عزت اور مساوات حاصل ہو سکتی۔

دوسرے یہ کہ ان تمام نظاموں نے دنیا میں انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیے رکھا۔ کہیں دو حصوں میں، کہیں تین حصوں میں، اور کہیں چار حصوں میں۔ اس تقسیم میں طاقت ور گروہ کو بے تحاشا اختیارات حاصل تھے، اور کم زور ترین ہر قسم کے حقوق سے محروم تھا۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن پاک نے واضح طور پر غلط قرار دیا۔ فرعون کے بارے

Marfat.com

میں فرمایا:

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ (۱)

یقیناً فرعون زمین پر سرکش ہو گیا تھا اور اس نے وہاں کے لوگوں کے کئی گروہ بنا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کو کم زور کر رکھا تھا کہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ تھا ہی مفسدوں میں سے۔

یہ فرعون ہی تھا جس نے زمین میں اپنے آپ کو بالا دست قرار دیا، وہاں کے لوگوں کو (مصریوں کو) گروہوں میں تقسیم کیا، بعض کو کم زور قرار دیا، ان کی اولاد کو قتل عام کا نشانہ بنایا۔ قرآن نے اس کردار کے شخص کے بارے میں اعلان کیا کہ انہ کان من المفسدین کہ وہ فساد پھیلانے والوں کو میں سے تھا، چناں چہ قرآن کی نظر میں ہر وہ نظام خواہ داخلی ہو یا خارجی، جو انسانوں کے درمیان مساوات کی بہ جائے درجہ بندی پر ایمان رکھتا ہو، جہاں دولت مند اور بااثر لوگ ہی حقوق و مراعات سے متمتع ہوتے ہوں اور باقی لوگ ثانوی حیثیت رکھتے ہوں فرعونی نظام ہے۔

دنیا میں ہر نظام خواہ وہ کتنا ہی غیر عقلی اور غیر انسانی معلوم ہوتا ہو، اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور تصور حیات رکھتا ہے جس کی بنیاد پر وہ زندگی کی تمام تفصیلات طے کرتا ہے۔ اسی فلسفے اور تصور حیات کی بنیاد پر وہ کچھ لوگوں کو اپنے سے قریب اور کچھ کو اپنے سے بعید قرار دیتا ہے۔

لیکن اسلام نے ان میں سے کسی بنیاد کو بھی قبول نہیں کیا۔ اپنے نظام کی بنیاد کے طور پر اس نے جغرافیائی وحدت، علاقائی قربت، نسلی عصبیت، لسانی یک جہتی یا ایسے ہی دوسرے تعصّبات کو قبول نہیں کیا۔ اسلام نے صرف ایک چیز کو اپنے نظام کی بنیاد مانا، جس

۱۔ القصص: ۴

169364

Marfat.com

کے بارے میں اس نے اعلان کیا کہ یہ کائنات کی سب سے بڑی اور سب سے اولین حقیقت ہے، جس پر تمام انسانوں کو متحد کر کے ایک بین الانسانی نظام اور بین الانسانی نظریہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ واضح بات یہ ہے کہ نوع انسانی میں رنگ رنگ کی مخلوقات موجود ہیں۔ ہر ایک کا ایک پیدائشی رنگ ہے جس کو بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ کوئی کالا گورا نہیں ہو سکتا اور کوئی گورا کالا نہیں بن سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کسی ایک رنگ کی بالادستی کی بنیاد پر بنی نوع انسان کو متحد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ ہزاروں زبانیں ماضی میں بولی جا کر فنا کے گھاٹ اتر چکی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کتنی زبانیں وجود میں آئیں گی۔ لہٰذا کسی ایک لسانی بنیاد کو تمام انسانوں کے لئے اساس وحدت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی حال نسلی بنیاد کا ہے۔ دنیا میں سیکڑوں نسلیں موجود ہیں، حقیقی بھی اور وہمی بھی۔ کوئی بھی شخص جس طرح اپنا رنگ نہیں بدل سکتا، اس طرح اپنی نسل بھی نہیں بدل سکتا۔

صرف نظریہ اور عقیدہ ہی ایسی چیز ہے جس پر دنیا کے انسانوں کو، بلا امتیاز رنگ ونسل، متحد کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بنیادوں کے برعکس عقیدہ اور نظریہ انسان اپنی آزاد مرضی اور شعوری ارادے اور اختیار سے اپناتا ہے۔ وہ غلط نظریات سے تائب ہو کر درست نظریہ جب چاہے اختیار کر لے۔ باطل عقائد سے جب توفیق ہو دست بردار ہو کر صحیح عقیدہ اپنا لے۔ اس لئے اگر انسان ایک عاقل اور باشعور مخلوق ہے تو اس کے نظام اور اجتماعیت کی بنیاد بھی اس کی شعوری کوشش اور عاقلانہ فیصلے کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئے اور وہ کوئی ایسی بنیاد ہی ہو سکتی ہے جس کو انسان اپنے آزادانہ فیصلے سے اپنا سکے۔ رنگ، نسل اور جائے پیدائش انسان کے اپنے اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں۔ اس لئے ان کی بنیاد پر اسلام کے بین الاقوامی قانون کی عمارت استوار نہیں کی جا سکتی۔

اس لئے اسلام نے نظریے اور عقیدے ہی کو اجتماعیت کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اسی بنیاد پر اسلام کا سارا فلسفہ زندگی اور نظام حیات استوار ہوتا ہے، اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلام کے قانون بین الممالک کی اساس ہے۔ اسی پر اسلامی ریاست کے

Marfat.com

تعلقات دوسری ریاستوں سے منظم ہوتے ہیں۔ جب ایک بار یہ بنیاد تسلیم کر لی جائے کہ جو انسان ایک مشترک عقیدے اور نظریے کے پابند ہیں وہ ایک الگ امت کی تشکیل کرتے ہیں تو یہ بات خود بہ خود تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ان کے آپس کے تعلقات کی بنیاد بھی وہی عقیدہ اور نظریہ قرار پائے گا۔ دوسروں سے ان کے تعلقات کی نوعیت کا تعین بھی ان نظریات اور عقائد ہی کے حوالے سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ نوعیت اس نوعیت سے مختلف ہو گی جو دوسرے انسانوں کے آپس کے تعلقات میں پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کتاب نے رنگ، نسل اور زبان کو قومیت کی بنیاد کے طور پر قبول نہیں کیا، بل کہ قرآن مجید نے نظریے اور عقیدے ہی کو قومیت اور امت کی اساس مانا ہے۔ آپ قرآن کو اول سے لے کر آخر تک پڑھ جایئے تو اس میں آپ کو یہ خطاب کہیں نہیں ملے گا کہ اے عربو! تم ایسا کرو، یا اے عجمیو! تم ایسا مت کرو، اے ایشیائیو، اے افریقیو۔ اس کے برعکس قرآن پاک یا تو مجموعی طور پر بنی نوع انسان سے خطاب کرتا ہے، یا پھر لوگوں کو ان کے عقائد و نظریات کے حوالے سے یاد کرتا ہے۔ قرآن مجید میں کم از کم اٹھارہ مرتبہ بنی نوع انسان سے (ایھا الناس کہہ کر) خطاب کیا گیا ہے، یا وہاں مخاطبین کے عقیدے اور مذہب کے حوالے سے بات کہی گئی ہے۔ مثلاً یا ایھا لذین آمنوا ۔ یا اھل الکتاب وغیرہ۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں تعلقات کی اساس اور سارے لین دین کی بنیاد یہ ہے کہ متعلقہ انسانوں کا تعلق اپنے خالق سے کس نوعیت کا ہے، متعلقہ لوگ کس نظریے کے پیروکار ہیں اور کس عقیدے یا اصول کو اپنی زندگی کا محور قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے مادر وطن، مدر لینڈ یا فادر لینڈ جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں دار الاسلام، دار الکفر، دار الحرب، دار العہد اور دار الصلح وغیرہ اصطلاحات ملتی ہیں، جن سے متعلقہ علاقے کی قانونی حیثیت اور اسلام کے بارے میں اس کے باشندوں کے طرز عمل کا فوراً اظہار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے جو بھی اصطلاح استعمال کی جائے گی اس سے فوراً پتا چل جائے گا کہ متعلقہ علاقے میں

Marfat.com

اسلام کی بالادستی ہے، یا وہاں کفر کے احکام چلتے ہیں، وہ علاقہ مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہے، یا وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان امن وامان سے ہیں، یا وہ علاقہ ہے جہاں کے مسلمانوں کو امن وامان میسر نہیں ہے۔ ان تمام تقسیموں میں سے بعض تقسیمیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور بعض تقسیمیں وقتی اور عارضی حیثیت کی حامل ہیں۔ لیکن ان سب کی بنیاد اور اساس اسلام سے وابستگی یا عدم وابستگی اور اہل اسلام کے ساتھ ان کے طرزِ عمل اور رویے پر ہے۔

اسلام بنیادی طور پر ایک نظریہ ہے، جس کے ماننے والے اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں، وہ نہ صرف اپنی اس انفرادیت کو الگ رکھنے پر اصرار کرتے ہیں بل کہ دوسرے نظریات کے ماننے والوں کی اپنی اپنی انفرادیتیوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کا بھی تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر اسلام کا موضوع بحث وہ لوگ بھی بنتے ہیں جو مختلف نظریات پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کوئی جداگانہ تشخص اور انفرادیت رکھتے ہوں۔

یہ اصول عبادات میں بھی موجود ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی۔ اس طرح ایک ایسا توازن، وحدت اور یک جہتی قائم ہو جاتی ہے، جو اسلامی قانون کے تمام ابواب میں نظر آتی ہے اور یوں ایک متوازن، جامع اور بہترین نظام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایسا نظام جو کسی ایک پہلو کی بہ جائے تمام شعبہ جات زندگی سے بحث کرتا ہے، اسلامی قانون دیگر نظاموں کی طرح ایسا یک رخا نہیں کہ ایک پہلو کو سامنے رکھ کر دیگر تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دے گا، بل کہ یہ انسانی زندگی کے تعلقات کو عمومی اعتبار سے سامنے رکھتا ہے۔

دوسرا واضح نتیجہ اس بحث سے یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام کا بین الاقوامی قانون صحیح معنوں میں ایک انسانی قانون ہے جو دنیا کے سارے انسانوں کو، دنیا کے ہر علاقے اور ہر قسم کے انسانوں کو ایک لڑی میں پرونے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قانون میں انسانوں کے معاملات کو منضبط کرنے کے لئے جو ہدایات دی گئی ہیں اور جو طرزِ عمل اور رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ ان کے رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر

Marfat.com

نہیں بل کہ نظریے اور عقیدے کی بنیاد پر ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ انسان کو اللہ نے ایک مکلف مخلوق بنایا ہے۔ جس کو ارادے اور مشیت سے نوازا ہے۔ جس کے پاس فیصلہ کرنے کی قوت موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر معقول اور ذمے دار انسانوں کا بھی یہی طرز عمل ہے کہ جب وہ کسی دوسرے انسان سے معاملہ کرتے ہیں تو اس کے آزادہ فیصلے کی بنیاد پر اس سے معاملہ کرتے ہیں۔ خود آپ جب ایک شخص سے خرید و فروخت کرتے ہیں یا کوئی کاروبار کرتے ہیں تو آپ اس سے جس رویے کی توقع اور مطالبہ کرتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو اس نے اپنی آزاد مرضی سے کیا ہو۔ اس نے اپنی کوئی جائیداد فروخت کی ہو، اپنی کوئی چیز آپ کو ہدیہ کے طور پر دی ہو یا آزاد مرضی اور رضامندی سے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو آپ اس سے تاوان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ غیر ارادی طور پر خود بہ خود کوئی چیز کسی سے سرزد ہو گئی ہو تو کوئی شریف انسان چاہے وہ کسی بھی نظام قانون پر کاربند ہو دوسرے انسان کو ذمے دار نہیں ٹھہراتا۔

مثلاً ایک چھوٹا بچہ جو ابھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے کسی عمل پر آپ اس کے خلاف مقدمہ نہیں کر سکتے۔ اگر ایک چھوٹا بچہ غلطی سے کوئی چیز ضائع کر دے تو آپ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کرتے۔ اس لئے کہ اس میں اس کی اپنی مشیت اور ارادے کو دخل نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام انسانوں سے ان کے نظریے اور عقائد کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے اور رنگ اور نسل کی بنیاد پر نہیں کرتا تو یہ اسی فطری انسانی اصول کے مطابق ہے۔ فطری اصول یہ ہے کہ انسان کے اپنے ارادے اور اختیار کی بنیاد پر اس سے معاملہ کیا جائے۔ محض بخت و اتفاق پر نہ کیا جائے۔ رنگ اور نسل محض ایک اتفاق ہے، کوئی خود طے کر کے گورا یا کالا پیدا نہیں ہوتا، کوئی خود طے کر کے کسی خاص نسل میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس اتفاق کی بنیاد پر کوئی معاملہ کرنا انسانی مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں معاملے کی بنیادیں یہ چیزیں قرار نہیں دی گئیں، بل کہ ایک انسان اپنے آزاد فیصلے سے جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے اسی کی بنیاد پر اس سے معاملہ کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

چوں کہ اسلام کا قانون اصلاً ایک بین الانسانی قانون ہے، اس لئے یہ انسانی عقل وشعور کی بنیاد پر ہی انسانوں سے معاملات کرتا ہے۔

جس طرح جدید ''مہذب'' مغرب اپنی اقدار اور اصولوں کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح اسلامی ریاست کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ بھی اپنی سماجی ڈھانچے کا تحفظ اسی رشک آمیز جذبات سے کرے۔ مسلمانوں نے مغرب کے اس حق کو خلوصِ دل سے تسلیم کرلیا ہوتا اگر ایسا ہی حق مسلمانوں کے سابقہ اور موجودہ نوآبادیاتی آقاؤں نے مان لیا ہوتا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ رواداری کے نام پر یہ حق مسلمانوں کو دینے سے انکار کر دیا گیا۔ ایک قوم جو اپنے بنیادی مطالبات اور مسائل کے متعلق ''روادار'' بن جائے اور اس بارے میں سمجھوتہ کرلے اور دب جائے، تباہی و ہلاکت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اگر کسی طاقت ور ہم سایہ ملک کی دل جوئی کی خاطر ہیٹی اور پانامہ کے لئے رواداری کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رواداری کی ایک حد ہے، جس سے اس کو تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ ایک معاشرہ ان کوششوں کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا جو اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے پر صرف ہو رہی ہوں۔ خواہ وہ معاشی، نظریاتی، مذہبی یا اخلاقی ہی کیوں نہ ہوں۔

اسلامی معاشرہ بنیادی طور پر ایک ایسے پیغام کی ترویج کے لئے جس کی اساس مذہبی ہو ایک مذہبی معاشرہ ہوتا ہے۔ گروہی یا نسلی معاشروں میں گروہی اعتقادات و توہمات کو جو حیثیت دی جاتی ہے، رنگ کو بے حس اور مردہ دل معاشروں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے معاشروں میں معاشی معاملات کو اور مغربی معاشروں میں سماجی و سیاسی اقدار کو جس میں معاشی مفادات بھی شامل ہوتے ہیں، وہ حیثیت اسلامی معاشرے میں اخلاقی امور اور اُن مذہبی و قانونی اصولوں کو دی جاتی ہے، جو قرآن حکیم میں دیئے گئے ہیں۔ کسی مسلمان کی اپنے مذہبی اصولوں اور مذہبی شخصیات کے بارے میں ظاہری عدم رواداری مغرب کی ظاہری عدم رواداری سے اساسی طور پر اس وقت مختلف نہیں ہوتی، جب ہم فرانس میں معصوم لڑکیوں کے دوپٹے یا سر کی اوڑھنی کا ذکر کرتے ہیں یا

Marfat.com

ایران میں باریش مذہبی سکالروں کی ظاہری صورت کی بات کرتے ہیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام ایک لسانی، معاشرتی، ثقافتی اعتبار سے مختلف گروہوں پر مشتمل معاشرے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسلامی تاریخ میں ایسے معاشروں کا ذکر ملتا ہے جو مذہبی، ثقافتی اور تمدنی کثرت وجود کے حامل تھے، کم و بیش تمام اسلامی ریاستوں اور حکومتوں میں بے شمار مذہبی، ثقافتی اور دوسرے اقلیتی گروپوں کی گنجائش موجود تھی، جس کا کافی ثبوت اسلامی تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے۔ یہودیوں کو بغداد کی عباسی حکومت اور اندلس کے اموی حکمرانوں کے دور میں مثالی عزت و تکریم حاصل تھی۔ اس بات کا دعویٰ بلا خوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں کام یاب مذہبی و ثقافتی کثرت وجود کی واحد مثال صرف اسلامی معاشرے میں ملتی ہے۔

یہ ایک ناخوش گوار جسارت نظر آ سکتی ہے اگر ہم مغربی مسلم اقلیتوں کے کردار اور حیثیت کا موازنہ اسلامی تاریخ کی مسیحی اور یہودی اقلیتوں سے کریں۔ تاہم یہ بات پوری شدّ و مد سے کہی جا سکتی ہے کہ جو ثقافتی گلا گھونٹنے کی کیفیت اور ذہنی گھٹن مسلم اقلیتیں چند مغربی ممالک میں محسوس کر رہی ہیں وہ ان ملکوں کے ان اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔

بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ فرانس جیسے ملک میں جہاں آزادی، مساوات اور اخوت کی روایات کا بڑا چرچا تھا، وہاں مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں یہ تینوں چیزیں حاصل نہیں۔ مسلمانوں سے کیے جانے والے اس سلوک کو فرانسیسی لیڈرشپ، انتہائی اعلیٰ سطح پر نہ صرف تسلیم کرتی ہے، بل کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسلم اقلیتوں کے خلاف ایسی کوششوں کا رخ موڑنے میں برابر کی شریک ہے۔

Marfat.com

یورپ پر
اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات

Marfat.com

یورپ پر
اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات

اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا، لیکن بہ قدر استعداد پہنچا۔ جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی وہ اسی قدر زیادہ اس سے فیض یاب ہوئی۔ عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم، اندلس، یونان، صقلیہ سب اس کے حلقے میں شامل ہوئے، لیکن قبول اثر میں سب یک ساں نہ تھے، فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں۔ ہر قوم اور ہر مقام نے اسلام سے اثر قبول کیا، بعض نے کم بعض نے زیادہ۔ کئی ممالک اس حد تک اسلام کے زیرِ اثر آئے کہ اپنی اصلیت بھول کر پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ گئے، جیسے عراق، شام، مصر، ترکی وغیرہ، بعض دوسرے علاقوں نے اس حد تک تو اثر قبول نہیں کیا تاہم انہوں نے اسلام اور اس کی تہذیب کے صرف وہ پہلو جوان کے مخصوص مزاج، عادات واطوار اور تہذیب وتمدن کے لئے قابل قبول ہو سکتے تھے، قبول کر لئے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم ان اثرات، رجحانات اور میلانات کا ایک مختصر سا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو یورپ نے اپنی تمدنی اور ثقافتی زندگی میں اسلام اور مسلمانوں سے اخذ کیے۔

ساتویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ جسے اہلِ یورپ اپنی تاریخ کا ازمنہ متوسط قرار دیتے ہیں وہ زمانہ ہے جب عرب مسلمان علم وعمل کی تمام

Marfat.com

نعمتوں سے مستفید ہو رہے تھے، اس کے برعکس یورپ کو اس وقت انہیں ایک حقیقی اور پرمسرت زندگی کی آسائشیں زیادہ حاصل نہ تھیں اور ہر ملک کے متمدن و غیر متمدن باشندے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور ثقافتی عظمت وسطوت سے متاثر و خائف تھے۔ یہی وہ وقت ہے جب اہل یورپ بالکل وحشی، جاہل، غیر مہذب اور غیر متمدن تھے، نہ وہ آرام و راحت کے لطف سے آشنا تھے اور نہ انہیں زندگی کی دوسری آسودگیوں سے کچھ واقفیت تھی۔ وہ امن و امان سے نابلد، ضبط یا تنظیم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ یورپی نشأۃ ثانیہ سے قبل یورپ میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں گذرا تھا، جو عدل و انصاف اور قیامِ امن میں اپنی ذمے داریوں اور اپنے فرائض منصبی سے واقف ہو۔ وہاں کے باشندے زندگی کے ہر شعبے میں وحشت و بدویت سے زیادہ قریب تھے۔ یورپ بھر میں جہالت عام تھی۔ اوہام و خرافات لوگوں کے دلوں اور ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ بیماریاں اور وبائیں عام تھیں، لیکن ان کے علاج کے لئے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ علم طب، ناکارہ سمجھ کر ترک کر دیا گیا تھا۔ کسی جگہ وبا پھوٹ پڑتی تو صحت و صفائی، علاج معالجے اور دیکھ بھال اور تیمارداری کی طرف توجہ دینے کے بہ جائے وہ اپنے احبار و رہبان اور علما و مشائخ کی ہدایات کے مطابق عجیب و غریب اور لایعنی رسوم ادا کرتے۔ تعلیم و تعلم اور تہذیب و تمدن سے متعلق یہ اثرت صرف نچلے طبقے پر حاوی نہ تھے، بل کہ اونچے طبقے کے امرا، جاگیردار، حکام، پادریوں اور نوابوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔ بڑے بڑے قائدین اور رہ نما ان پڑھ تھے۔ انگریزوں کا بادشاہ جان جس نے انگلستان کی دستوری تاریخ کا مشہور ترین منشور اعظم MAGNA CARTA جاری کیا، بالکل اَن پڑھ تھا اور اپنے دستخط بھی نہ کر سکتا تھا، چناں چہ اس نے منشور اعظم بھی اپنی مہر لگا کر جاری کیا تھا۔

یورپ کے بادشاہوں، امرا اور دوسرے سرداروں کا مقصدِ زندگی محض کھانا پینا، شراب نوشی، جنگ جوئی، شکار اور جنس پرستی تھا۔ وہ لوگ فطرتاً نہایت اجڈ، تندخو اور درشت مزاج ہوتے تھے۔ ظلم، تعدّی، سرکشی اور بربریت میں حد سے بڑھ جاتے تھے۔ صلیبی جنگوں میں یورپ کی متحدہ افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ رچرڈ جو یورپی تاریخ و ادب میں

Marfat.com

شیر دل Lion-Hearted کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور یورپ میں شجاعت کی مثال سمجھا جاتا ہے، نہایت تندخو اور خوں خواری کی حد تک ظالم تھا۔ اس نے دو ہزار پانچ سو بے گناہ مسلمانوں کو صرف مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کر ڈالا۔ یورپ کے فاتحین اپنی مفتوحہ اقوام کے نہ صرف مردوں بل کہ عورتوں تک کی آنکھیں نکال لیتے تھے۔ اس قسم کی سنگ دلی اور بربریت یورپ میں کم بیش پندرھویں صدی شمسی تک قائم رہی۔ (۱)

انگلستان کی سرزمین میں ساتویں صدی سے دسویں صدی تک متمدن زندگی کے بالکل ابتدائی آثار بھی ناپید تھے، یہ سرزمین بالکل مجہول الحال اور بے مایہ علاقہ تھا، جس کا دوسرے ملکوں سے کوئی تعلق، ربط ضبط اور میل جول نہ تھا۔ انگلستانی باشندے نشیبی زمینوں میں پتھروں اور کھپچیوں کے مکانات بناتے اور اوپر سے مٹی تھوپ دیتے، بیشتر مکانات تنگ و تاریک اور غیر ہوادار ہوتے تھے۔ قبیلے کا سردار اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔

تقریباً پندرھویں صدی شمسی تک تہذیب و تمدن کے اعتبار سے یورپ کی کم وبیش یہی حالت رہی، پندرھویں صدی میں طباعت کی ایجاد کے بعد یورپ نے جہالت کے گڑھے سے نکلنا شروع کیا۔ قزوینی نے لکھا ہے کہ بعض مسلمان تاجر عنبہ کی تلاش میں شلشویق موجودہ ڈنمارک میں ایک مقام تک گئے تھے۔ وہاں کے باشندوں کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ وہ بالکل وحشی ہیں، ننگے رہتے ہیں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے ستر پوشی کر لیتے ہیں۔ مشہور فرانسیسی مؤرخ موسیو گستاؤلی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب (ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی) میں یورپ کی تمدنی پستی اور مسلمانوں کی برتری کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اگر ہم یورپ کی نویں صدی عیسوی کی حالت کو جب کہ مسلمانوں کا

ا۔ یورپ کی تمدنی حالت کے متعلق یہ اور اس کے بعد والے تینوں پیرے مختلف کتابوں سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ کتابوں کے نام یہ ہیں۔ الامۃ والحضارۃ الاسلامیۃ۔ از محمد کرد علی۔ تاریخ یورپ از اے۔ جے۔ گرانٹ، Brief survey of mediaeval europe از کارل اسٹیفن، بالخصوص اس کتاب کے آخری چار ابواب۔ تمدن عرب از موسیو گستاؤلی بان۔

Marfat.com

تمدن اندلس میں اعلیٰ درجے کی ترقی پر تھا دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے علمی مراکز بڑے بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے، جہاں ہمارے امرا اپنی نیم وحشی حالت میں رہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ انہیں پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر ان کو چھیلنے اور ان چرمی ورقوں پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔

یورپ کے اس تاریکی دَور میں مسلمانوں کی تمدنی حالت

ساتویں اور آٹھویں صدی شمسی سے لے کر چودھویں صدی شمسی تک کی ہفت صد سالہ مدت اسلامی تہذیب وتمدن کی توسیع وترقی کا دور ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں نے بہت سی اقوام کو فتح کیا اور ان پر اس شدت سے اپنا تمدنی اثر ڈالا۔ جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں نے مصر، شام، عراق، شمالی افریقہ اور اندلس وغیرہ کے مفتوحین سے باہمی شادیاں کیں۔ یہ ایک ایسا افتخار اور اعزاز تھا جو ان ممالک کے باشندوں کو اپنے سابقہ فاتحین کے ہاتھوں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اسلام نے ان لوگوں کو نہ صرف سیاسی آزادی سے بہرہ ور کیا، بل کہ انہیں ذہنی وفکری آزادی سے بھی مالا مال کر دیا۔ اسلام نے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱) کی انقلاب آفریں تعلیم کے ذریعے انسانی ذہن وفکر کو پادریوں، مذہبی اجارہ داروں اور پجاریوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ ان مفتوحہ ممالک کے پشت ہا پشت کے غلام باشندوں پر جنھیں انسانی زندگی کو اپنی حقیقی صورت میں بسر کرنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسلام کی بخشی ہوئی آزادی نے حیرت انگیز اثر کیا، دین، سائنس، ادب اور دیگر علوم وفنون میں آج تک ان کے کارنامے تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔

ا۔ الاعراف: ۱۵۷۔ ''اور ان کے بوجھ (سخت احکام) اور ان کے طوق (نافرمانی کی پھٹکاریں) جو ان کے گلے میں پڑے ہوئے تھے، وہ ان کو اتار ڈالے گا''۔

Marfat.com

اس زمانے کی اسلامی یونیورسٹیاں اپنے جامع نصاب تعلیم وغیر متعصبانہ طرز عمل، اور ہمہ گیر اشاعت علوم کے باعث دنیائے علوم وفنون کی مسلمہ مراقع تھیں۔ جرمن پروفیسر جوزف ہیل نے اپنی کتاب Die cultur der uraser میں ان جامعات کے بارے میں لکھا ہے کہ ان یونیورٹیوں میں دینی تعلیم کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل تھا، کیوں کہ اسی دین نے پہلے پہل کتب علوم کی راہیں کھولی تھیں۔ معارف قرآن، علوم حدیث اور علوم فقہ کو ان درس گاہوں میں امتیازی درجہ حاصل تھا۔ اسلامی یونیورسٹیوں نے دوسرے دنیوی علوم کو حقارت سے نہ دیکھا اور نہ انہیں ناقابل التفات قرار دے کر رد کیا، بل کہ ان علوم کو اپنی مقدس درس گاہوں یعنی مسجدوں میں جو دینیات کے لیے مخصوص تھیں جگہ دی۔ (۱)

ان اسلامی جامعات کے اساتذہ اپنے متعلقہ علوم وفنون میں ماہر اور تقریباً دیگر مروجہ علوم وفنون سے باخبر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بہت سے مسلمان علما امام غزالی، رازی، ابن سینا، فارابی، ابن خلدون، محی الدین عربی، ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن رشد، عمر خیام وغیرہ اپنے زمانے کے تقریباً تمام مروجہ علوم کے ماہر تھے، چناں چہ آج ہمیں فلسفے، تاریخ، سیاسیات عمرانیات، معاشیات، ریاضی، طب، فلکیات، مابعد الطبیعیات، تصوف، تفسیر، حدیث، فقہ، قانون اور دوسرے بہت سے علوم میں ان علما کی مستقل تصانیف اور نظریات وآرا ملتی ہیں۔ یہ ان ہی مسلمان معلمین کے علمی ذوق کا فیض ہے کہ آج مغرب گہوارۂ علم وفن بن گیا ہے۔ جس وقت عیسائی دنیا علومِ قدیمہ کو حضرت عیسیٰؑ کے نام پر تباہ کر رہی تھی، مسلمان تلاشِ علم میں مصروف تھے اور نت نئے عملی وفنی انکشافات کر رہے تھے۔ عیسائیوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کو جلا ڈالا اور نہ جانے کتنے علما اور فلاسفر کو محض علم وفکر کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پادریوں نے یونانی اور رومی علوم کے ذخائر علانیہ نذر آتش کر ڈالے تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے علوم کیمیا، طبیعات، جغرافیہ، طب، فلکیات، تاریخ، سیاسیات، فلسفہ وغیرہ کی ترقی اور ان علوم میں اپنی کوششوں سے جو بیش بہا اضافے کیے ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ یہ اقتباس پکتھال صاحب کی کتاب Islamic culture سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں آرٹ کو ترقی کی جن اعلیٰ منازل تک پہنچایا اس کے نمونے آج بھی فن شناسوں سے داد تحسین وصول کر رہے ہیں، دنیا آج تک اس سے بہتر تو کیا اس کی نظیر بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسلامی فن تعمیر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ قرطبہ کی مساجد، الحمرا کے محلات، تاج محل، شاہی مسجد، قیروان کے گنبد، بیت المقدس، جامع دمشق اور ان جیسی بے شمار عمارتیں اسلامی طرز تعمیر کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ محمد مارما ڈیوک پکتھال اپنے خطبات مدارس Cultural sinde of Islam میں لکھتے ہیں:

> مساجد، محلات، قلعے، مکاتب، شفا خانے، تفریح گاہیں اور باغات کس چیز کی کمی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسلامی فن تعمیر نے شیدایانِ حُسن و جمال کے لئے ایک ہمہ گیر ولازوال جنت مہیا کر دی۔ اپنے عروج کے دنوں میں مسلمان حسن و جمال کے دل دادہ تھے۔ نقشے کی خوبی، ڈیزائن کی عمدگی اور رنگوں کی کوشش سب ہی کچھ ان کے پیش نظر تھا۔ بت پرستوں کی طرح صورتیں بنانے کے بہ جائے انہوں نے حسنِ فطرت پر زیادہ توجہ دی۔ سادگی و پرکاری، رنگینی و پختگی، نزاکت و رعنائی اور حسن و شوکت یہی اسلامی فنِ تعمیر کی امتیازی صفات ہیں۔ اس تیرہ خاک دان کو عرب خلفا، ترک سلاطین اور مغل شہنشاہوں سے بڑھ کر فن تعمیر کے مربی، باغات کے شیدائی اور مناظر کے دل دادہ کبھی نصیب نہیں ہوئے۔

اسلامی تہذیب کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ اس نے بڑی بڑی تہذیبوں کو بلا کسی جبر و اکراہ کے نہایت سرعت سے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مصر کو لیجئے جو بہ ظاہر ایک مستقل اور قدیم تہذیب کا مالک تھا لیکن حضرت عمرو ابن العاصؓ کی فتح مصر کے ایک سو سال کے اندر اندر یہی ملک اپنی زبان، لباس اور تقریباً سات ہزار سالہ قدیم تہذیب کو بھلا کر نئے مذہب، نئی زبان اور نئی تہذیب میں منتقل ہو گیا۔ یہی حال دوسرے ممالک کا ہے۔ عربوں نے جو ثقافتی اثر مصر پر ڈالا وہی افریقہ، شام، ایران، عراق، ہندوستان،

Marfat.com

ترکستان وغیرہ سے آگے بھی جا پہنچا، جہاں سے وہ محض گزرے تھے یا تجارت کے لئے پہنچے تھے، جیسے انڈونیشیا، جزائر فلپائن، چین وغیرہ۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا یہ رخ بھی بڑا عجیب وغریب ہے کہ جب اس کے اولین حاملین یعنی عرب مسلمان کم زور پڑ گئے تو خود ان کے مفتوحین ایرنیوں، مغلوں، اور ترکوں نے اس تہذیب وتمدن کی حفاظت کا بیڑا اٹھالیا اور دنیا میں اس کی اشاعت وسر پرستی کرنے لگے۔

یورپ میں اسلامی تہذیب پہنچانے والے مراکز

اسلامی تہذیب وتمدن کو یورپ تک پہنچانے والے مراکز تین تھے۔

ا۔اسلامی اندلس ۲۔شام ۳۔اطالیہ وصقلیہ

اس میں بڑا حصہ اندلس والوں کا ہے۔ مسلمانوں نے اندلس میں جو مادی و ثقافتی ترقیاں کیں اس کا لازمی نتیجہ اندلس کی خوش حالی اور سماجی اطمینان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بعد میں اگرچہ اہل یورپ نے اندلس پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا، لیکن وہ ان کے تہذیب وتمدن کے آثار کو دیس نکالا نہ دے سکے۔ چناں چہ اندلس کی تہذیب وثقافت نے جو اسلامی تہذیب وثقافت کی روح سے سرشار تھی، یورپ کی زندگی کے ہر ہر گوشے کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اس اثر اندازی کی ایک وجہ تو خود اسلامی تہذیب میں ہمہ گیریت اور آفاقیت کا رجحان تھا، دوسرے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترکہ معاملات، کاروبار اور معاشرت بھی بڑی حد تک اس اثر اندازی کا ایک سبب بنے۔ خصوصاً وہ عیسائی جو مسلمانوں کے غلام یا ان کے خادم تھے، آزاد ہو کر یا ملازمت ترک کر کے واپس جاتے تو ان کے نام مسلمانوں جیسے ہو جاتے، ان کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا اور گفت گو کا طریقہ بالکل مسلمانوں کا سا ہوتا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کا آزادانہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا ہوتا، اسپین کے مسلمان تاجر خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے مختلف یورپی ملکوں میں تجارت کرتے تھے۔ مسلمانوں کا برآمد کردہ مال عیسائی دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں وینس، روم اور ایتھنز وغیرہ میں بڑے شوق سے خریدا جاتا۔ روزہ مرہ کے اس

Marfat.com

لین دین اور میل جول کے ذریعے مسلمان تاجر اور سوداگر اپنے عیسائی خریداروں کو عرب طور وطریق اور اسلامی طرز معاشرت سے آگاہ کرتے رہتے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان آپس میں شادیوں کے ذریعے بھی انتقال ثقافت ہوتا رہتا۔ اندلس کے نہ صرف نچلے طبقے میں بل کہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں بھی آپس شادیاں ہوتی تھیں۔

علمی میدان میں مسلمانوں کے تفوق نے بھی اس تاثیر میں قوت پیدا کی۔ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ اور اشبیلیہ کی اسلامی جامعات یورپ کے ازمنہ متوسط میں دنیا کے اہم ترین ومشہور ترین مراکز تعلیم میں شمار ہوتی تھیں، جن میں افریقہ، ایشیا اور یورپ کے مختلف ملکوں کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں یہ کیفیت تھی کہ یورپ کے کسی شخص کو جو اعلیٰ تعلیم کا خواہش مند ہو تکمیل کے لئے اندلس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں صدی کے اوائل میں یورپ والوں میں علمی امنگیں بیدار ہونا شروع ہوئیں، اور یورپ کے بعض ترقی پسندوں کے دل میں جہالت کی تاریکیوں سے نکلنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ چناں چہ انہوں نے اپنے زمانے کی مہذب ترین دنیا کے مسلمہ استادوں (یعنی مسلمانوں) سے رجوع کیا۔ رئیس الاساقفہ ریمانڈ کی سرپرستی میں ایک دارالترجمہ قائم ہوا۔ اور عربی تصانیف کا مختلف یورپی زبانوں میں ترجمہ شروع ہوا۔ جن مسلمان مصنفین نے یورپ پر سب سے زیادہ گہرا اثر چھوڑا وہ ابوبکر زکریا، رازی، ابن سینا، الفارابی، ابن رشد، اصغروانی، ابن خلدون، ابن الہیثم، جابر بن حیان، ابن مسکویہ اور ابن باجہ وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں مشرقی اسلامی ممالک اور اسلامی اندلس کے سوا دنیا بھر میں کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں علوم وفنون کا حاصل کرنا ممکن ہو اور علمی اور فنی تحقیقات سے دل چسپی رکھنے والوں کی سہولت کے لئے کتب خانوں، درس گاہوں، تجربہ گاہوں وغیرہ کا انتظام موجود نہ ہو۔

اسلامی ثقافت کے اثرات کو یورپ منتقل کرنے کا دوسرا راستہ ملک شام تھا، جہاں سے مسلمانوں کے تجارتی قافلوں اور صلیبی جنگوں کے ذریعے یورپ نے مسلمانوں

Marfat.com

سے بہت کچھ حاصل کیا۔ صلیبی جنگیں مسلسل دو صدیوں تک جاری رہیں، اس دوران اسلامی اور یورپی افواج کو ایک دوسرے کے بالمقابل رہنے کی وجہ سے باہمی مفاہمت کے قریبی مواقع ملے۔ یورپ والوں کو اسلامی اخلاق اور مسلمانوں کے سیاسی اور فوجی امور سے واقفیت حاصل ہوئی۔ سلطان صلاح الدین اور رچرڈ کی جنگوں میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح یورپ نے مسلمانوں سے اخلاق فاضلہ کی تعلیم حاصل کی۔ اہل یورپ نے مشرق میں آ کر ایک زبردست اور پرشکوہ تہذیب کا مشاہدہ کیا، جس نے انہیں مبہوت کر دیا۔ انہوں نے عربوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی برتری سے متاثر ہو کر اپنے علاقوں میں واپسی پر وہاں نئے جذبات سے اصلاحات کی جدوجہد شروع کر دی۔

صلیبی جنگوں نے مسیحیوں کو بردباری اور رواداری کے اسباق سکھائے، سلطان صلاح الدین ایوبی نے اہل یورپ کے ساتھ جس فیاضی کا برتاؤ کیا وہ اسلامی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ دوسری طرف عیسائیوں کے تعصب اور عدم رواداری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مسجد الاقصیٰ میں پناہ گزین ستر ہزار سے زائد امن پسند اور غیر جنگ جو مسلمانوں کو بلاوجہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ڈاکٹر تھامس آرنلڈ نے اعتراف کیا ہے کہ بیت القدس میں مسلمانوں کا خون اس طرح بہہ رہا تھا کہ جب عیسائی فوجیں شہر میں گشت کر رہی تھیں تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں گھٹنوں مسلمانوں کا خون دریا کی طرح موج زن تھا۔

صلیبی جنگوں کے ذریعے اسلامی تہذیب و تمدن کے جو اثرات یورپ پہنچے وہ زیادہ تر مادی نوعیت کے تھے، معنوی اور علمی پہلوان میں بہت کم تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لئے جو سپاہی یورپ سے آتے اور اسلامی اثرات کو اپنے ساتھ واپس یورپ لے جاتے تھے، وہ نہ تو علمی و ثقافتی صلاحیتوں کے مالک تھے، اور نہ ان کی طبیعتیں اس طرف مائل تھیں۔

صلیبی جنگوں کے علاوہ شام، اور ترکی سے گزر کر یورپ جانے والے مسلمان

Marfat.com

تاجروں اور سوداگروں نے بھی اس سلسلے میں بڑی خدمات انجام دیں۔ یہ لوگ یورپ کے دور دراز ملکوں میں اسلامی ممالک کی مصنوعات لے کر جاتے اور نہ صرف اسلامی ملکوں کی خارجی تجارت اور درآمد و برآمد کی ترقی میں معاون ہوتے بل کہ وہاں اسلامی تہذیب وتمدن کو بھی متعارف کراتے۔ بحیرۂ باضک کی ریاستوں ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کے مختلف مقامات سے عربی ملکوں اور عربی مصنوعات کی برآمد اور دریافت سے عرب تاجروں کے کاروبار کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے اثرات کو یورپ منتقل کرنے کا تیسرا بڑا راستہ صیقلہ اور جنوبی اطالیہ تھے، جہاں سے مسلمان تاجروں، علما، طلبہ اور دوسرے علوم وفنون کے ماہرین یورپ کے مختلف ملکوں میں آتے جاتے رہتے تھے، اسی طرح دوسرے قریبی یورپی ملکوں سے بھی لوگوں کی صیقلہ آمد و رفت قائم تھی، جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب کی کرنیں یورپ کے تاریک علاقوں پر پڑ رہی تھیں۔ خود صیقلہ بھی اسلامی تہذیب وتمدن کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں سے اسلامی تہذیب آگے بڑھ رہی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے صیقلہ کے مرثیے میں بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

ولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خون نا بہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شاہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے(۱)

ان تین مراکز کے ذریعے اسلامی ثقافت کے اثرات تقریباً سات سو سال تک آہستہ آہستہ یورپ منتقل ہوتے رہے، یورپ کی تمدنی وثقافتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جو

۱۔ علامہ اقبال۔ بانگِ درا: حصہ دوم، ص ۱۴۱

Marfat.com

اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی ثقافت سے متأثر نہ ہوا ہو۔ ہم یہاں چند ایسے پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں جن پر اسلامی اثرات نسبتاً زیادہ گہرے، واضح اور نمایاں ہیں۔

یورپی زبانوں پر عربی کے اثرات

یوں تو مغربی اور جنوبی یورپ کی بیشتر زبانوں پر عربی زبانوں کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ اثر ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی زبانوں کے قبول کیا۔ ان علاقوں کے بہت سے مقامات کے نام اور بیشتر علمی اصطلاحات عربی ہی میں ہیں۔ اسی طرح روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار ہسپانوی الفاظ عربی الاصل ہیں۔ پیشہ نجاری سے متعلق ہسپانوی اصطلاحات عربی ہیں۔ پروفیسر جی بی ٹرینڈ نے اپنے مقالے، ہسپانیہ اور پرتگال (۱) میں بہت سے ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے ہیں جو عربی سے مشتق ہیں۔ ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں:

۱۔ TAHONA یعنی نان بائی کی دکان، اصل عربی لفظ طاحونۃ ہے۔

۲۔ LA ACCEQIA یعنی نہر، اصل عربی لفظ الساقیۃ ہے۔

۳۔ ALCOBA یعنی گنبد، اصل عربی لفظ القبہ ہے۔

۴۔ AL MOHDA تکیہ، اصل عربی لفظ المخدہ ہے۔

۵۔ FULANO وہ آدمی، فلاں شخص، ماخوذ از فلان۔

۶۔ ALCALDE میئر، صدر بلدیہ، اصل عربی لفظ القاضی۔

۷۔ ADUANA یعنی کسٹم ہاؤس، ماخوذ از الدیوان۔

۸۔ ARROBA ایک پیمانہ، ماخوذ از الربع۔

۹۔ JARABE مشروب، ماخوذ از شراب، پہلے اس لفظ کو JARABE کے بجائے XARABE لکھا جاتا تھا اور X کی آواز اسپین میں سترہویں صدی تک ش کی ہوتی تھی

۱۰۔ HASTA تا آں کہ، ماخوذ از حتیٰ۔

یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار الفاظ ہسپانوی زبان

۱۔ مندرجہ میراث اسلام مرتبہ سرتھامس آرنلڈ والفریڈ گیام

Marfat.com

میں ایسے موجود ہیں جن کے شروع میں عربی حرف تعریف ARTICLEال موجود ہے جو ان الفاظ کے عربی الاصل ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ بہت سے ہسپانوی ناموں کے شروع میں بنی کا لفظ پایا جاتا ہے جو خالص عربی ہے، یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ہسپانوی زبان بولنے والے لوگ اب تک عربی کا فقرہ ان شاء اللہ اس کی بگڑی ہوئی شکل میں اکثر بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہسپانوی زبان کے اندازاً ایک چوتھائی الفاظ عربی سے ماخوذ ہیں۔ یہی حال پرتگالی زبان کا ہے جس میں عربی کے تقریباً تین ہزار الفاظ موجود ہیں، اور ان میں سے بیشتر عربی حرف تعریف ال سے شروع ہوتے ہیں۔ مشہور مستشرق انجلمان نے اس موضوع پر ایک مستقل لغت لکھی ہے جس میں ہسپانوی اور پرتگالی زبانوں کے وہ تمام مفردات جمع کر دیئے ہیں جو عربی سے مشتق ہیں۔

پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں کے واسطے سے عربی کے اثرات فرانسیسی، اطالوی، جرمن اور انگریزی زبانوں تک پہنچے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں بھی ہسپانیہ اور پرتگال کے لوگ جا کر آباد ہوئے انہوں نے وہاں کی زبانوں میں عربی اثرات منتقل کئے۔ چناں چہ آج کل بھی برصغیر، ارجن ٹائن اور دوسرے جنوبی امریکائی ملکوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ اپنی تعبیر، مترادفات اور ضرب الامثال وغیرہ میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں عربی سے نسبتاً زیادہ قریب ہیں۔ عربی زبان کا اثر و نفوذ محض لاطینی زبانوں تک محدود نہیں رہا، بل کہ قدیم گالی، ہالینڈی، اسکینڈی نیوی، روسی، پولینڈی اور دوسری زبانوں میں بھی بہت سے عربی الفاظ ملتے ہیں۔

یورپ پر عربی شاعری اور فنون لطیفہ کا اثر

عربوں نے مغرب و اندلس میں جو شعری روح پھونک دی تھی اس سے ان تمام لوگوں کے دلوں میں شعر و شاعری کے لیے فریفتگی پیدا ہو گئی جو عربی میں مہارت رکھتے تھے اور عربی میں شعر کہہ سکتے تھے۔ اس وقت تک بہت سی یورپی اقوام نے شعر و شاعری میں ترقی نہیں کی تھی۔ عربوں کے عروج کے زمانے تک یورپ میں کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا

Marfat.com

تھا، جو اپنی شاعری کے ذریعے اپنی قوم کو سربلند کرتا اور اس کے بلند کارناموں کو نظم کر کے انہیں دوام بخشتا، ان کی شاعری کا تمام سرمایہ کچھ گانے اور چند گیت تھے اور وہ بھی بالکل عامیانہ اور سطحی۔ یہ عرب ہی تھے جنہوں نے اقوامِ یورپ کو بالعموم اور لاطینی اقوام کو بالخصوص شعر کے معنی بتائے اور ان کو سمجھایا کہ حقیقی شاعری کیا ہوتی ہے۔ یورپ نے عربی شاعری کی وہ تمام اصناف قبول کر لیں جو ان کے مذاق کے مطابق اور ان کی عام تمدنی روح سے ہم آہنگ تھیں۔ شاعری کے علاوہ دوسری اصناف ادب مثلاً رزم و بزم، عشق و محبت، حسن و جمال اور شہ سوارں کی داستانوں کو بھی انہوں نے اپنایا۔ اہل اسپین کے تاریخی قصائد، ہسپانوی عربوں کی ایجاد کردہ صنف شاعری موالیہ سے ماخوذ یا ترجمہ ہیں، جن میں ان کے تیوہاروں، سانڈوں کی لڑائیوں اور شہ سواروں کے رقص کا ذکر ہوتا تھا۔ اسپین کے اصل باشندوں نے ان میں سے کوئی چیز بھی پندرھویں صدی سے قبل پیدا نہیں کی، عربی کی اس خوش ذوقی نے ان کو یورپ بھر میں مشہور کر دیا تھا۔

اسپین میں اشراف وسلاطین نے بھی شاعری شروع کر دی تھی۔ سلاطین اسپین میں عبدالرحمٰن اوّل، ابوعبداللہ اور معتمد بہ حیثیتِ شاعر مشہور و معروف ہیں۔ عبدالرحمٰن اوّل کی اس نظم کا جو اس نے اندلس میں پہلے کھجور کے درخت لگاتے وقت کہی تھی اور معتمد کی نظم ''قید خانے کی فریاد'' کا علامہ اقبال نے آزاد منظوم ترجمہ بھی کیا ہے، جو بال جبریل میں بالترتیب صفحہ ۱۳۷-۱۳۸ پر موجود ہے۔ اشراف وسلاطین کی تقلید میں مغربی پادریوں تک نے عربی تہذیب اپنالی تھی، ان میں عربی ادب کا ذوق عام تھا اور وہ فصیح عربی میں شعر کہنے لگے تھے۔ پاپائے روم سلفرڈ دوم عربی میں عربی وزن اور قافیے کے مطابق قصائد کہا کرتا تھا۔ سسلی کے بادشاہ فریڈرک ثانی نے عربی میں بہت سے قطعات کہے تھے، اس نے اپنے دربار میں بہت سے مسلمان علما و فضلا جمع کیے تھے وہ ان کے ذریعے اپنے ملک میں بھی عربی زبان و ادب اور عربی علوم کو وہی فروغ دینا چاہتا تھا، جو ان علوم کو دمشق، بغداد، قرطبہ اور اشبیلیہ میں حاصل تھا۔

یورپی ادب پر اسلامی اور مشرقی ادبیات کے اثرات کا سب سے بہتر نمونہ

Marfat.com

ڈانٹے کی طربیہ ایز دیDININE COMED، گوئٹے کے دیوان مغربی وغیرہ میں مل سکتا ہے، مسلمانوں میں مروجہ روایات معراج، ابوالعلاء المقری کی کتاب الغفران اور شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر ڈیوائن کامیڈی پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ طربیہ ایز دی کا مصنف اپنے افکار و خیالات کہاں سے حاصل کرتا ہے۔ یہی حال یورپی ادب کے کم وبیش تمام قدیم شاہ کاروں کا ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف ادبیات میں بل کہ دوسرے علوم وفنون میں اہل یورپ نے مسلمانوں سے بے حد و حساب استفادہ کیا ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی تک کسی ایسے غیر مسلم یورپی مصنف کا حوالہ دینا ممکن نہ تھا جس نے عربوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔

اس دور کے جلیل القدر یورپی علما راجر بیکن، سینٹ تھامس ایکوئناس، ریمان لی، البرٹ دی گریٹ اور الفاض دہم وغیرہ سب کے سب یا تو مسلمانوں کے شاگرد تھے یا ان کی تصانیف کے نقال تھے۔ راجر بیکن نے فارابی سے، البرٹ اعظم نے ابن سینا سے اور سینٹ تھامس ایکوئناس نے امام غزالی اور ابن رشد الحفید سے جس قدر استفادہ کیا ہے وہ ان لوگوں کی نظر سے مخفی نہیں جنہوں نے مسلم اور یورپی فلسفوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

یورپی طرزِ تعمیر پر عربوں کا اثر

تمدنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح اس پہلو سے بھی یورپ نے مسلمانوں سے کچھ کم اثر قبول نہیں کیا۔ یورپی طرزِ تعمیر پر عربی طرز تعمیر کے گہرے اثرات کا اعتراف مشہور فرانسیسی مصنف موسیو لیبان نے بھی کیا ہے، وہ کہتا ہے:

> عربوں کا اثر یورپ کے فنون وحرفت پر اور علی الخصوص طرز تعمیر پر بین اور بلاشبہ ہے۔ فنِ تعمیر میں مسلمانوں کی برتری کی مثال وہ عالی شان عمارات ہیں جو قرطبہ، دہلی، قاہرہ اور استنبول وغیرہ میں موجود ہیں۔ اس طرز تعمیر نے یورپی طرزِ تعمیر پر اس قدر گہرا اثر ڈالا ہے کہ قاہرہ کی مساجد کے میناروں اور اٹلی کے گرجاؤں کی عمارتوں

Marfat.com

کا موازنہ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے، نہ صرف اٹلی بلکہ تمام یورپ کی اکثر قدیم عمارتوں کو اگر دیکھا جائے تو عربی طرزِ تعمیر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

موسیو گستاؤلیبان اپنی کتاب تمدن عرب میں کہتا ہے:

یورپ کا گاتھک GOTHIC طرزِ تعمیر اگرچہ آج اس شکل میں آ گیا ہے کہ اس میں اور عربی طرزِ تعمیر میں کوئی واضح مشابہت باقی نہیں رہی لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یورپ نے عربوں سے بہت کچھ تعمیر کی باریکیاں حاصل کی ہیں۔

مسلمان اپنی مساجد اور دوسری عمارات کو خوش خط قرآنی آیات اور عربی ابیات وعبارات سے آراستہ کیا کرتے تھے۔ عیسائیوں نے بھی ان کو دیکھ کر کلیساؤں کو اس طرح مزیّن کرنا شروع کر دیا۔ چناں چہ بہت سے پرانے عیسائی گرجاؤں میں عربی تحریرات کندہ پائی جاتی ہیں۔ نویں صدی شمسی تک کوفی حروف اور اس کی مختلف شکلیں یعنی قرمطی یا مستطیل کوفی حروف کتبوں میں مستعمل رہی ہیں۔ ان کتبات میں اکثر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ بہت سے کتبات پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بھی تحریر ہے۔ عربی حروف اس قدر خوب صورت سمجھے جاتے تھے کہ ازمنۂ متوسط میں عیسائیوں تک نے اپنی مقدس عمارات میں ان نمونوں کو جو ان کے ہاتھ لگے، محض آرائش سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔ چناں چہ کلیسائے سینٹ پیٹر کے اس دروازے پر جہاں پوپ یوژین چہارم کا مجسمہ نصب ہے وہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شبیہ کے گرد عربی حروف کا ہالہ بنا ہوا ہے۔ مزید برآں سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے کپڑوں پر بھی ایک ایک سطر عربی عبارت کی منقوش ہے۔

یورپ کے اخلاق پر عربوں کا اثر

اہلِ یورپ کے اخلاق و عادات پر مسلمانوں کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب مسلمانوں کی آمد سے قبل ان کے اخلاق و عادات کو سامنے رکھ کر

Marfat.com

مسلمانوں سے میل جول اور ربط وضبط کے بعد ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ قریب قریب تمام ہی منصف مزاج یورپی مصنفین نے اعتراف کیا ہے کہ جدید یورپ نے تحمل، رواداری، بردباری، احترامِ نسواں، بہادرانہ اخلاق اور دوسری خوبیاں مسلمانوں سے سیکھی ہیں۔ موسیو لیبان نے لکھا ہے:

> مسلمانوں ہی سے ملنے جلنے کی بہ دولت یورپ کے عیسائیوں نے اپنی وحشیانہ معاشرت چھوڑ کر بہادرانہ اخلاق اپنائے، جس میں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا پاس، قسم کی پابندی وغیرہ شامل ہے۔ جنگ صلیبی کے بیان میں ہم دکھا چکے ہیں کہ ان امور میں یورپ کے عیسائی مشرق کے مسلمانوں سے کس قدر پیچھے تھے۔

ایک اور بہت بڑے مذہبی مصنف موسیو بارتھے، لیمی سینٹ ہلیئر نے اپنی کتاب متعلقہ قرآن میں لکھا ہے کہ عربوں کی معاشرت اور ان کی تقلید نے ہمارے ازمنۂ متوسطہ کے امرا کی زبوں عادتوں کو درست کیا اور بہ سردار بلا اس کے کہ ان کی بہادری میں فرق آتا ایسے اخلاق سیکھ گئے جو انسان میں اعلیٰ درجے کی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ صرف عیسوی مذہب وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ان میں یہ اخلاق پیدا کر سکتا تھا۔(۱)

لیبان اور بارتھے لیمی کے علاوہ یورپی علما میں سے اوروں نے بھی یورپی اخلاق پر اسلامی اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ **والفضل ما شهدت به الاعداء۔**

ان چند پہلوؤں کے علاوہ تمدنی وثقافتی زندگی کے اور بھی بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں اہلِ یورپ پر عربی اثرات کی چھاپ بہت گہری اور نمایاں ہے، مثال کے طور پر کتابوں کی جلد سازی اور آرائش کے فن میں مسلمان پہلے بھی سب سے آگے تھے اور اب بھی سب سے آگے ہیں۔ مسلمانوں ہی سے اہلِ یورپ نے آرائش کتب کا فن سیکھا۔ اسی طرح آرائش خط میں بھی مسلمان ہمیشہ سے سب سے آگے رہے۔ مسلمانوں کے مختلف

۱۔ لیبان اور بارتھے کے یہ اقتباسات اور لیبان کے دوسرے تمام اقتباسات لیبان کی کتاب تمدن عرب مترجمہ مولوی سیّد علی بلگرامی سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

خطوط کا اثر یورپی خطوط پر گوتھک رسم الخط اور عربی خطوط خصوصاً خط کوفی کا موازنہ کرنے سے ملتا ہے۔ آج تقریباً دنیا کے ہر ملک میں بڑے بڑے باغات اور سیرگاہوں میں کتب خانے اور مطالعہ گاہیں قائم کرنے کا رواج ہے، اس کی طرح بھی سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے اندلس، بغداد وغیرہ میں ڈالی تھی۔

یورپی تہذیب و تمدن کے یہ چند گوشے ہیں جنہوں نے اسلامی اثرات سے گہرا استفادہ کیا ہے۔ قوموں کی تہذیبی و تمدنی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے، جب سے یہ دنیا قائم ہے ایک قوم دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ سیکھتی اور اسے کچھ نہ کچھ سکھاتی رہی ہے۔ خود مسلمانوں نے یونانی اور ایرانی تہذیبوں سے بہت کچھ اخذ کیا۔ تہذیب و تمدن کوئی جامد قدر نہیں کہ ہمیشہ ایک حالت پر قائم مذہب اپنے بنیادی عقائد کو محفوظ رکھتے ہوئے دوسری تمام تہذیبوں سے اپنے مذاق کے مطابق استفادہ اور اخذ و قبول کرتی رہتی ہے، لہٰذا یہ ہر دم متغیر بھی ہے اور غیر متغیر بھی، اثر انداز بھی ہے اور اثر پذیر بھی۔ مثال کے طور پر آج ہمارے سامنے جدید یورپی تہذیب و تمدن اپنی خیرہ کن چمک و دمک کے ساتھ جادہ ساماں ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں مختلف قسم کا ردِّ عمل پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس سے متعدی مریض کی طرح دُور رہنا چاہتے ہیں، کچھ اس میں اس طرح گم ہو جانا چاہتے ہیں کہ بہ قول امیر خسرو:

من تن شدم تو جان شدی من جان شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ کیا کریں:

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَا اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَا اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ

لیکن صحیح رویہ جو ہم کو ایک مسلمان کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو اپنے اصولوں پر جانچ لیں اور ''خذ ما صفا دع ما کدر'' کے اسلامی اصول پر عمل کرتے ہوئے ہر صحیح کو قبول کر لیں اور سقیم کو رد کر دیں اس لئے کہ:

الكلمة الحكمة ضالة المؤمن حيثما وجدها فهو احق بها(۱)

۱۔ ابن ماجہ: رقم ۴۱۶۹۔ ترمذی: ۲۶۸۷

Marfat.com

اسلام اور مغرب

موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز

پہلا مولانا سید زوار حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ یادگاری خطبہ
دار العلم والتحقیق۔کراچی۔۱۵ اگست ۲۰۰۷ء

Marfat.com

اسلام اور مغرب

موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب صدر جلسہ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

محترم جناب سید فضل الرحمٰن شاہ صاحب

محترم جناب ڈاکٹر منیر احمد خان

برادران گرامی، عزیزانِ محترم اور

عزیز محترم جناب ڈاکٹر حافظ سید عزیز الرحمٰن

میں سب سے پہلے آپ سب حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بے پایاں عزت بخشی، اور ایک ایسی شخصیت کے اسم گرامی سے منسوب اس سلسلۂ محاضرات میں پہلا محاضرہ پیش کرنے کی دعوت دی، جو برصغیر کی دینی، علمی اور روحانی تاریخ میں نہایت ممتاز اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ جن کے علمی، روحانی اور تحقیقی کارناموں سے برصغیر اور اس سے باہر کے بہت سے مسلمان واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے، ان کے علمی اور دینی کام کی برکات اور ان کے کام

Marfat.com

کے ثمرات کو جاری و ساری رکھے، اور ہم سب کو ان ثمرات و برکات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

برادران محترم! اسلام اور مغرب پر گفت گو کا سلسلہ ایک طویل عرصے سے جاری ہے، آج بھی بہت سے حضرات اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اخبارات اور سیاسی رسائل سے لے کر علمی اور تحقیقی مقالات تک، علمائے دین کے مواعظ سے لے کر ارباب سیاست کے بیانات تک ہر جگہ اسلام اور مغرب کے تعلقات پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موضوع کی اہمیت اور نزاکت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس اہم موضوع پر بامعنی اور سنجیدہ گفت گو کی جتنی ضرورت آج ہے شاید ماضی میں نہیں تھی، لیکن کسی بامعنی گفت گو کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن میں یہ واضح کر لیں کہ اس گفت گو کے سیاق و سباق میں مغرب سے ہماری مراد کیا ہے؟ کیا مغرب سے کوئی ایسا جغرافیائی خطہ مراد ہے، جو ہمارے مقابلے میں مغرب میں واقع ہے، یا ہماری مراد کچھ اور ہے؟ اگر اس سے محض جغرافیائی مفہوم میں مغرب مراد ہے تو اس سے شاید کسی غلط فہمی یا الجھن کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ امکان اس لئے ہے کہ اول تو اسلام کی ترجیحات میں کسی جغرافیائی وابستگی کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو آج مغرب کے نیشنل ازم نے پیدا کر دی ہے۔ اسلام میں تعلقات کی نوعیت کا تعین جغرافیے سے نہیں نظریے سے ہوتا ہے۔ دوسرے اسلامی تاریخ میں مغرب دنیائے اسلام ہی کے ایک علاقے کو کہا جاتا تھا، جس میں مراکش، تیونس، الجزائر اور اندلس مرحوم شامل تھا۔ مسلمانوں کی وہ فردوس گم گشتہ بھی اس میں شامل تھی جس نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے باب میں نئی قندیلیں روشن کی تھیں۔ اس پورے علاقے کو اسلامی ادبیات میں مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اسلام اور مغرب کی بات کرتے ہیں تو یہ مغرب مراد نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر محض جغرافیائی خطے کے مفہوم میں یورپ اور امریکہ ہی کو مراد لیا جائے تو آج کے مغرب میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہے، جس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، یوں اسلام اور مغرب کا جب جغرافیائی مفہوم میں تقابل کیا جائے گا تو وہ مسلمان

Marfat.com

مغرب میں شامل سمجھے جائیں گے۔لیکن اگر مغرب سے مراد کوئی تہذیب یا فکر و نظریہ ہے تو پھر یورپ اور امریکہ میں بسنے والے کروڑوں مسلمان اسلام کے کیمپ میں شمار ہوں گے، مغرب کے کیمپ میں شمار نہیں ہوں گے۔

اس لئے یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مغرب سے یہاں ہماری مراد کوئی جغرافیائی خطہ نہیں ہے، بل کہ مغرب سے مراد ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسا تمدن ہے جس کا سابقہ دنیائے اسلام سے گزشتہ دو سو ڈھائی سو سال سے بہت گہرا ہے۔اور آئندہ ایک طویل عرصے تک یہ سابقہ قائم رہنے کے شواہد اور قرائن بھی موجود ہیں۔آئندہ آنے والے حالات میں بڑی حد تک دنیائے اسلام کا مستقبل اس بات پر مبنی ہے کہ وہ مغرب کے بارے میں کیا رویہ اور کیا طرز عمل اختیار کرتی ہے۔اسی طرح مغرب کا مستقبل بھی اس بات پر مبنی ہے کہ وہ دنیائے اسلام کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔ان دونوں کے پاس اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے بارے میں کسی غلط تاثر، غلط معلومات، بدنیتی یا کسی منفی جذبے کی بنیاد پر کوئی غلط فیصلہ کریں۔ان دونوں میں اگر کوئی ایسا بڑا غلط فیصلہ کر بیٹھا تو یقین جانئے کہ اس کے نتیجے میں کروڑوں انسان بے پناہ مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔اس لئے جتنا ہمارے لئے مغرب کو جاننا ضروری ہے، اس سے کہیں زیادہ مغرب کے لئے ہمیں جاننا ضروری ہے۔ایک دوسرے کے بارے میں اس کم فہمی یا بدفہمی کے نتیجے میں جو عواقب رونما ہوں گے ان کی وجہ سے ہمارا نقصان مغرب کے مقابلے میں کم ہوگا۔مغرب کا نقصان زیادہ ہوگا۔

دنیائے اسلام سے تصادم کے نتیجے میں مغرب کی جو چیزیں خطرے کا شکار ہیں مسلمانوں کی بہ نسبت وہ بہت زیادہ ہیں، ہمارے پاس مادی چیزیں قربان کرنے کے لئے تھوڑی ہیں۔روحانی چیزیں الحمدللہ قربان نہیں ہوں گی۔وہ ان مادی تصادمات سے ماورا ہیں۔اس لئے ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس مادی تصادم کا شکار نہیں ہوگا۔ان کے پاس جو کچھ ہے وہ سارے کا سارا اس ممکنہ مادی تصادم میں بھسم ہوسکتا ہے، اور پھر وہ ایک طویل عرصے کے لئے ایک ایسے دور میں پہنچ سکتے ہیں جہاں وہ ہمیں پہنچانے کا دعویٰ کرتے

Marfat.com

رہتے ہیں۔ اس لئے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں گہری فہم اور بصیرت درکار ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات عرض کرتا ہوں۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب توقیفی ترتیب ہے، تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب، سورتوں کی بھی اور آیات کی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقرر فرمائی ہے۔ اس ترتیب میں کیا حکمتیں ہیں اس پر اہل علم و علمائے مفسرین عرصے سے غور کرتے چلے آئے ہیں۔ مجھے بھی تھوڑا بہت قدیم مفسرین کی تحقیقات کو پڑھنے کا موقع ملتا رہتا ہے، وقتاً فوقتاً غور وفکر بھی کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے، ممکن ہے غلط ہو، یہاں بزرگ اصحاب علم موجود ہیں، یہ بات غلط ہوگی تو اصلاح فرمادیں گے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کی پہلی دو سورتیں سورۂ بقرہ، اور آل عمران ہیں، جو طویل ترین سورتیں ہیں۔ ان دونوں طویل صورتوں کو سب سے آغاز میں رکھنے میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ مفسرین نے انہیں ایک دوسرے کا جوڑا قرار دیا ہے، حدیث میں انہیں زہراوین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ تھوڑا سا غور کریں تو ایک بات جو بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پوری سورۂ بقرہ یہود اور بنی اسرائیل کی تاریخ و عقائد پر تبصرہ ہے، اور پوری سورۂ آل عمران نصاریٰ اور مسیحیوں کی تاریخ وعقائد پر تبصرہ ہے۔ سورۂ بقرہ میں عیسائیوں کا تذکرہ زیادہ نہیں ہے، اور سورۂ آل عمران میں یہودیوں کا تذکرہ زیادہ نہیں ہے۔ جتنے احکام ہیں وہ سورۂ بقرہ میں دیئے گئے ہیں اور اخلاقی ہدایات سورۂ آل عمران میں دی گئی ہیں۔ جن مسائل کی وجہ سے یہودی گم راہیوں کا شکار ہوئے ان کی یاد دہانی سورۂ بقرہ میں ہے اور جن معاملات کی وجہ سے عیسائی گم راہیوں کا شکار ہوئے ان کی یاد دہانی سورۂ آل عمران میں ہے۔

میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ دنیائے اسلام جوامتِ مسلمہ پر مشتمل ہے، ایک بین الاقوامی کردار رکھتی ہے، اس کو ایک بین الانسانی ذمے داری دی گئی ہے۔ اس کی ذمے داری علاقائی یا لوکل نہیں ہے، یہ پان اسلامک (Pan Islamic) اور یونیورسل (Univarsal) ذمے داری ہے۔ پوری چودہ سو سال کی تاریخ آپ کے سامنے

Marfat.com

ہے، اس میں مسلمانوں کا سابقہ جتنا یہود ونصاری سے رہا ہے کسی قوم سے نہیں رہا۔ مسلمانوں کا سابقہ کفارِ مکہ سے چند سال رہا، اس کے بعد ختم ہوگیا، سات آٹھ سال ان سے مقابلہ رہا، اس کے بعد کفارِ مکہ مٹ گئے۔ ایران کے آتش پرستوں سے بھی مسلمانوں کا مقابلہ چند عشرے جاری رہا، اس کے بعد آتش پرست مٹ گئے۔ بدھسٹوں سے یہ مقابلہ صرف ہندوستان کے علاقے تک محدود رہا۔ زرتشتیوں سے بھی یہ مقابلہ مختصر رہا۔ جتنی بھی اقوام نزول قرآن کے وقت پائی جاتی تھیں ان سب سے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا۔ جنگیں بھی ہوئیں، لیکن یا تو وہ کسی خاص علاقے تک محدود تھیں، یا چند برسوں اور عشروں تک محدود تھیں۔ اس کے بعد وہ قومیں ختم ہوگئیں۔ دو قومیں البتہ ایسی ہیں جن سے مسلمانوں کو آج تک واسطہ اور سابقہ پیش آرہا ہے۔ اور آئندہ ایک طویل عرصے تک یہ جاری رہے گا، بہ ظاہر قرائن یہی معلوم ہوتے ہیں، وہ دو قومیں ہیں یہودی اور عیسائی۔

گویا مسلمانوں کو اپنا بین الانسانی اور بین الاقوامی کردار ادا کرنے کے لئے جن دو قوموں سے سب سے زیادہ واسطہ پیش آنا تھا یعنی یہودی اور عیسائی ان سے مسلمانوں کو مقابلے کے لئے تیار کرنا حکمت الٰہی کا منشا تھا۔ اس اہم ذمے داری کو انجام دینے کے لئے اہل ایمان کو ذہنی، فکری اور نفسیاتی طور پر تیار کرنا ان دو سورتوں کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان یہ سمجھ لیں کہ یہودیوں کے عقائد کیا ہیں، ان کی تاریخ کن مراحل سے گزری ہے، ان میں تحریفات کن کن راستوں سے آئیں، ان میں خرابیاں کیسے کیسے پیدا ہوئیں؟ جب تک مسلمان ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ وہ یہودیوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح جب تک عیسائیوں کی گم راہیوں سے مسلمان آگاہ نہ ہوں اور یہ نہ سمجھتے ہوں کہ عیسائیوں میں یہ انحرافات کیسے، کہاں سے اور کیوں آئے؟ اس وقت تک مسلمان عیسائیوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتے۔

چوں کہ تاریخی اعتبار سے یہودی پہلے ہیں، اس لئے یہودیوں پر تبصرہ پہلے ہے۔ عیسائی تاریخی اعتبار سے بعد میں ہیں اس لئے ان کا تذکرہ بعد میں ہے، اس سے میں یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ امتِ مسلمہ کے عالم گیر کردار میں یہ بات بنیادی طور پر شامل

Marfat.com

ہے کہ ان کا ایک طویل عرصے تک یہودیوں اور عیسائیوں سے واسطہ رہے گا، مقابلے کی نوعیت پیش آتی رہے گی، تصادم ہوتا رہے گا، اور اس تصادم کے لئے مسلمانوں کو یہ دو سورتیں سورۂ بقرہ اور آل عمران تیار کررہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے دن سے مسلمانوں کا یہودیوں اور عیسائیوں سے مقابلہ رہا ہے۔

جس کو ہم مغرب کہتے ہیں اس سے مسلمانوں کا مقابلہ اور سابقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے شروع ہوگیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کو نامۂ مبارک بھیجا، ہرقل مشرقی سلطنت روم کا فرماں روا تھا۔ مشرقی رومن ایمپائر یورپ کے ایک تہائی حصے پر حکم راں تھی۔ اور اگر بعض سیرت نگاروں کی رائے درست ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسٹرن رومن ایمپائر کے نمائندوں کو بھی اپنے نامۂ مبارک سے نوازا۔ پھر ایسٹرن رومن ایمپائر اور ویسٹرن رومن ایمپائر کے جو مقامی باج گزار حکم ران جا بجا مقرر تھے، انہیں بھی حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے نامۂ مبارک بھیجے۔ نجاشی مغربی رومن ایمپائر کا نمائندہ تھا۔ مصر کا مقوقس بھی مغربی سلطنت روما کا باج گزار تھا۔ ویسٹرن رومن ایمپائر کے چرچ کا پیرو تھا۔ اور جن جن لوگوں کو نامۂ مبارک بھیجے گئے، وہ ان ہی کے نمائندے تھے۔

اس کے بعد اصل تصادم اور مقابلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا۔ صلیبی جنگوں کے بعد ایک طویل عرصے تک اسپین میں یہ مقابلہ جاری رہا۔ جنوبی یورپ کے ذریعے یہ سابقہ پیش آتا رہا۔ پھر استعمار اور ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے ذریعے ہوا۔ اس کے بعد گزشتہ سو سال سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ گویا اسلام کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مسلمانوں کا رابطہ اور واسطہ روز اول سے ہے، مکہ مکرمہ کے دور سے ہے۔ مکہ مکرم کے ابتدائی ایام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا واسطہ اور رابطہ بالواسطہ طور پر عیسائیوں اور یہودیوں سے رہا ہے، اور وقتاً فوقتاً قرآن پاک میں ایسی آیات اور ہدایات نازل ہوتی رہیں جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کے لئے تیار کیا جائے۔

Marfat.com

آج جو صورتِ حال ہمیں پیش آرہی ہے، اس کی نوعیت محض دو ملکوں میں جنگ یا دو خطوں میں تصادم کی نہیں ہے، بل کہ وہ ایک ایسی تہذیبی روایت سے تصادم اور سابقہ ہے، جو محض ایک سیاسی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک بھرپور فکر و نظریہ، ایک طاقت ور سیاسی روایت، اور ایک پُر کار تہذیب ہے۔ اس تہذیب میں انتہائی متضاد عناصر جمع ہیں۔ اس میں یونانیوں کی عقلی روایات بھی موجود ہیں۔ یونانیوں کی تعلیمات سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں رومی تہذیب کی انسٹی ٹیوشنلائزیشن بھی شامل ہے۔ رومن قانون شامل ہے، رومن دساتیر شامل ہیں۔ رومن حکومتیں اور ان کے ادارے شامل ہیں۔ یہ سب امور اہل مغرب کی یادداشتوں کا حصہ ہیں۔ اسی طرح سے عیسائیت جب سے یورپ میں آئی ہے اور وہ جن جن مدارج اور نشیب و فراز سے گزری ہے، وہ بھی اس کا ایک لازمی حصہ ہیں۔

مغرب کے مزاج اور ذہن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کم از کم مغربی تاریخ کے وہ پہلو واضح ہوں جن سے مغربی ذہن، مزاج اور اہل مغرب کی اجتماعی نفسیات کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان پہلوؤں سے کما حقہ واقفیت کے بغیر نہ اہل مغرب کے مزاج اور ذہن کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان کی اجتماعی نفسیات کا ادراک ہوسکتا ہے۔ ان دونوں باتوں کی عدم موجودگی میں مغرب سے جو بھی معاملہ کیا جائے گا وہ کم زور فکری بنیادوں پر ہوگا۔

یونانی عقلیات، یونانی افکار، رومی تہذیب و تمدن، مسیحیت، متھرا ازم اور سینٹ پال کے افکار وغیرہ کا تعلق دنیائے مغرب کے قدیم فکری پس منظر اور تہذیب مغرب کی اصل بنیادوں سے ہے۔ ان بنیادوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ اہمیت صلیبی جنگوں کے تعصبات و اثرات کو حاصل ہے۔ ان سب باتوں کا تعلق اہل مغرب کی اجتماعی یادداشت سے ہے۔ جو امور ان کے دنیائے اسلام سے تعلق کی نوعیت اور ان کے اثرات کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں وہ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد کے ادوار سے متعلق ہیں۔ کلیسا کی برتری کے خلاف بغاوت، اصلاح مذہب و احیائے علوم کی تحریک، معرکۂ مذہب و سائنس، سیکولرازم کا فروغ، روشن خیالی کا عروج، نیشنلزم کا ظہور اور صنعتی ترقی،

Marfat.com

یہ سب وہ امور ہیں جنہوں نے نہ صرف موجودہ مغرب کے ذہن اور مزاج کی ساخت پر گہرا اثر ڈالا ہے، بل کہ ان سب امور سے دنیائے اسلام بھی متاثر ہوئی ہے۔

اس پوری تہذیب کی اساس اور اٹھان یوں تو ان سب اسباب وعناصر اور محرکات وعوامل کی بنیاد پر ہوئی جن میں سے چند اہم عوامل وعناصر کی طرف اشارہ کیا گیا۔ تاہم ان میں سے چند وہ ہیں جن کی حیثیت گویا اساس الاساسات اور اصل الاصول کی ہے، یعنی

۱۔ الحاد و دہریت اور مذہب بے زاری

۲۔ لادینیت اور

۳۔ غیر مغربی اقوام کی تحقیر

بہ ظاہر پہلی دونوں باتوں میں تکرار معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ تکرار نہیں۔ مغرب کے اہل علم و دانش کی بڑی تعداد الحاد و دہریت کی علم بردار ہے۔ جن اہل علم نے مغربی ذہن کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جن کے خیالات کے گہرے اثرات ہیں ان میں خاصی تعداد الحاد و دہریت کی علم بردار رہی ہے۔ بڑے بڑے شاعر، مفکر، ادیب دانستہ یا نادانستہ انکار خدا کے تصور کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ مذہب کے نام لیوا بھی ہیں اور گویا عملاً بھی عیسائی ہیں وہ بھی زندگی اور مذہب کی تفریق کے قائل ہیں اور مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ایک عام مغربی انسان یا ملحد اور مذہب بے زار ہے یا مذہب کو ایک محدود دائرے میں بند سمجھتا ہے۔

اس کا نتیجہ عملاً وحی کی راہ نمائی کا انکار، کتب سماویہ میں دی گئی راہ نمائی سے صرف نظر، مادیت پسندی اور اخلاقی اقدار کی قطعیت سے انکار کی صورت میں نکلتا ہے۔ اخلاقی اقدار کی قطعیت کے انکار سے واضح طور پر دو نتائج نکلتے ہیں اور اس وقت یہ دونوں نتائج مغربی طرز زندگی اور انداز فکر و عمل کے دو سب سے نمایاں مظاہر ہیں۔

ایک یہ کہ دنیا کی ہر چیز، خاص طور پر اخلاقی اقدار کی نوعیت اضافی ہے۔ گویا نظریہ اضافیت کو سائنس اور تجربیات کے دائرے سے پھیلا کر مذہب، روحانیات اور

Marfat.com

اخلاقیات کے دائرے تک وسیع کر دینا۔ اس رجحان کا واضح اور صاف نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کا تعلق صرف فلکیاتی یا طبیعی علوم سے نہیں رہ گیا، بل کہ آج اس کی زد میں عمرانی اور انسانی علوم کا ہر شعبہ آچکا ہے۔ یوں بھی فلکیاتی اور طبعی علوم میں مغرب کے انکشافات کی بے پناہ چکا چوند نے مؤرخ، فلسفی، ماہر عمرانیات، ماہر سیاسیات اور ماہر معیشت تک کی نگاہوں کو دھندلا دیا ہے۔ چناں چہ ان میں سے ہر علم کے تصورات واساسات کی حیثیت محض اضافی قرار دی جانے لگی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر معاملے میں لحۂ موجود کی اہمیت پر اصرار، جو کچھ فی الواقع موجود ہے اور ہو رہا ہے اس کے مبنی بر حقیقت ہونے کا ایمان آج مغربی اہل علم کے اندر فکر کا ایک اہم مظہر بن چکا ہے۔ جو ہے وہ حقیقت ہے، جو نہیں وہ غیر حقیقی ہے۔ یہاں تک بھی بس ہوتا تو گوارا تھا۔ لیکن ان کے ہاں جو ہے سے مراد وہ ہے جو حواس ظاہری کے دائرے میں آتا ہے۔ جو حواس ظاہری کے دائرے میں نہیں آتا وہ سرے سے موجود ہی نہیں اور غیر حقیقی ہے۔ چناں چہ حقائق غیبیہ اور معارف تکوینیہ سب کے سب غیر حقیقی قرار پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغربی ذہن (چاہے وہ مشرق کے مستغربین کا ہو) حقائق غیبیہ کا یا تو سرے سے انکار کرتا ہے یا ان کی تعبیر استعارے اور مجاز سے کرتا ہے۔ چناں چہ جنت، دوزخ، وحی، ملائکہ، جنات، حشر، نشران سب کے ظاہری معانی کا انکار جدید تہذیب کی قدر مشترک ہے۔

ہمارے ہاں بھی بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات نے ان حقائق کی مجازی تعبیرات کی ہیں۔ علمائے کرام اس صورت حال کا جواب فتاویٰ کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فتوے سے کسی کا ذہن اور انداز فکر بدلنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔

آج مغرب کے مسلسل تسلط، برتری اور استیلا کے اسباب وعوامل میں ان تمام تاریخی اسباب کے ساتھ ساتھ اصل اور بنیادی کردار مغرب کی اعلیٰ اور پیچیدہ ٹیکنالوجی، مستحکم اقتصادیات، فوجی طاقت، عالمی میڈیا اور قومی ذرائع ابلاغ کی برتری کا ہے۔

Marfat.com

مغرب نے یہ ٹیکنالوجی گزشتہ ڈھائی تین سو سال کے مسلسل تجربات اور طویل سائنسی تحقیق کے نتیجے میں حاصل کی ہے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں تقلید مغرب کے پرچم بردار وہاں کی اصل سائنس اور حقیقی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے بہ جائے مغرب کے ظواہر ہی کی پیروی کو نہ صرف خود کافی سمجھتے ہیں، بل کہ زبردستی دوسروں سے منوانے میں بھی ذرہ برابر تامل نہیں کرتے۔ مصطفیٰ کمال جو دنیائے اسلام کے بہت سے حکم رانوں کا آئیڈیل ہے زندگی بھر ظواہر ہی کا اسیر رہا۔ اس ٹیکنالوجی نے مغرب کی اقتصادیات کو بھی محکم تر بنانے میں مدد دی ہے۔ مستحکم اقتصادیات نے فوجی طاقت بنانے اور برقرار رکھنے میں مدد دی۔

آج دنیائے اسلام ان چاروں میدانوں، یعنی اعلیٰ اور برتر ٹیکنالوجی کے حصول، مستحکم اقتصادیات، برتری فوجی قوت اور طاقت ور میڈیا کے قیام میں پیش رفت کر سکتی ہے۔ بہ شرطے کہ وہ ذہنی غلامی سے آزاد ہو اور اپنے شدید احساس کم تری سے نکلے۔ دراصل یہ شدید احساس کم تری اور شعور بے چارگی ہے جو دنیائے اسلام کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ دنیائے اسلام میں جو طبقہ جتنا بااثر ہے وہ ذہنی طور پر مغرب کا اتنا ہی غلام ہے۔ دنیائے اسلام میں عام طور پر معاملات ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بیر مغرب کے سیکھائے ہوئے سبق ہی کو دہرانے میں کام یابی سمجھتے ہیں۔

ہمارے ہاں بہت سے حضرات سادہ لوحی سے مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور مغرب کے ظاہری دعوؤں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو گھر سے نکال دیا ہے، اور اب مغرب ہر مذہبی تعصب سے آزاد ہے۔ وہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو ایک خاص علاقے سے نکالا ہے، گھر سے نہیں نکالا۔ مغرب کی ہر چیز عیسائی تہذیب و تمدن، عیسائی روایات اور عیسائی تعصبات پر مبنی ہے۔ پچھلے چار سو سال سے جس بین الاقوامی قانون کی وہ پیروی کر رہے ہیں۔ ان کا جو بین الاقوامی نظام ہے، جس پر وہ آج بھی پوری دنیا کے معاملات کو چلا رہے ہیں، وہ عیسائی عقائد اور عیسائی اخلاق کی بنیاد پر ہے۔ یہ بات میں نہیں کر رہا۔ مغربی مصنفین نے خود یہ

Marfat.com

بات کہی ہے کہ ہمارے بین الاقوامی قانون کی اساس عیسائی اخلاق اور عیسائی عقائد پر ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ بین الاقوامی قانون کی تعریف ہی یہ تھی کہ بین الاقوامی قانون وہ ہے جو متمدن عیسائی مملکتوں کے درمیان تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یورپ کی متمدن عیسائی مملکتوں کے درمیان تعلقات کو منضبط کرنے کے لئے جو ضابطہ انہوں نے مرتب کیا تھا وہ بین الاقوامی قانون کہلاتا تھا۔ چناں چہ سلطنت عثمانیہ جو مشرقی یورپ کے بڑے حصے پر حاکم تھی، جس کے حکم رانوں میں سلطان بایزید نے ایک زمانے میں ویانا کا محاصرہ کیا ہوا تھا، وہ سلطنتِ عثمانیہ اس بین الاقوامی قانون کے تحت ایک آزاد اور خود مختار متمدن ریاست کے طور پر تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ اس کو بہت آخر میں ۱۸۵۶ء میں تسلیم کیا گیا کہ وہ بھی بین الاقوامی قانون کے تحت ایک آزاد، خود مختار، متمدن اور تسلیم شدہ ریاست ہے، اور ریاست ہونے کے حقوق اور اختیارات استعمال کر سکتی ہے۔

یہی صورت حال آج بھی چلی آرہی ہے، آج بھی ان کی کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے۔ مغرب کا بین الاقوامی قانون جن جن مآخذ سے اپنے قواعد اخذ کرتا ہے، ان میں عیسائی روایات، عیسائی مذہب اور عیسائی اخلاق کے قواعد بھی شامل ہیں۔ لہٰذا عیسائیت کو مغرب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں عیسائیت کا فروغ اور مغربی استعمار کے مفادات یہ دونوں یک جا اور یک ساں مل جل کر کام کرتے ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے لبنان کے ایک بڑے صاحب علم بزرگ ڈاکٹر عمر فروخ نے ایک کتاب لکھی تھی التبشیر والاستعمار (۱) جس میں انہوں نے یہ بتایا تھا کہ مغربی استعمار اور عیسائی مشنریز یہ دونوں کس طرح مل کر کام کرتی ہیں اور کیسے کام کرتی ہیں؟ جب مجھے پہلی مرتبہ افریقہ کے بعض ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں افریقی باشندوں سے یہ جملہ بارہا سننے کو ملا کہ جب انگریز یا گورا ہمارے ملک میں آیا تو اس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور ہمارے ہاتھ میں زمین تھی، اور جب

۱۔ التبشیر والاستعمار فی بلاد العربیۃ۔ تحقیق ڈاکٹر عمر فروخ اور ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی۔ اس کا اردو ترجمہ ''عالم عرب پر مشنری یلغار'' کے نام سے محمد ظہیر الدین بھٹی کے قلم سے جون ۱۹۹۶ء میں اسلامک پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

وہ یہاں سے جانے لگا تو اس کے ہاتھ میں زمین تھی اور ہمارے ہاتھ میں کتاب تھی۔ یعنی گورا بائبل لے کر سرزمین افریقہ میں داخل ہوا۔ دوسو سال کی اس طویل مدت کے دوران بائبل اس نے افریقیوں کو دے دی اور ان کی زمین اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ یہ ایک طے شدہ پالیسی کا حصہ ہے، یہ ایک طے شدہ پروگرام ہے۔

یہ کہنا کہ مغربی دنیا سیکولر ہے، اس لئے اسے مذہبی مفادات سے دل چسپی نہیں ہے، یہ پرلے درجے کی بے وقوفی اور افسوس ناک درجے کی سادہ لوحی ہے۔ مغربی دنیا کو پوری دنیا میں عیسائی مفادات سے کم از کم گزشتہ چار سو سال سے دل چسپی چلی آرہی ہے۔ آج بھی امریکہ اور یورپ کے ہر ملک کو دنیا بھر میں مسیحی مفادات سے مکمل دل چسپی ہے۔ عیسائی مفادات کو فروغ دینے میں ان کی ساری حکومتیں ایک آواز اور ایک دوسرے کے ساتھ متفق اللفظ ہیں۔ دنیائے اسلام میں عیسائیت کو فروغ دینا مغربی ریاستوں کا طے شدہ ایجنڈا ہے۔ دنیائے اسلام میں عیسائیت کی آبادی میں اضافہ کرنا اور پھر ان عیسائی آبادیوں کے لئے دنیائے اسلام میں سے الگ عیسائی ریاستیں کاٹنا اور اس بنیاد پر مسلم ممالک کو تقسیم کرنا بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے۔

اگر دنیا کا نقشہ آپ کے سامنے ہو تو مشرقِ بعید کے نقشے پر نظر دوڑائیں۔ انڈونیشیا کے جزائر اور ملائیشیا کے جزائر کے درمیان ایک بہت بڑا جزیرہ ہے جو جزیرۂ بورنیو کہلاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ جو انڈونیشیا میں شامل ہے، وہ بورنیو کہلاتا ہے، ایک حصہ ملائیشیا میں شامل ہے، جس میں دو ریاستیں ہیں، صباح اور سراوک اور تیسری ایک چھوٹی سی ریاست برونائی ہے، جس کی آبادی تین یا ساڑھے تین لاکھ ہے، جو آزاد ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علاقہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔

آج سے پچاس سال پہلے مغربی دنیا نے یہ طے کیا تھا کہ اس علاقے کو ایک عیسائی سلطنت میں تبدیل کرنا ہے، چناں چہ بڑی بڑی مغربی ریاستیں مل کر وہاں عیسائیت کی تبلیغ کے کام کی مکمل سرپرستی کر رہی ہیں۔ بورنیو میں کام کرنے والی عیسائی مشنریوں کو بے پناہ مالی اور مادی وسائل فراہم کر رہی ہیں۔ عیسائیوں نے اس علاقے کو جو بیشتر غیر

Marfat.com

آبادزمین پر مشتمل تھا، وہاں کے مقامی باشندوں سے خریدا، مقامی باشندوں نے پیسے کے لالچ میں اپنی زمین بیچی، عیسائی خریداروں نے وہاں اس کو آباد کیا۔ ڈیم بنائے، ائرپورٹ بنائے۔ اسپتال اور اسکول بنائے، قرب و جوار سے عیسائی آبادی کو لاکر وہاں آباد کیا۔ اور آبادی کی شرط یہ رکھی کہ جو عیسائی مذہب قبول کرے گا، اسے وہاں زمین ملے گی۔ اس کو وہاں اسکول میں داخلے ملیں گے، اس کا وہاں مفت علاج ہوگا۔ اس پورے منصوبے پر گزشتہ چالیس سال سے کام ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ انڈونیشیا کے اس صوبے میں عیسائی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ویٹکن میں انٹرنیشنل کونسل آف چرچز میں یہ طے کیا گیا تھا کہ بیسویں صدی کے آواخر تک اس کو عیسائی اکثریت والا علاقہ بنادیا جائے گا۔ اور اکیسویں صدی کے آغاز میں اسے ایک آزاد ملک بنادیا جائے گا۔ الحمدللہ یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوا، لیکن عیسائیت کی تبلیغ وہاں زور وشور سے جاری ہے۔ انڈونیشیا میں جو افراتفری ہوتی ہے، یا مشرقی تیمور کو جو یکا یک اور آناً فاناً الگ اور آزاد ریاست کی شکل دی گئی یہ محض اتفاقیہ واقعات نہیں ہیں۔ یہ بڑی طویل المیعاد اور گہری منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہیں۔

اسی طرح سوڈان میں جو ہو رہا ہے، اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ سوڈان کے جنوب میں عیسائی آبادی میں اضافہ کیا جائے۔ جب عیسائی آبادی میں اضافہ ہو جائے گا تو سوڈان کے جنوب میں ایک نیا اسرائیل بنادیا جائے گا، جو باب المندب پر بحر قلزم کے مغربی راستے پر اہل مغرب کے چوکیدار کا کردار ادا کرے گا۔ اگر دنیا کا نقشہ آپ کے سامنے ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مغرب کی تجارت کا بڑا حصہ نہر سویز سے گزرتا ہے، اور نہر سویز پر اسرائیل آکر بیٹھ گیا ہے، لہٰذا مغرب کے لئے نہر سویز اب نسبتاً محفوظ ہے۔ لیکن جو سامان وہاں سے گزرتا ہے وہ باب المندب سے گزرتا ہے۔ اور باب المندب پر سو فیصد مسلمان آبادی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ باب المندب پر ایک ایسی آبادی ہو، اور وہاں ایسا ملک ہو جو سو فیصد مغربی طاقتوں کے لئے قابل بھروسہ ہو، اس لئے جنوبی سوڈان میں عیسائی آبادی پیدا کرکے وہاں ایک عیسائی مملکت بنانا مقصود ہے۔ ایک نیا اسرائیل صومالیہ

Marfat.com

اور اری ٹیریا میں بنانا مقصود ہے، اسی لئے صومالیہ میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ اسی لئے صومالیہ میں جھگڑے ہو رہے ہیں۔ اسی لئے صومالیہ میں امریکہ کو دلچسپی ہے، اور ہمارے حکمراں بغیر سوچے سمجھے صومالیہ میں اپنی فوجیں ''قیام امن'' کے لئے بھیجنے کو بے تاب رہتے ہیں، گویا قیام امن واقعی ان کا مقصود ہے۔ سوال یہ ہے کہ بدامنی کس نے پیدا کی؟ بدامنی کیوں شروع ہوئی، اس پر کوئی غور نہیں کرتا، جب گورے کی ہدایت آتی ہے کہ قیام امن کے لئے فلاں جگہ فوج بھیجو اور مسلمانوں کی بندوقوں کے ذریعے مسلمانوں کو زیر کر کے ہمارے مفادات کے لئے راہ ہموار کرو تو تیمور میں بھی فوج چلی جاتی ہے، صومالیہ میں بھی چلی جاتی ہے اور اری ٹیریا میں بھی چلی جاتی ہے۔ دنیائے اسلام کے سپاہیوں کے ذریعے، دنیائے اسلام کی بندوقوں کے ذریعے، دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی تلواروں کے ذریعے مسلمانوں کی گردنیں کاٹی جائیں، اور ان کو کاٹ کاٹ کر عیسائی اور مسیحی ریاستیں قائم کی جائیں، یہ ان کی پالیسی ہے۔ یہ چھوٹی سی مثال ضمناً میں نے عرض کی کہ دنیائے اسلام کے بارے میں ان کے یہ مذہبی تعصّبات اور عزائم ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ عیسائی عقائد ان کی پالیسی کا لازمی حصہ ہیں۔

ان مسیحی تعصّبات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیم کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ آج جو مسیحیت دنیا میں رائج ہے وہ متھراازم کے بت پرستانہ اور مشرکانہ عقائد اور سینٹ پال کی مسیحیت جدیدہ کے ملغوبے سے عبارت ہے۔ اس میں برکت کے لئے حضرت عیسی علیہ السلام کا نام بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ ملغوبے کے ان دو اجزا کے بعد تیسرا جز صلیبی جنگوں کے تعصّبات کا ہے، جو دنیائے اسلام سے مغرب کے تعلقات کے باب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ پھر گزشتہ ساڑھے تین سو سال سے جب سے استعمار کا دور شروع ہوا ہے سابقہ تعصّبات میں ایک نئے اور اہم عنصر کا اضافہ ہوا، یعنی استعمار۔ استعمار شروع کیسے ہوا؟ استعمار کا بھی بہت گہرا تعلق مسیحیت کی مذہبی تاریخ اور ان کے تجارتی مفادات سے ہے۔ مختلف اسباب کی بنا پر جب یورپ میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا، وسیع پیمانے پر صنعتی ترقی ہوئی، تو ایک مزدور جتنی پیداوار ایک مہینے میں کرتا تھا، اتنی

Marfat.com

پیداوار وہ مزدور اب مشینوں کی مدد سے ایک گھنٹے میں کرنے لگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس وسیع اور تیزی سے بڑھتی ہوئی پیداوار کو فروخت کہاں کیا جائے، بیچا کہاں جائے؟ اس کے لئے بازار اور خریدار درکار تھے، منڈیوں کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی، منڈیوں کی تلاش میں نکلے تو افریقہ ایک آسان منڈی نظر آئی۔ چناں چہ سب نے مل کر تیزی سے افریقہ کو غلام بنایا۔

انگریزی میں ایک مشہور کتاب ہے دی روٹس، اس پر مبنی ایک فلم بھی بنائی گئی تھی، جس میں یہ بتایا گیا کہ امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک نے افریقیوں کو کیسے غلام بنایا؟ اور کس طرح کے مظالم کے نتیجے میں افریقہ کا براعظم غلام ہوا۔

ایشیا کا معاملہ ذرا مشکل تھا، ایشیا میں متمدن ریاستیں تھیں، مغل سلطنت تھی، سلطنت ایران تھی، سلطنتِ ترکی تھی، یہاں غلام سازی کا یہ کام اتنا آسان نہیں تھا، اس لئے ایشیا کو غلام بنانے میں وقت لگا، افریقہ پر قبضہ آسان تھا، وہ جلدی ہوگیا۔ ایشیا پر قبضے کے لئے بہت طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ایک چھوٹی سی مثال دے کر آگے بڑھتا ہوں۔ یہ سب واقعات ذہن میں رکھنے چاہئیں، تاریخ قوموں کا حافظہ ہوتی ہے، فرد اگر اپنا حافظہ بھول جائے تو اس کا مقام پاگل خانہ ہوتا ہے، اگر قوم اپنا حافظہ بھول جائے تو اس کا کیا مقام ہونا چاہئے، اس کا آپ خود اندازہ کرلیں۔ اسی لئے میں کبھی کبھی یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ایک کام یاب حکم راں کے لئے ماہر معاشیات ہونا ضروری نہیں ہے، کام یاب حکم راں کے لئے ماہر قانون ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح کام یاب فرماں روا کے لئے اور بھی بہت سے ضروری فنون سے ماہرانہ باخبری ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ہر فن کے ماہرین حکم راں کو مشورہ دینے کے لئے مل جائیں گے، لیکن کام یاب حکم راں کو تاریخ دان ہونا ضروری ہے، اسے تاریخ کا شعور ہونا چاہئے، اس لئے کہ تاریخ پوری قوم کا حافظہ ہے، اگر حکم راں تاریخ کا شعور نہ رکھتا ہو تو وہ کام یاب حکم راں نہیں بن سکتا، وہ ناکام حکم راں ثابت ہوگا۔

جب انگریز سب سے پہلے بنگال پر قابض ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان

Marfat.com

کی فیکٹریوں کے بنائے ہوئے کپڑے ہندوستان میں نہیں چل سکتے، اس لئے کہ بنگال اور ڈھاکے کی ململ پوری دنیا میں جا رہی تھی، اور اس میں نفاست کا معیار یہ تھا کہ ململ کا پورا تھان ایک انگلی کی انگوٹھی کے اندر سے نکل جائے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کے کپڑے اس معیار کے نہیں ہوتے تھے۔ اس کا حل انگریزی تہذیب نے یہ نکالا کہ ان پارچہ بافوں کو ہی بے کار کر دیا جائے جو اتنا نفیس کپڑا تیار کرتے ہیں۔ چناں چہ تہذیب اور انسانیت کے پرچم بردار انگریزوں نے ململ کے بنگالی کاریگروں کے انگوٹھے گنڈاسے سے کاٹ کاٹ کر الگ کر دیئے، تا کہ آئندہ بھی کوئی کھڈی نہ لگا سکے، اور ایسی نفیس ململ نہ بنا سکے۔ چناں چہ وہ دن اور آج کا دن، ڈھاکے میں پھر وہ ململ نہیں بن سکی۔ یہ ایک مثال ہے کہ کیسے یہاں کی مقامی انڈسٹری ختم ہوئی اور کیسے یہاں انگلستان کی انڈسٹری کو رواج ہوا۔

جب انگریز ہندوستان میں ابھی آ رہے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا آغاز تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر کے قریب یہاں کی تعلیمی صورت حال پر ایک سروے کیا گیا۔ اس سروے میں یہ بتایا گیا کہ پنجاب میں جو اس زمانے میں ایک دور دراز علاقہ تھا، دار الحکومت سے دور تھا، جو اس وقت دہلی تھا۔ تہذیب و تمدن کا مرکز اس وقت یا دہلی تھا یا لکھنؤ تھا یا کسی حد تک لاہور تھا۔ پنجاب کے علاقے دور افتادہ علاقے سمجھے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس سروے کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب سو فیصد تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں میں پنجاب میں سو فیصد تعلیم تھی، اور بہ حیثیت مجموعی ۸۴ فیصد تعلیم تھی۔ اور جب انگریز ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے گیا تو پنجاب میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب ۴ فیصد تھا۔ انگریز سو فیصد تعلیم کو چار فیصد پر لے آئے اور پوری قوم کو جاہل چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے اس دعوے کی حقیقت جو کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک کا ایک سویلائزنگ رول تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح اور مشرق بے زار لوگ کہتے ہیں کہ انگریز نے ہمیں سویلائز اور متمدن کر دیا۔ یہ سویلائز کیا کہ سو فیصد تعلیم کو سو فیصد جہالت میں بدل دیا۔ یہ اعداد و شمار آپ کے سامنے ہیں کہ سو فیصد تعلیم یافتہ آبادی کو وہ چار فیصد پر لے آئے اور چھوڑ کر چلے گئے، اور ہم ابھی تک سارے دعوں

Marfat.com

باوجود ۵۰ فیصد تک بھی شرح خواندگی نہیں لے جاسکے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ یہ جو کچھ ہوا محض ایک اتفاق تھا، یا مسلمانوں کی اپنی کم زوری کے اثرات تھے محض سادہ لوحی ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی کم زوریاں تھیں، پہلے بھی تھیں آج بھی ہیں، لیکن ان کم زوریوں کو ہزار ہا گنا بڑھا دینے کی اصل وجہ ایک گرینڈ اسٹریٹجی تھی جو دنیائے اسلام کے آزاد اور باعزت اسلامی مستقبل کو تباہ کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ یہ دونوں چیزیں ملیں تو یہ نتیجہ نکلا، جو آج ہم سب کے سامنے ہے۔

انگریز دراصل یہاں اپنے معاشی مفادات کے لئے آئے تھے، شروع میں وہ تجارت کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے کام کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یہاں پر حکومت کرنے، یا یہاں کا نظام بہتر بنانے، یا یہاں کے لوگوں کو سویلائز کرنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں صرف تجارت اور کاروبار کرنے آئی تھی۔ انگریز تاجر یہاں سے نفع کمانے آئے تھے، یہ اس کا ایک تجارتی کام تھا، تجارتی انٹرپرائز کو جس طرح چلایا جاتا ہے، اسی طرح چلانے کے لئے وہ آئے تھے۔ چناں چہ کمرشل انٹرپرائز کے طور پر وہ ہندوستان کو چلاتے رہے۔ اور اس کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ہم مزید یہاں نہیں رہ سکتے، تو وہ یہاں سے چلے گئے، لیکن وہ اس بات کو یقینی بنا کر گئے کہ ان کے معاشی مفادات اسی طرح جاری رہیں، اور اس میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

ایک چھوٹی سی مثال بیان کرتا ہوں، اگر چہ میرے ذہن میں مثالیں بے شمار ہیں، مگر میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، پاکستان ایک زمانے میں اسپین اور اٹلی سے کھانے پکانے کا تیل منگوایا کرتا تھا، میرے ایک انتہائی عزیز اور مخلص دوست، جن سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے بارے میں مخلص لوگ میں نے دنیائے اسلام میں بہت کم دیکھے ہیں، ڈاکٹر علی منتصر کتانی، یہ مراکش کے رہنے والے تھے، ایک بہت بڑے عالم اور محدث شیخ محمد منتصر کتانی کے صاحبزادے تھے، سائنس دان تھے اور مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم او آئی سی کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ادارے کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے خود بہ راہِ راست مجھے بتایا کہ میں نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے یہ کہا کہ آپ اپنی

Marfat.com

ضرورت کے لئے تیل کا بڑا حصہ اسپین اور اٹلی سے منگواتے ہیں، حال آن کہ اس سے اچھا اور سستا تیل ملائشیا میں پیدا ہوتا ہے، اس لئے اگر آپ یہ تیل ملائشیا سے منگوائیں تو مسلمانوں کی باہمی تجارت میں اضافہ ہوگا۔

آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام کی باہمی تجارت بین الاقوامی تجارت کا صرف آٹھ فیصد ہے۔ دنیائے اسلام کی ۹۲ فیصد تجارت مغربی دنیا سے ہوتی ہے اور محض آٹھ فیصد تجارت آپس میں ہوتی ہے۔ بہ ہر حال ڈاکٹر علی منتصر کتانی نے صدر ضیاء الحق مرحوم کو اس کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ اس پر جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ بہت اچھا۔ انھوں نے حکم دے دیا کہ آئندہ سال سے کھانے کا تیل ملائشیا سے منگوایا جائے گا۔ اب دیکھئے کہ بہ ظاہر امریکہ اور یورپ کے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں۔ بیانات سے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے، یہ کشیدگی حقیقی ہے یا فرضی ہے میں نہیں جانتا۔ لیکن جو بات میں عرض کر رہا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کشیدگی کی نوعیت کیا ہے؟ جب صدر ضیاء الحق نے یہ طے کیا کہ کوکنگ آئل آئندہ ملائیشیا سے درآمد کیا جائے تو امریکی صدر ریگن نے انہیں فون کیا اور انہیں کہا کہ آپ یہ سودا منسوخ کر دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو امریکی صدر نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو ہم آپ کے ایف سولہ طیاروں کا سودا منسوخ کر دیں گے، اور آپ کی رقم ضبط کر لیں گے، اس وقت تک انہوں نے یہ سودا ختم نہیں کیا تھا۔ چناں چہ صدر ضیاء الحق نے خواہ گھبرا کر، بزدلی دکھا کر یا مصلحت سے جو چاہے کہہ لیں یہ سودا منسوخ کر دیا۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دنیائے مغرب میں اپنے مادی مفادات کے بارے میں کتنی یک جہتی پائی جاتی ہے۔ مغرب کے باہم متحارب ممالک کے درمیان جتنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کی ایک فی ہزار بھی یک جہتی دنیائے اسلام کے ممالک میں نہیں ہے۔ یہ بھی ذاتی معلومات اور مشاہدات کی بنیاد پر عرض کر رہا ہوں، اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں ہے، ایسا کیوں ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے دنیائے اسلام میں ایک نئے انداز کا فکری کام شروع ہوا ہے۔ اگر چہ آغاز میں اس نئے انداز کے کام سے بعض حضرات کو بہت قوی

Marfat.com

امیدیں وابستہ ہوگئی تھیں، لیکن گزشتہ ساٹھ ستر سال کے تجربے نے ان امیدوں کو خاصا دھندلا دیا ہے۔ یہ مغربی انداز کی سیاسی جماعتوں کی طرز پر دینی جماعتوں کی تشکیل کا رجحان تھا، جس کی مثالیں انڈونیشیا سے مراکش تک اور ترکی سے سوڈان تک ہر جگہ دیکھنے میں آئیں۔ اگرچہ بعض اہل بصیرت مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ نے اس رجحان پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا، لیکن بالآخر بیسویں صدی میں یہی رجحان غالب ہو کر رہا۔ اب گزشتہ ساٹھ ستر سال کے تجربے کے بعد ان بزرگوں کے وہ تحفظات یاد آتے ہیں جن کو اس رجحان کی افادیت اور نتیجہ خیزی کے بارے میں تامل تھا۔ تجربہ بہ ظاہر یہی بتاتا ہے کہ مغربی انداز کی سیاسی جماعتوں اور سیکولر ڈیموکریسی کے انداز کے سیاسی عمل کے ذریعے مغرب کی بڑھتی ہوئی جارح تہذیب کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اسلام اور احیائے اسلام کے نام پر بننے والی ان دینی سیاسی جماعتوں، دینی کم، سیاسی زیادہ کے کام کے مثبت اور منفی نتائج کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے (جس کی اب شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے) تو مستقبل کے بارے میں زیادہ امید کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے۔

مغربی تہذیب، مغربی علوم وفنون بالخصوص عمرانی اور انسانی علوم کا مقابلہ بعض اہل علم نے خالص عقلی انداز سے کرنا چاہا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے بہت سے مسلمان اہل علم نے قدیم (یونانی) انداز کے عقلی دلائل کی بنیاد پر مغرب سے آنے والے اعتراضات اور شبہات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ بلاشبہ ان اہل علم کی تحریروں نے بہت سے مسلمان نوجوانوں کو پھسلنے سے بچایا۔ اور اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال رکھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ پیچیدہ مغربی عقلیات کا (جو تشکیک، دہریت، الحاد، تجربیات، جذبات وشہوات کا ملغوبہ ہے) مقابلہ ابن سینا اور رازی کی ازکار رفتہ عقلیات سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے رومی اور سرہندی کی توانا اور زندگی سے بھرپور روحانیت، شاہ ولی اللہ کی مبنی بر قلب عقلیت اور اقبال کی ناقدانہ اور مدرکانہ نظر درکار ہے۔

مغرب سے ہمارا سابقہ ایک طویل عرصے سے چلا آرہا ہے۔ اس میں مسلسل

Marfat.com

نشیب و فراز آتے ہیں، فراز کم آتے ہیں، نشیب زیادہ آتے ہیں۔ اب جو آئندہ نشیب آتے دکھائی دیتے ہیں وہ نشیب سے زیادہ گہری کھائی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو نشیب کہنا بھی شاید مناسب نہ ہو، یہ ایک گہری کھائی ہے۔ ابھی تک صورت یہ تھی کہ دنیائے اسلام میں استعماری ایجنڈا تھا، حکومتیں مغرب کے اشاروں پر چلتی تھیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کی حکومتوں میں جو لوگ کارفرما ہیں، ان کی خاصی بڑی تعداد وہ ہے جو مغرب کے ذہن سے سوچتی ہے۔ مغرب کے مفادات کی تکمیل میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کو تیار رہتی ہے۔ اور یوں ان لوگوں کے ذریعے مغربی مفادات کی تکمیل کا سامان خود بہ خود ہوتا رہتا ہے۔ اس کے معاوضے میں یہاں ان کے کارندوں کو مفادات بھی ملتے رہتے ہیں۔ یہ بات محض اتفاق نہیں ہے کہ ہمارے ہاں جو اعلیٰ عہدوں سے ریٹائر ہوتا ہے اس کے بچے پہلے سے امریکہ اور کینیڈا جا کر آباد ہو جاتے ہیں، ان کو بڑے بڑے مکانات مل جاتے ہیں، بڑی بڑی نوکریاں ریٹائرمنٹ سے پہلے ان کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ آخر عوامی زبان میں اہل مغرب ہمارے چاچے مامے تو نہیں لگتے۔ اہل مغرب کو ان سے کوئی ایسی محبت تو نہیں ہوتی۔ یا ان سے بڑے ماہرین اہل مغرب کے ہاں کیا نہیں پائے جاتے؟ ان ماہروں کی مہارتوں کے نمونے تو پاکستان کے گلی کوچوں میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ پھر بھی یہ ماہرین مغرب میں ہاتوں ہاتھ کیوں لئے جاتے ہیں؟ یہ آپ خود غور کر لیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

لیکن مخلص وفاداروں کی فوج ظفر موج کی موجودگی کے باوجود مغرب کے قائدین نے یہ محسوس کیا کہ اب دنیائے اسلام میں بالخصوص اور دنیائے مشرق میں بالعموم ایک نئی رو پیدا ہو رہی ہے، اور اپنے بارے میں ایک نئے اور آزاد مستقبل کی تشکیل کا ایک طاقت ور رجحان جنم لے رہا ہے۔ یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ دنیائے اسلام کا مستقبل اس کے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ مختلف دینی تحریکات پیدا ہو رہی ہیں۔ قومی تحریکات اٹھ رہی ہیں۔ آزادی کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ دین کی طرف رجوع کی دعوتیں مختلف انداز اور مختلف معیاروں کی اٹھ رہی ہیں۔ یہ چیز آگے چل کر ان کے لئے خطرہ بن سکتی

Marfat.com

ہے۔اس خطرے کا سد باب کرنے کے لئے جس کا عالم اسباب کے نقطہ نظر سے بہ ظاہر آئندہ پچاس سال کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا۔انہوں نے سال ہا سال پہلے تدبیریں شروع کر لی ہیں۔

بہ ظاہر ان کی تدبیروں کا رخ تین انداز کا معلوم ہوتا ہے۔اسے آپ Three Pronged Strategy کہہ سکتے ہیں۔تین رجحانات رکھنے والی حکمت عملی پر وہ کام کر رہے ہیں۔ایک حکمت عملی تو اسلامی تحریکات یا اسلامی تنظیموں یا اسلامی اداروں سے ڈیل کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔جس کی طرف میں ابھی آتا ہوں۔

ایک حکمت عملی وہ ہے جو دنیائے اسلام کے نقشے کی ازسرنو تشکیل سے عبارت ہے۔جس کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ آرہا ہے۔

اور تیسری حکمت عملی وہ ہے جو دنیائے اسلام اور مسلمانوں کی مستقبل میں منصوبہ سازی کی اسکیم ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کا معاشی، سیاسی، تعلیمی اور قانونی نظام کیسا ہونا چاہئے؟ ان کا ثقافتی اور تہذیبی رویہ کیسا ہونا چاہئے۔ان کا مستقبل میں نظام کیا ہونا چاہئے؟

جہاں تک پہلی حکمت عملی کا تعلق ہے کہ جو لوگ دین کا کام کر رہے ہیں، ان سے کس طرح ڈیل کی جائے؟ اس کے لئے آج سے پچیس تیس سال پہلے سے کوششیں شروع ہوئیں اور ان پچیس تیس سالوں میں یہ مطالعہ کیا گیا کہ دنیائے اسلام میں اسلام کا نام لینے والے کون کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟

میں ایک ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بات بتاتا ہوں۔اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ایک پروفیسر صاحب امریکہ سے تشریف لائے، وہ ایک مشہور امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔انہوں نے پاکستان کے مختلف اداروں کا دورہ کیا۔وہ ادارہ تحقیقات اسلامی میں بھی آئے۔میں اس زمانے میں ادارہ تحقیقات اسلامی میں کام کرتا تھا، نوجوان تھا، دینی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا، عربی اچھی جانتا تھا۔ انگریزی سے بھی شد بد ہو گئی تھی، تھوڑی بہت فرنچ بھی میں نے سیکھ لی تھی۔وہ پروفیسر صاحب بہت سے لوگوں سے ملے، مجھ سے بھی ملے۔مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے کہا

Marfat.com

کہ میں الگ سے گفت گو کرنا چاہتا ہوں، تم مجھ سے ملنے کے لئے آؤ۔ میں ان سے ملنے چلا گیا۔ دوران ملاقات انہوں نے کہا کہ میں تمہیں امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے اسکالرشپ دینا چاہتا ہوں، تم امریکہ کی جس یونیورسٹی میں چاہو میں تمہیں اسکالرشپ دے سکتا ہوں۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ ہارڈورڈ صف اول کی یونیورسٹی ہے، اور ایم آئی ٹی ہے، اور پرسٹن ہے، تین یونیورسٹیوں کا بڑا چرچا تھا، اس لئے میں نے ان کا نام سنا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے ہارڈورڈ میں داخلہ دلوا دیں۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں تمہیں ہارڈورڈ میں داخلہ دلوا دوں گا۔ کام یہ ہو گا کہ تم ایک سال کے لئے امریکہ آؤ، ہارڈورڈ یونیورسٹی میں کورس ورک کرو، پھر میرے پاس آؤ۔ تین مہینے میرے پاس کورس ورک کرو، اور پھر واپس پاکستان آ جاؤ۔ انہوں نے جو نقد وظیفہ بتایا وہ اتنا تھا، جتنا اس وقت حکومت پاکستان کے سیکریٹری کو بھی تن خواہ نہیں ملتی تھی۔ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بھی نہیں ملتی تھی۔ پاکستان میں رہ کر یہ وظیفہ ملنا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کام یہ ہو گا کہ پاکستان میں رہ کر یہ معلومات جمع کرو کہ پاکستان میں دینی مدارس کیا کام کرتے ہیں، کتنے دینی مدارس ہیں؟ کون کون علمائے کرام ان کو چلا رہے ہیں، وہ کیا کیا پڑھاتے ہیں، کیا ذہن بناتے ہیں؟ اور جو لوگ ان سے تیار ہوتے ہیں وہ بعد میں کیا کام کرتے ہیں، ان کا رویہ مغرب کے بارے میں کیسا ہوتا ہے؟ یہ ساری معلومات جمع کر کے آؤ، پھر میرے ساتھ بیٹھ کر اس کو مرتب کرو، اس کی بنیاد پر تمہیں ہارڈورڈ یونیورسٹی پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دے گی۔

سچی بات ہے، میں اللہ تعالیٰ کی تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت یہ لگا کہ یہ تو صاف صاف جاسوسی کا کام ہے، دوران گفت گو پروفیسر صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس طرح کا ایک پروجیکٹ مصر کے لئے ہے، ایک بنگلہ دیش اور انڈونیشیا کے لئے ہے۔ اب یہ چار بڑے ملک جو آبادی کے لحاظ سے صفِ اول کے ممالک تھے، جہاں دینی تعلیم کا پرائیویٹ نظام بڑا غیر معمولی تھا۔ وہاں کے لئے یہ کیوں تحقیق ہو رہی تھی؟ اس پر لاکھوں روپے کے یہ مصارف کیوں کرائے جا رہے تھے؟ میں نے کوئی ذاتی عذر بیان کر کے معذرت کر لی کہ میں سردست امریکا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس وقت سے میں جب بھی

Marfat.com

اس نوعیت کے مختلف معاملات کو دیکھتا رہتا ہوں تو مجھے یہ لگتا ہے کہ مغربی دنیا کم از کم ۱۹۷۴ء سے اس نکتے پر سوچ رہی تھی کہ دنیائے اسلام میں دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہے، ماضی کیا تھا، اور حال کیا ہے؟ اب پچھلے آٹھ دس سال سے اس میں زیادہ شدت آگئی ہے۔

ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے اس سلسلے میں ایک اہم رپورٹ آئی ہے۔ سی آئی اے کا ماتحت ادارہ ہے رینڈ کارپوریشن، جب سی آئی اے کو کوئی کام کرانا ہوتا ہے تو اس کو اسائمنٹ دیتے ہیں، اس طرح کے بہت سے ادارے ہیں، ان میں ایک رینڈ کارپوریشن بھی ہے۔ اس رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ میں لکھا ہوا ہے کہ دنیائے اسلام میں اور بالخصوص پاکستان میں چار پانچ مذہبی رجحانات کے علم بردار لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک اسلامک ہارڈ لائنرز ہیں، اسلامی انتہا پسند یا ایکسٹریمسٹ ہیں، جن کی یہ اور یہ تفصیلات ہیں۔ اس رپورٹ کی میرے پاس کاپی موجود ہے، اس رپورٹ کے الفاظ میں ہارڈ لائنز اور ایکسٹریمسٹ وہ ہے، جو قرآن پاک کو لفظی اور حقیقی طور پر خدا کا کلام مانتا ہو، قرآن پاک پر ظاہری الفاظ کے مطابق عمل کرنے کو ضروری سمجھتا ہو، اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہو۔ یعنی میرے ذاتی خیال میں مسلمان ہونے کی جو کم سے کم شرائط ہیں یعنی جو قرآن پاک کو اللہ کا کلام سمجھتا ہو، اس پر عمل کرنے کو ضروری جانتا ہو اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہو۔ اس سے کم میں تو مسلمان ہی نہیں ہوسکتا۔ جو ان تین باتوں پر ایمان رکھتا ہو وہ ہارڈ لائنر ہے، وہ فنڈامینٹلسٹ ہے۔ ایک طبقہ تو یہ ہے۔ پھر اس کی آگے چل کر تفصیل ہے۔ پھر مزید طبقات کا ذکر ہے۔

آخر میں ایک اور طبقے کا ذکر ہے جو خاصا بااثر ہے، جو لبرل ہے، روشن خیال ہے، جو اسلام سے صرف کلچر اور نیشنل قسم کی وابستگی رکھتا ہے، کیوں کہ مسلمان قوم ایک مذہب کو بھی مانتی ہے اور قومی اعتبار سے اس لبرل طبقے کے لوگ بھی مسلمانوں ہی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے ہیں، اور ان کے فائدے کو اپنا فائدہ سمجھتے ہیں، مگر انہیں اسلام کے مذہبی پہلو سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، اس طبقے کو ہمیں سپورٹ کرنا چاہیے، اور فلاں فلاں اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ بڑی ضخیم رپورٹ ہے۔ آج کل ان کی دنیائے اسلام

Marfat.com

کے بارے میں یہ سوچ ہے۔ یہ تو وہ پہلو ہے کہ مذہب اور مذہبی تعلیمی اقدار کے علم برداروں سے کیسے ڈیل کی جائے؟

حکمت عملی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ جو جغرافیائی حیثیت پر نظر ثانی کی جائے۔ دنیائے اسلام کے سیاسی نقشے کو تبدیل کیا جائے۔ آج کل بڑے بڑے مسلم ممالک کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کنٹرول کرنا اور قابو کرنا مشکل ہے، پاکستان ایک بڑا ملک ہے، ۱۵ کروڑ کی آبادی ہے، دس لاکھ فوج ہے، تمام تر تختی کے باوجود ایٹم بم بھی بنا لیا ہے۔ انڈونیشیا ۲۵ ر کروڑ کی آبادی ہے، انڈسٹری میں ترقی کر لی ہے، معاشیات میں ترقی کر لی ہے اب وہ قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ ملائشیا بڑا ملک ہے، اگر چہ مسلمانوں کی آبادی نسبتاً کم ہے لیکن معاشی طور پر یہ قوی ہو گیا ہے۔ مصر معاشی طور پر خوش حال ہو گیا ہے۔ سعودی عرب بھی ایک بڑا ملک ہے، تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ ممالک قابو میں نہیں آ رہے ہے، جس طرح ہم قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں، اس طرح قبضے میں یہ نہیں آ رہے ہے، اس لئے ان کے نقشے کو تبدیل کیا جائے۔ ان چار پانچ ممالک کے نقشے کو تبدیل کرنا پہلے اسٹیج پر ضروری ہے۔ چناں چہ اس منصوبے کے تحت وہ ایران کا نقشہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں، عراق کا، پاکستان کا، مصر، سعودی عرب اور کسی حد تک ترکی کا نقشہ تبدیل کرنا اور ان ممالک میں نئی نئی مزید وفادار ریاستیں بنانا اس منصوبے کا حصہ ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا کو بھی دو دو تین تین علاقوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے وہ کیا کر رہے ہیں وہ روزانہ آپ کے سامنے آ رہا ہے، روزانہ چھوٹی چھوٹی خبروں میں اس منصوبے کی تفصیلات آتی رہتی ہیں۔ اکثر اہم باتیں چھوٹی چھوٹی خبروں میں ہی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ بڑی سرخیوں میں کوئی پتے کی بات نہیں ہوتی۔ بڑی سرخیوں میں عموماً وہ باتیں ہوتی ہیں، جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے کہی جاتی ہیں۔ جو اصل عزائم کی باتیں ہوتی ہیں وہ اندر کہیں چھوٹی چھوٹی خبروں میں چھپی ہوتی ہیں۔ ان خبروں سے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ سادہ لوحی میں، بے وقوفی میں، کسی عارضی وقتی مصلحت کے تحت ان کا شکار ہو جاتے ہیں، اور ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہیں،

Marfat.com

کسی وقتی شکایت کی بنیاد پر، کوئی ذاتی شکایت کی بنیاد پر، کسی کو ذاتی طور پر حکم راں سے شکایت ہے اور غصے میں اس نے اپنی عقل وفہم سے کام نہیں لیا۔ اس طرح کے اسباب کی بنیاد پر وہ مناسب لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں، ممکن ہے بعض حضرات کو بری لگے، اس کے لئے میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں، بہت سے حضرات کو شاید اتفاق نہ ہو، اس کی بھی معذرت چاہتا ہوں۔ اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں جو دینی تعلیم کے ادارے ہیں ان کو ختم کر دیا جائے، مذہبی اداروں پر ضرب لگائی جائے اور ان پر کریش ڈاؤن کیا جائے۔ کریش ڈاؤن کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی اداروں کا دنیا میں ایک ہارڈ لائنز اور جنگ جو قسم کا امیج سامنے لایا جائے۔ وہ امیج ہم اور آپ خود سامنے لا رہے ہیں، ہمارے اور آپ کے بہن بھائی سامنے لا رہے ہیں، کس کے اشارے پر سامنے لا رہے ہیں، بے وقوفی و نالائقی سے لا رہے ہیں، غلط جذبے سے لا رہے ہیں، یہ اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن ہمارے اپنے پر جوش اور فہم سے عاری لوگ اس امیج کو خود پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے بعض پر جوش لیکن کم فہم اور بے بصیرت لوگوں کی حرکتوں سے یہ تاثر دن بہ دن مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ یہ مدرسے جنگ جوؤں کے اڈے ہیں، اور پورے عالم اسلام میں یہ فساد اور اختلاف کا مرکز ہیں، اس لئے ان پر ضرب لگائی جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کا سامان ہمارے بہن بھائی اخلاص یا بے وقوفی یا دونوں چیزوں کے نتیجے میں زور وشور سے کر رہے ہیں۔ میں انتہائی دکھ اور دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ اگر اس کو نہ روکا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آزاد دینی تعلیم کی جو بھی روایت ہمارے ہاں موجود ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ منبر کی آزادی ایک سراب ہو جائے گی۔ یہ جو میں عرض کر رہا ہوں، خدا کرے ایسا نہ ہو لیکن بہ ظاہر لکھا ہوا یہی نظر آ رہا ہے۔ یہ محض اتفاقات نہیں ہیں، یہ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے۔ تلوار استعمال کرنا بڑی بہادری ہے، لیکن استعمال نہ کرنا اس سے زیادہ بہادری ہے، جتنی بہادری تلوار استعمال کرنے کے لئے درکار ہے، اس سے زیادہ استعمال نہ کرنے کے لئے درکار ہے، جتنا حق بات کہنا جرأت کا متقاضی ہے، اپنے

Marfat.com

خیالات و جذبات کو چھپانا اس سے زیادہ جرأت کا متقاضی ہے، اتنا ہی حق بات سننا بھی جرأت کا متقاضی ہے۔ ہمارے ملک میں حق گوئی کے شائقین تو بہت ہیں، حق سننے کے شائق اور اس کے لئے آمادہ لوگ خال خال ہی ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خیالات اور جذبات پر قابو رکھنا اور اپنے عزائم کو پوشیدہ رکھنا اس سے بھی زیادہ ہمت اور پختہ ذہنی کا متقاضی ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ ارشاد لوگ بھول جاتے ہیں:

استعینوا علی حوائجکم من کتمان

اپنے معاملات میں پردہ پوشی کے ذریعے مدد طلب کرو۔

کوئی مغربی آدمی اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار نہیں کرتا۔ کبھی بش نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ پچاس سال کے لئے امریکہ کے عزائم کیا ہیں؟ کبھی جرمنوں نے نہیں کہا کہ آئندہ تیس سال کے لئے ان کے عزائم کیا ہیں؟ جب کہ ہمارے ہاں جو بھی پرچم قیادت لے کر اٹھتا ہے وہ پتہ نہیں کیا کیا کرنے کے عزائم کے اظہار سے بات کا آغاز کرتا ہے، اور یہ اعلان کرکے کہ فلاں جگہ جھنڈا لہرا دیں گے، فلاں جگہ جھنڈا لہرا دیں گے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ واقعی جھنڈا لہرایا جاچکا۔

۱۹۹۰ء میں مجھے ازبکستان جانے کا موقع ملا، ہمارے وفد میں پاکستان کی دو انتہائی نام ور اور محترم شخصیات شامل تھیں، ہمیں ازبکستان کے صدر سے ملنے کے لئے جانا تھا، جاتے ہوئے کچھ ازبک نوجوان ہمیں ملے، انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے صدر سے بات کریں کہ وہ ہمیں اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر اور مدینہ یونیورسٹی وغیرہ میں داخلے اور وہاں جا کر حصول تعلیم کی اجازت دے دیں۔ میں نے وفد کے سربراہ سے جو پاکستان کی صف اول کی قابل احترام شخصیات میں سے تھے اس کا ذکر کیا کہ چند طلبہ یہ درخواست کر رہے ہیں، انھوں نے صدر ازبکستان سے یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھا، میں نے اصرار کیا، انہوں نے پھر بھی اتفاق نہیں کیا۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے ایسا کرتے ہیں جب اصل ملاقات اور گفت گو ختم ہو جائے گی تو میں اس بات کو چھیڑوں گا، اگر میزبان صدر کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ہوئے تو آپ ایسا تاثر دیجئے گا کہ وفد کے ایک

Marfat.com

نوجوان اور نا تجربہ کار و پر جوش رکن نے ایسے ہی جذبات میں یہ بات کہہ دی ہے، اور یہ آپ کی رائے اور کوئی سنجیدہ تجویز نہیں ہے، اور اگر آپ نے محسوس کیا کہ صدر کے چہرے کا تاثر فیورایبل ہے تو آپ اس بات کو آگے بڑھا دیجئے گا۔ انہوں نے اس سے اتفاق کر لیا اور میری یہ گزارش مان لی۔ جب گفتگو ختم ہوئی تو میں نے صدر ازبکستان سے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے طلبہ ہمارے ہاں تعلیم کے لئے آئیں، پاکستان میں، دوسرے ممالک میں۔ اس سے آپ کے تعلقات بڑھیں گے۔ اب آپ سویت یونین سے آزاد ہو رہے ہیں، تو آپ کا فطری جھکاؤ جنوب کی طرف ہے ہمارے کلچر روٹس آپ کے ہاں ہیں، انہیں دوبارہ زندہ اور تازہ ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں جتنی مذہبی تعلیمی روایت ہے وہ آپ کے ہاں سے آئی ہے، بڑی بڑی مذہبی شخصیتیں آپ کے ہاں سے آئیں، تصوف، فقہ، عقیدہ، تفسیر وغیرہ۔ یہ تمہید میں نے باندھی اور آخر میں کہا کہ آپ ازبک نوجوانوں کو ہمارے تعلیمی اداروں میں آنے کی اجازت دیں۔ صدر صاحب مسکرائے اور انہوں نے کسی سے اپنی زبان میں کچھ کہا، اور اس نے ایک موٹی سی فائل لا کر صدر صاحب کے سامنے میز پر رکھ دی، صدر صاحب نے وہ فائل میری طرف لڑھکا دی۔ میں نے فائل کو کھولا تو اس میں اخبارات کے تراشے تھے، اور ہمارے پاکستان کے بہت سے مذہبی، دینی سیاسی قائدین کے بیانات تھے کہ ہم فلاں جگہ جھنڈا لہرا دیں گے، اور سمرقند و بخارا کو آزاد کرا دیں گے، اور روس میں ماسکو کے مشہور چوک ریڈ اسکوائر میں جھنڈا لہرا دیں گے۔ جب میں اس فائل کی سرسری ورق گردانی کر چکا تو صدر ازبکستان کہنے لگے کہ تم یہ سب کرنے کے لئے طلبہ کو لے جانا چاہتے ہو؟ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے سوال پر نروس اور لاجواب سا ہو گیا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا، ہمارے وفد کے سربراہ نے اس کا نہایت مناسب اور معقول جواب دیا۔ جس سے صدر ازبکستان خاصے متاثر ہوئے۔ لیکن اس واقعے کی وجہ سے اس وقت سے یہ بات میرے ذہن میں تازہ ہے کہ ہمارے بہت سے حضرات اخلاص کے ساتھ، دینی جذبے اور حمیت کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر نعرہ لگا دیا جائے تو اس سے خود بہ خود گویا ایک خود کار عمل کے ذریعے اصلاح، تبلیغ

Marfat.com

اور دعوت کے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، اور نعرہ خود بہ خود ایک عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر بقیہ کام وہ خود کر لیتا ہے، اور نعرہ لگا دینے کے بعد گھر جا کر سو جانا چاہئے۔ شاید ہم میں سے بہت سے حضرات کے نزدیک تقریر کر لینے پر اکتفا تمام امراض کا مداوا اور تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ ہماری طرف سے سادگی بل کہ بے وقوفی کا یہ رویہ اور ان کی طرف سے جو تیاری ہے اس کی ایک دو مثالیں میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی ہیں۔

اگر دنیائے اسلام میں یہ تبدیل نہ آسکے۔ فرض کیجئے مسلم ممالک میں جغرافیائی تبدیلی نہ آسکے، فرض کیجئے دینی تعلیم میں تبدیلی نہ آسکے تو پھر دنیائے مغرب کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے لئے تیسری حکمت عملی بھی تیار کی جا چکی ہے، اور اس پر عمل درآمد کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ یہ حکمت عملی گلوبلائزیشن کے نام پر آرہی ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگ سادہ لوحی میں یہ سمجھتے ہیں کہ گلوبلائزیشن ایک معاشی خوش حالی کا ایک پیغام ہے، میں نے اپنے ذمے دار لوگوں کو بات کرتے ہوئے سنا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ گلوبلائزیشن ہوگا تو پتہ نہیں کیا کیا نعمتیں ابلنے لگیں گی۔ دودھ شہد کی نہریں بہہ جائیں گی۔ جب تک ہم ایک بات ذہن میں نہیں رکھیں گے کہ

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۱)

یہود و نصاریٰ ہرگز ہرگز راضی نہیں ہوں گے، جب تک تم ان کی ملت کا اتباع نہیں کرو گے۔

قرآن پاک کا اعلان ہے۔ اور صیغۂ تاکید میں ہے، یہاں محض دین کا اتباع نہیں، ملت کا ذکر ہے، ملت اس دین کو کہتے ہیں جس میں کلچر بھی شامل ہے، شعائر بھی شامل ہیں اور جس میں سویلائزیشن بھی شامل ہے۔ جب تک تم سو فیصد ان کے رنگ میں نہیں رنگ جاؤ گے وہ تم سے راضی نہیں ہوں گے۔

یہ بات جب تک ہماری پالیسی کا بنیادی حصہ نہیں ہوگی۔ اس وقت تک ہماری

۱۔ البقرہ: ۱۲۰

Marfat.com

کوئی پالیسی کام یاب نہیں ہوگی، ہمارے پالیسی ساز اس چیز سے اتفاق نہیں کرتے، یا اس پر ایمان نہیں رکھتے یا وہ کم زور ایمان رکھتے ہیں، یا ان کے علم میں یہ بات نہیں ہے، جو وجہ بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مغرب سے آزاد اور باوقار سطح پر بامعنی تعلقات کے لئے یہ فہم بنیادی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت نہ یہ فہم پالیسیوں کی اساس ہے، اور نہ پالیسی ساز اس فہم سے اتفاق رکھتے ہیں۔ دوسری طرف جو لوگ اس حقیقت اور اس کے ہزارہا تاریخی شواہد کا علم رکھتے ہیں وہ پالیسی بنانے میں شریک نہیں۔

ہمارے ہاں تمام پالیسیاں اس مفروضے پر بنتی ہیں کہ اہل مغرب جو کچھ بین الاقوامی محفلوں میں کہہ رہے ہیں وہی ان کی اصل نیت بھی ہے، حال آں کہ کسی بھی بڑی طاقت کے اعلان شدہ عزائم اور ہوتے ہیں، اور ظاہری اعلانات ان کے حقیقی عزائم سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اعلان شدہ عزائم ہمیشہ اور ہوتے ہیں، حقیقی عزائم ہمیشہ اور ہوتے ہیں۔ ہمارے مسلم ممالک کے بہت سے ممالک کے قائدین ان کے اعلان شدہ عزائم کو ہی ان کے حقیقی مقاصد تصور کر کے ان کے مطابق اپنی پالیسیاں بناتے ہیں، اور فوراً ہی اندھی گلی میں جا کر پھنس جاتے ہیں، یا کھائی میں گر جاتے ہیں۔ یوں ایک قائد کی ناکامی کے بعد دوسرا قائد آتا ہے اور اپنے پیش رو پر تنقید کر کے دعوی کرتا ہے کہ اب وہی اصل راہ نمائی کرے گا۔ لیکن وہ ایک اندھیری اور بند گلی سے نکل کر دوسری اندھیری اور بند گلی میں جا گھستا ہے، اس لئے کہ قرآن پاک کا بتایا ہوا یہ اصل الاصول اس کی پالیسی کی بنیاد نہیں ہوتا۔ جب تک یہ خوش فہمی بل کہ بدفہمی باقی رہے گی، اس وقت تک ہر چیز کے بارے میں خوش گمانیاں پیدا ہوتی رہیں گی اور غلط فہمیاں جنم لیتی رہیں گی۔ اور ان کی بنیاد پر بننے والی پالیسیاں ناکام ہوتی رہیں گی۔

گلوبلائزیشن کے معنی یہ ہیں کہ دنیائے انسانیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے، اور دنیائے انسانیت کے تین طبقے بنائے جائیں۔

ایک طبقہ وہ ہو جو اے ون یعنی سب سے اعلی درجے کا انسان ہو، جو یورپ و امریکہ کے لوگ ہیں، اور اب کسی حد تک جاپانیوں نے بھی اپنے آپ کو اس طبقے کے اندر

Marfat.com

شامل کرلیا ہے۔ وہ انہیں شامل رہنے دیتے ہیں یا نہیں، یہ سوال بہر حال اپنی جگہ موجود ہے۔ میرا نہیں خیال کہ جاپان ان میں شامل رہ سکے گا، آئندہ تیس چالیس سال میں جاپان کی معیشت کا تیا پانچہ بھی شاید ہو جائے۔

بی کیٹگری یعنی درجہ دوم کے لوگ وہ ہیں جس میں وہ غیر مسلم طاقتیں شامل ہیں جیسے جاپان یا شائد آئندہ چل کر چین یا سنگاپور یا اس طرح کے اور ممالک جنہوں نے مغربی اقدار اور مغرب کی سیکولر معاشیات کو اپنا لیا ہے اور وہاں کی لامذہبی جمہوریت کی بنیاد پر اپنا سیاسی اور اجتماعی نظام چلا رہے ہیں۔

اور سی کیٹگری یا درجہ سوم میں وہ ممالک آئیں گے جو سب سے کم درجے پر فائز ہوں گے۔ جس میں دنیائے اسلام بھی شامل ہے، اور باقی ماندہ دوسرے مشرقی ممالک بھی۔ سی کیٹگری کے ممالک کا کام یہ ہوگا کہ اے کیٹگری کے ممالک کے لئے سستے مزدور فراہم کریں، رامٹیریل یا خام مال فراہم کریں اور اپنے خرچ پر انفرااسٹرکچر (Infrastructure) فراہم کرکے اسے برقرار رکھیں۔ تاکہ سستا لیبر اور سستا خام مال اور رامٹیریل اے کیٹگری کے ممالک کو ملتا رہے۔ ہمارا کام یہ ہوگا کہ ان کے فائدے کے لئے۔ خود کفیل نہ ہوں، ہم انڈسٹری میں ترقی نہ کریں، ہم اپنا انفرااسٹرکچر اپنے خرچ پر تیار کریں، ان کے فائدے کے لئے، ہم صرف رامیٹریل تیار کریں، جس کو وہ ویلیو ایڈ کرکے بیس گنا داموں میں الٹا ہمارے ہی ہاتھ فروخت کردیں۔ یہ دو کام ہمارے ذمے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس نئے نظام کے تحت ہمیں کوئی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

جو بی کیٹگری کے علاقے ہوں گے، ان کا کام یہ ہوگا کہ وہ درمیانے درجے کی چھوٹی انڈسٹری یا درمیانے درجے کی تجارت پر اکتفا کریں۔ یہ تجارتی دفتری کام ان درمیانے ممالک کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ لیکن بڑے پیمانے کی ساری تجارت، بڑے پیمانے کی ساری صنعت اور انڈسٹری، یعنی سوفسٹی کیٹڈ انڈسٹری (Sophisticated Industry) ہے، سولڈ اسٹیٹ فزکس (Solid State Physics) سے متعلق جو چیزیں ہیں، اسپیس ٹیکنالوجی (Space Technalogy) ہے، یہ سب چیزیں اے کیٹگری کے

Marfat.com

ممالک کے ہاتھ میں رہیں گی، اور وہی دراصل پوری دنیا کے نظام کو چلائیں گے۔ اس کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں، اس پر میں نے پاکستان میں بہت سے لوگوں کو بغلیں بجاتے دیکھا ہے، یہ سب دیکھ کر دکھ ہوتا ہے، تکلیف ہوتی ہے، کبھی کبھی شدت احساس اور افسوس سے آنسو بھی نکل آتے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے ایجنڈے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سرمائے اور مصنوعات (Product) کے لئے تمام حدود ختم کر دی جائیں۔ سرمائے کی منتقلی پر کوئی جغرافیائی حد نہ ہو۔ اور پروڈکٹ کی منتقلی کے کوئی قواعد وضوابط نہ ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ملک سے ہر قسم کا سرمایہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے ملک لے جاسکیں۔ سرمایہ اپنے ملک لے جانے کے لئے ان پر کوئی پابندی نہ ہو۔ یہ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس نئے مالی نظام کی وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ ان کا سرمایہ آپ کے ملک میں بافراط آنے لگے۔ آپ کے ملک میں ان کا سرمایہ کیوں آئے گا؟ وہ آپ کے ہاں اپنی دولت کیوں لائیں گے؟ وہ آپ کا سرمایہ اپنے ہاں لے کر جائیں گے۔ آپ کے سستے مزدوروں سے سستا خام مال نکلوائیں گے، اس کو اپنی ضرورت کے لئے تیار کریں گے، اور سرمائے سمیت اس کو باہر لے جائیں گے۔ ہمارے لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ سرمایہ آ رہا ہے، سرمایہ کار آ رہا ہے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دراصل بالآخر ہمارا سرمایہ لے جانے کے لئے آ رہا ہے۔ اصول یہ ہے کہ سرمایہ سرمائے کو کھینچتا ہے، سرمایہ ہمیشہ ایک جگہ نہیں رہتا۔ وہ سرمائے کو کھینچنے کے لئے آتا ہے، مقناطیس کا کوئی کام نہیں ہوتا، وہ لوہے کو کھینچنے کے لئے آتا ہے۔ ان انتظامات کے نتیجے میں لیبر کی منتقلی آسان نہیں ہوگی، لیبر پر پابندیاں جوں کی توں رہیں گی، ہمارے ہاں لوگ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستانی مزدور کو بڑا موقع ملے گا، کینیڈا میں جا کر نوکری کرنے کا راستہ کھلے گا۔ بالکل نہیں کھلے گا۔ یاد رکھئے گا امریکہ میں بھی آپ کے مزدور کو موقع نہیں ملے گا، کہیں نہیں ملے گا۔ آپ کے ہاں سے صرف ترقی یافتہ ہنرمند افراد جائیں گے۔ آپ اپنے خرچ پر انجینئر تیار کریں، آپ اپنے بچے پر لاکھوں روپے خرچ کریں، پچیس تیس لاکھ روپے آپ اپنے بچے پر خرچ کریں،

Marfat.com

اسے انجینئر بنائیں۔ کمپیوٹر کا ماہر بنائیں۔ ڈاکٹر بنائیں۔ پھر وہ کینیڈا میں جا کر نوکری کر لے، اور ان کی خدمت کرے۔ گویا ایک انجینئر آپ کے خرچ پر تیار ہو، اور انہیں مفت میں بنا بنایا انجینئر مل جائے۔ میرے جاننے والوں میں بہت سوں کے بچے بھی امریکا کینیڈا جا رہے ہیں، میں بار بار سمجھاتا ہوں وہ نہیں مانتے، بہت سے گئے، باقی تیار بیٹھے ہیں۔ میں جب یہ دیکھتا ہوں تو مجھے غنی کاشمیری کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

یہ ایک عبرت کا مقام ہے۔ ان حالات میں ہمیں اور آپ کو کیا کرنا چاہئے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ہماری اور آپ کی ذمے داریاں کیا ہیں؟ ہمارے ہاں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چوں کہ مغرب کے سامنے ہم نے اپنا موقف بیان نہیں کیا یا اسلام کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے اہل مغرب کو اسلام کے بارے میں باخبر نہیں کیا۔ اس لئے مغرب اسلام کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے۔ یہ بہ جائے خود بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر اہل مغرب کے سامنے کم از کم ڈیڑھ سو برس سے مسلسل بیان کیا جا رہا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں پہلی مرتبہ انگریزی زبان میں سرسید امیر علی نے اسلام کی تعلیمات پر کتاب لکھی تھی، جو اس وقت کے اعتبار سے بہترین کتاب تھی۔ سید امیر علی اعلیٰ ترین انگریزی تعلیم کے نمائندے تھے۔ انگلستان کی تاریخ میں پہلے مسلمان تھے جو پریوی کونسل کے جج بنے۔ ان کی تحریر کی ہوئی کتاب انگلستان ہی میں چھپی، علامہ اقبال نے کتاب لکھی۔ علامہ محمد اسد نے کتابیں لکھیں، اور درجنوں بل کہ سیکڑوں جید اہل علم نے مغرب کو خطاب کر کے اسلام کا موقف بیان کیا۔ کیا اس سے مغرب کے متعصب طبقے کے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی؟ کیا اسلام کے بارے میں ان کے متعصبانہ رویے میں کمی آئی، کیا ان کی پالیسیوں میں مثبت تبدیلی رونما ہوئی؟

لہٰذا یہ کہنا کہ ان کی اسلام دشمن اور مسلمان بے زار پالیسیاں اس لئے ہیں کہ وہ اسلام کو نہیں سمجھے یا مسلمانوں کے موقف کو نہیں سمجھے، اور اگر انہیں ہم سمجھا دیں گے اور ہم

Marfat.com

تھوڑے سے لبرل ہو جائیں گے تو ہمارے بارے میں مغرب کا رویہ بدل جائے گا، یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی بل کہ حماقت ہے۔ گزشتہ کم ازکم اسی نوے سال کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جو قومیں مسلمانوں میں لبرل ہوئیں ان کے ساتھ بھی مغرب کا رویہ دشمنی کا ہی رہا ہے۔ ترکوں کی تاریخ کوئی دور نہیں ہے۔ ان سے زیادہ لبرل، روشن خیال، ماڈرن اور مغربیت پسند تو دنیائے اسلام میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ تونس کے بورقیبہ سے زیادہ تو کوئی لبرل نہیں ہوسکتا۔ صومالیہ کے سیاد بری سے زیادہ آزاد خیال تو کوئی نہیں ہوسکتا۔ ان کے ساتھ اہل مغرب کا کیا رویہ رہا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

اسلام اور مغرب کے درمیان دیرپا، باعزت اور بامعنی تفاہم اور تعاون کے لیے ایک طویل اور مسلسل کاوش کی ضرورت ہے۔ یہ کام نہ اتنا آسان ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے اور نہ چند سالوں یا عشروں میں ہو جانا ممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مستقبل قریب میں کئی عشروں تک ایک جاں گسل جدوجہد اور طویل کشمکش ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر موجودہ تصادم کی فضا ختم ہونا ممکن نہیں۔ نہ دنیائے اسلام مغرب کو ختم کرسکتی ہے اور نہ کسی کو ختم کرنا اسلام کا تقاضا ہے، نہ ہی مغرب اسلام اور دنیائے اسلام کو مٹا سکتا ہے۔ اس لئے یہ فضول خیال اگر کسی کے دماغ میں کلبلا رہا ہے تو اس کو جلد از جلد نکال دینا ہی انسانیت کی فلاح وسلامتی کے لئے ضروری ہے۔

اہل مغرب کے ذہن اور مزاج کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیائے اسلام تمام ضروری اور بنیادی معاملات کے بارے میں ایک متفقہ، متوازن اور متناسق موقف اختیار کرے اور دنیائے اسلام میں تعلیم، ثقافت، ابلاغ، معیشت، مالیات، سیاسی نظام اور عسکری قوت واہداف کے بارے میں ایک داخلی تفاہم اور ہم آہنگی کو فروغ دے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے جو مسلم ممالک میں اندرونی وحدت اور فکری یک جہتی کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام اور مغرب کے تعلقات کے ضمن میں ایک اور اہم بل کہ سب سے اہم اور بنیادی بات جو پہلے طے کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کیا دنیائے اسلام اور مغرب کا رشتہ

Marfat.com

آقا اور غلام کا ہے، جیسا کہ دنیائے اسلام میں سیاسی قیادت کے منصب پر فائز کچھ لوگ سمجھتے ہیں (۱) یا اسلام اور مغرب کا رشتہ دو باہمی متحارب اور مسلسل برسر جنگ کیمپوں کا ہے، جیسا کہ خود مغرب کے انداز سے اور ہمارے بعض پرجوش مذہبی قائدین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یا اسلام اور مغرب کا رشتہ بھیک دینے اور بھیک لینے والے کا ہے۔ جیسا کہ دنیائے اسلام کے بعض حکمرانوں کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔

رشتوں کی یہ نوعیت بعض محدود لوگوں کے ذہن میں ہوتو ہو عامتہ الناس کے ذہن میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر ابھی تک اتنا مفلس نہیں ہوا کہ وہ خود کو از کار رفتہ مغربی طاقتوں کا اب تک وفادار سمجھتے ہوں۔ مسلمانوں کے ملی خمیر میں اسلام کا تہذیبی احیا اور امت مسلمہ کے قائدانہ کردار کے تصورات رچے بسے ہیں۔ ان کی نظر میں اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات دو تہذیبوں کے درمیان برابری کی سطح کے روابط سے عبارت ہیں۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے اور دونوں نے ماضی میں ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا ہے۔

دنیائے اسلام میں استعماری طاقتوں کے بہ راہ راست قبضے کے دوران وہ شکست خوردگی اور وہ خود سپردگی دیکھنے میں نہیں آئی جو ہمارے حکمراں اور بااثر طبقے میں آج بھی نمایاں ہے۔ اس طبقے میں یہ احساس تفاخر سرے سے ناپید ہے کہ وہ بھی مغرب کی برابری کرسکتا ہے۔ اور اس کے پاس بھی مغرب کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔ اس طبقے کے لئے مغرب سے برابری کی بنیاد پر معاملہ کرنا اور دنیائے اسلام کے عزت و افتخار کو برقرار رکھنا کم از کم موجودہ حالات میں تو ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ایک زبردست اور ہمہ گیر تعلیمی مہم اور تربیتی انقلاب کے ذریعے ملک میں قابل ذکر تعداد کے ذہنوں کو فکری اور تہذیبی آزادی سے ہم کنار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک وہ ماحول پیدا نہیں ہوسکتا جو مغرب سے برابری کی سطح پر مفاہمت کے لئے ضروری ہے۔ اس وقت تو حکم

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک سابق اسپیکر قومی اسمبلی نے ملکہ برطانیہ سے کھلے جلسے میں کہا تھا کہ ہم آج بھی آپ کے وفادار ہیں۔

Marfat.com

راں طبقے کا حال یہ ہے کہ کسی با اثر مغربی ملک کا کوئی ادنیٰ درجے کا عہدے دار بھی جب چاہتا ہے بڑے بڑے مسلم ممالک کی پالیساں تبدیل کرالیتا ہے۔ ایک مرتبہ امریکا فیصلہ کرلے تو بڑے بڑے مسلم ممالک کی فوجیں، عدالتیں، ہتھیار (حتیٰ کہ ایٹمی صلاحیت) سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خود ہمارے ملک میں ایک درمیانے درجے کے امریکی کارندے کی آمد سے ایوان ہائے حکومت لرز لرز جاتے ہیں، اور ہر چھوٹی بڑی سیاسی جماعت کا ہر عہدے دار اس کے حضور کورنش بجالانے کو تیار رہتا ہے۔ ان کارندوں کی آمد اور ان کے اثرات کو دیکھ کر شبلی کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے:

اس کی پیشانی نازک پر جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پر شکن

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہماری اور آپ کے ذمے داری کیا ہونی چاہئے؟ اس ضمن میں ہماری ذمے داری سب سے اولین یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اسلام کی عمیق فہم کو فروغ دیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مغرب کی عمیق فہم کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ گویا ایک ناقدانہ مغرب فہمی اور عمیق اسلام فہمی اپنے اندر پیدا کریں۔ اسلام فہمی کی اس دعوت سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں اسلام فہمی موجود نہیں یا ہمارے ہاں جو اہل علم ہیں وہ اسلام کو نہیں سمجھتے۔ بالکل سمجھتے ہیں، مجھ سے بہت زیادہ اسلام کو سمجھنے والے لوگ الحمدللہ ملک میں اور پوری دنیائے اسلام میں موجود ہیں۔ جس چیز کو میں اسلام فہمی کہہ رہا ہوں وہ اسلام کی وہ حکمت ہے جس کی مدد سے یہ طے کیا جاسکے کہ اسلام میں ترجیحات کیا ہیں؟ مغرب سے ڈیل کرنے کے لئے ہماری کیا ترجیحات ہونی چاہئیں۔ کیا حکمت عملی ہونی چاہئے؟ اس حکمت کا اندازہ کرنا اس عمیق اسلام فہمی کے بغیر ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس حکمت کو سمجھنے کے لئے برصغیر کے اہل علم اور برصغیر کے دانش وروں نے جتنا کام کیا ہے، ماضی قریب میں علامہ اقبال، اور ذرا پہلے کے حضرات میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور کئی دوسرے حضرات نے جس بصیرت سے یہ کام کیا ہے اس بصیرت سے یہ کام دنیائے اسلام میں اور کہیں نہیں ہوا۔ جتنی

Marfat.com

گہرائی اور تعمق کے ساتھ برصغیر کے اہل علم نے اس مسئلے پر سوچا ہے، اتنی گہرائی اور تعمق کے ساتھ دنیائے اسلام کے اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے نہیں سوچا۔ ہمارے پاس یہ پورا فکری ذخیرہ موجود ہے۔

یہاں اسلام فہمی پر زور دینے کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں اسلام کی تعلیم وتدریس کا نظام اور نصاب ایسا ہے کہ اس سے فقہ کی جزئیات، کلامی مسائل اور بعض متفرق تاریخی واقعات سے تو واقفیت کسی نہ کسی حد تک پیدا ہو جاتی ہے لیکن کلیات دین اساسات اسلام اور اصول شریعت سے عموماً لوگ ناواقف رہتے ہیں۔ بہت سے علمائے کرام فقہی جزئیات کے تو خوب حافظ ہوتے ہیں۔ جو ایک اچھی اور قابل قدر بات ہے۔ لیکن وہ دین کے کلیات و اساسات اور شریعت کی حکمت سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ اسلام کے عمومی اہداف کیا ہیں؟ دین کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ دین کی اصل حکمت اور مصلحت کیا ہے؟ یہ مسائل نہ مدرسوں میں کہیں پڑھائے جاتے ہیں، نہ عصری اداروں میں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے مقاصد اور ان کو حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل میں فرق عموماً سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت سے لوگ وسائل کو مقاصد قرار دے دیتے ہیں۔ بعض بڑے مدارس میں فقہی جزئیات کی تخریج کی ذرا سی مشق کرا دینے کا نام تخصص فی الفقہ رکھ دیا گیا ہے۔

اگر اسلامی علوم کے اعلیٰ تعلیم کے نصابات میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغۃ، علامہ عز الدین سلمی کی قواعد الاحکام فی مصالح الانام، امام شاطبی کی الموافقات وغیرہ کا مطالعہ شامل کر دیا جائے تو حکمت تشریع کی نئی نئی جہتیں سامنے آسکتی ہیں اور مقاصد و وسائل میں فرق واضح ہوسکتا ہے۔ مزید برآں تاریخ اسلام کے عمیق تر مطالعے سے ہی یہ واضح ہوسکتا ہے کہ ماضی کے اصحاب علم اور اہل بصیرت نے اسلام کے مقاصد واہداف کو پورا کرنے کے لیے کن کن وسائل و اسالیب سے کام لیا۔ آج ماضی کے بہت سے وسائل کو مقاصد قرار دے دیا گیا ہے۔ خطرہ ہے کہیں آج کے وسائل کو مستقبل میں مقاصد قرار نہ دے دیا جائے۔

Marfat.com

ان حالات میں ایک ایسے اعلیٰ تربیتی، تحقیقی اور تعلیمی مرکز (بل کہ مراکز) کی ضرورت ہے جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور ذی استعداد نوجوان علما اور ماہرین کو مطلوبہ مہارتیں فراہم کی جائیں اور اسلام فہمی کے اس تقاضے کو پورا کیا جائے۔ جس کے بغیر مستقبل کی بامعنی نقشہ کشی بہت مشکل ہے۔

مغرب کے سامنے اسلام کا موقف پیش کرنے اور مغرب سے معاملہ کرنے کے لئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں تین الگ الگ طبقات کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ایک چھوٹا طبقہ وہ ہے جو اپنے مفادات رکھتا ہے۔ یہ طبقہ دنیائے اسلام کے خلاف شدید تعصب کا شکار ہے۔ اس میں یہودی بھی شامل ہیں، اور متعصب مسیحی بھی شامل ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں آیا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۱)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

اس طبقے کو آپ کبھی بھی قائل نہیں کر سکتے۔ آپ قرآن پاک میں کتنی ہی تاویلیں کرلیں، شریعت کے احکام میں کتنا ہی کتر بیونت کرلیں، بل کہ نعوذ باللہ مرتد بھی ہو جائیں تو بھی یہ طبقہ آپ کا دشمن ہی رہے گا۔ تجربہ شاہد ہے کہ جو مرتد ہو گئے ان کا بھی مغرب دشمن ہی ہے۔ اس لئے اس طبقے کو مطمئن کرنے کی بات تو بھول جائیں۔

دوسرا بہت بڑا طبقہ وہ ہے جو پہلے طبقے کے پروپگنڈے کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہے، تعصب اس طبقے میں بھی ہے لیکن وہ تعصب بیشتر غلط فہمیوں کی وجہ سے ہے، ان غلط فہمیوں کو دور کر کے ان سے تعصب کو کم کیا جا سکتا ہے، ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی ایک چھوٹا طبقہ ہے، لیکن پہلے کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔

تیسرا طبقہ بل کہ ایک غالب اکثریت وہاں کے عامۃ الناس کی وہ ہے جنہیں

۱۔ البقرہ: ۷

Marfat.com

اسلام کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ جو اسلام کی اصل تعلیم اور دعوت کو نہیں جانتے۔ ان کے سامنے جب بھی اسلام کی بات کی گئی، وہ بے اثر نہیں رہی۔ میرا پچھلے تیس سال کا مشاہدہ اور کسی حد تک ذاتی تجربہ ہے، یورپ کے تقریباً ہر علاقے اور بڑے ملک کا، امریکہ کے مختلف علاقوں، کینیڈا اور آسٹریلیا کا کہ خالی الذہن عام آدمی کے سامنے جب اسلام کی بات معقول اور موثر انداز میں رکھی گئی تو اس پر اسلام کی بات کا مثبت اثر ہوا اور وہ متاثر ہوا۔ میں ذاتی طور پر سیکڑوں نہیں تو درجنوں ایسے واقعات کا شاہد ہوں۔ یہی طبقہ ہے جس سے لوگ روزانہ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ پورے یورپ میں اور امریکہ کینیڈا میں اسلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے۔ یہ اسی طبقے کے لوگوں میں ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر معروف دوالیبی دنیائے اسلام کے صفِ اول کے دانش ور تھے۔ بیسویں صدی کے نصف دوم میں دنیائے اسلام کے نام ور ترین مفکرین اور فقہا میں سے تھے۔ سیاسی بصیرت اور فہم و دانش میں بھی دنیائے عرب کے جو اعلیٰ ترین چند لوگ تھے، ان میں سے ایک تھے۔ شام کے وزیر اعظم رہے، اسپیکر بھی رہے، مجھ پر بہت مہربان تھے، بہت شفیق تھے، میں ان کا نیاز مند تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے خود بتایا کہ وہ رابطہ عالم اسلامی کا وفد لے کر فرانس کے صدر ژسکار دیستاں سے ملنے گئے۔ اس زمانے میں فرانس کے مسلمانوں کو کچھ مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ان مشکلات پر بات کرنے کے لئے ڈاکٹر معروف دوالیبی یہ وفد لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر معروف دوالیبی خود بھی سوربون کے پی ایچ ڈی تھے، فرنچ نظام اور کلچر سے اس طرح واقف تھے جیسے کوئی فرانسیسی واقف ہوسکتا ہے۔ یہ ۱۹۷۵،۷۴ء کی بات ہے اور مجھے یہ بات ڈاکٹر دوالیبی نے ۱۹۷۸ء میں بتائی تھی۔ جب وہ بات کرنے لگے تو فرانسیسی صدر نے مسکرا کر کہا کہ ڈاکٹر دوالیبی آج آپ فرانس کے مسلمانوں کی طرف سے مجھ سے بات کرنے آئے ہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں میرے جانشین فرانس کے عیسائیوں کی طرف سے بات کرنے کے لئے آپ کے جانشینوں سے ملنے آئیں۔ یعنی اسلام اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ اس نے اس

Marfat.com

امکان کا اظہار کیا کہ اسلام بہت جلد فرانس کی اکثریت کا مذہب ہو جائے۔ اور اس کے خیال میں اکیسویں صدی کا کوئی سال ایسا آسکتا ہے کہ میرے جانشین آپ کے جانشینوں کے پاس عیسائیوں کے مفادات کی بات کرنے آئیں۔

یہ فرانس کا حال ہے جو مغربی دنیا میں سب سے متعصب ملک ہے۔ مغربی دنیا میں اسلام کے متعلق اس سے زیادہ متعصب ملک کم ہوں گے۔ اگر فرانسیسی کا تعصب آپ دیکھیں تو انگریز کا تعصب آپ بھول جائیں۔ قبول اسلام کی یہ صورت حال فرانس جیسے ملک میں ہے، اور میں نے فرانس میں ایسے مخلص اور جید مسلمان دیکھے ہیں کہ خیال ہوا کہ شاید صحابہ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

میں نے ایک فرانسیسی وکیل کو ۱۹۸۶ء میں الجزائر میں دیکھا اور مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ صحابۂ کرام اس طرح کے ہوں گے، ان کا ایمان شاید ایسا ہی ہوگا جیسا ان فرانسیسی وکیل صاحب کا تھا۔ میں نے ان کی امامت میں نماز مغرب ادا کی تو نماز کی صحیح لذت محسوس ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں لکھا ہے کہ مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید کو جب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حکم دیا کہ سید صاحب سے بیعت کر لیں تو ان دونوں حضرات کو ذرا تامل ہوا۔ سید صاحب ان دونوں کے مقابلے میں بہت نوجوان تھے۔ حلیہ بھی پہلوانی تھا۔ ورزش کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں صف اول کے علما تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز نے ان کو سرآمد علمائے ہند کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کو حیرت ہوئی کہ ہم جیسا آدمی جو اس مقام پر فائز ہے، وہ ایک نوجوان سپاہی سے کیوں بیعت کرلے۔ لیکن شاہ صاحب کا ارشاد تھا اس لئے کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم آپ کے مرید ہو جائیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی کوئی کرامت دیکھیں۔ آپ کوئی کرامت دکھائیں تو پھر ہم بیعت کرلیں گے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ کیا کرامت دیکھنا چاہتے ہیں؟ اور دونوں حضرات نے کہا کہ ہمیں ایک ایسی نماز پڑھوا دیجئے جیسی صحابہ کرام پڑھتے تھے۔ سید صاحب خاموش ہو گئے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ شاید سید

Marfat.com

صاحب لاجواب ہو گئے، اور ہماری بات کا کوئی جواب نہیں دے پائے۔

اس رات یا اگلی رات یہ دونوں حضرات سوئے ہوئے تھے سید صاحب تشریف لائے اور بلند آواز سے کہا کہ مولوی صاحب اٹھو۔ شاہ اسماعیل شہید اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ اس آواز سے جسم پر سخت لرزہ طاری ہو گیا، سید صاحب نے فرمایا کہ اٹھو اور اللہ کے لئے وضو کرو۔ شاہ اسماعیل شہید بیان کرتے ہیں کہ بدن پر لرزہ طاری تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وضو کر کے جب آئے تو سید صاحب نے اسی لہجے میں فرمایا کہ مولوی صاحب اللہ کے لئے دو رکعت نماز پڑھو۔ کہنے لگے کہ جب نماز کے لئے نیت باندھی تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور جب دو رکعت پوری کی تو معلوم ہوا کہ فلاں سنت بھول گئے، پھر دوبارہ پڑھی اب یاد آیا کہ فلاں ادب کا خیال نہیں رہا۔ اس کیفیت میں روتے جاتے تھے اور نماز دہراتے تھے، ابھی نمازیں دہرا ہی رہے تھے کہ فجر کی اذان ہو گئی، اس پر ایک دم سے دھاڑیں لگ گئیں کہ پوری رات گزر گئی اور دو رکعت اس طرح سے نہیں پڑھ سکے جس طرح صحابہ پڑھتے تھے۔ ابھی رو رہے تھے تو یاد آیا کہ ایک صحابی کے بارے میں روایت پڑھی تھی کہ وہ تمام رات نوافل ادا کرتے تھے، اور فجر کے وقت افسوس اور غم کے عالم میں رویا کرتے تھے کہ پوری رات میں ایک رکعت بھی کما حقہ ادا نہیں کر سکے۔ اس وقت احساس ہوا کہ صحابہ کرام کی نماز ایسی ہوتی تھی۔ یہ واقعہ میں نے پڑھا ہوا تھا۔ ان وکیل صاحب کے پیچھے میں نے مغرب کی نماز ادا کی تو مجھے خیال ہوا کہ صحابہ کی نماز ایسی ہوتی ہو گی، صحابہ ایسے ہی نماز پڑھتے ہوں گے جیسے ان وکیل صاحب نے پڑھی۔

بہ ہر حال میں بات جو عرض کرنا چاہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ اس سب کے باوجود، دنیائے اسلام کی کمزوریوں کے باوجود اسلام تیزی کے ساتھ مغرب میں پھیل رہا ہے، اور ایک بہت اہم اور عجیب بات یہ ہے کہ اسلام لانے والوں میں سب سے بڑی تعداد اور تناسب خواتین کا ہے، اور یہ پروپیگنڈا جس سے ہمارے لوگ بڑی آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں کہ فقہ اسلام میں خواتین کے حقوق کی بڑی خلاف ورزی ہے، عورت کی گواہی آدھی ہے، میراث آدھی ہے، پردہ ہے، لہٰذا یہ چیز نعوذ باللہ اسلام کے دامن پر دھبہ ہے،

Marfat.com

داغ ہے۔ یہ پروپیگنڈا مغرب کی ان خواتین کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔ اور پروپیگنڈے کے اس طوفان کے باوجود اسلام لانے والوں میں امریکہ میں، برطانیہ میں، فرانس میں، پورے یورپ میں بڑی تعداد خواتین کی ہی ہے، حتیٰ کہ روس میں بھی یہی کیفیت ہے۔

یہ غالب ترین اکثریت ہے جس تک اسلام کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اگر اس طبقے میں اسلام کا پیغام آسانی سے پہنچ جائے، اور اس طبقے میں ایک قابل ذکر تعداد اسلام کے لئے کام کرنے والی اور اس کی ہم درد پیدا ہو جائے تو مغرب کی اسلام دشمن پالیسیوں پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے، ان متعصّبانہ پالیسیوں کو روکا جا سکتا ہے، تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہمارے اور آپ کے اور سب اہل علم کے کرنے کا ہے۔ رائے عامہ اور پبلک اوپینین اس زمانے کی سب سے بڑی قوت ہے، پبلک اوپینین سے بڑی قوت آج دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ سویت یونین کے پاس لوگ کہتے ہیں کہ ۲۵ ہزار ایٹم بم تھے۔ لیکن یہ ۲۵ ہزار ایٹم بم پبلک اوپینین کا سامنا نہیں کر سکے، اور وہ ساری قوت ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئی۔ اسی طرح امریکہ تمام تر قوت کے باوجود عراق میں کھڑا نہیں ہو پا رہا۔ نکلنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے، پبلک اوپینین کی وجہ سے۔ مسلم مفاد، مسلم پاور اور مسلم وحدت کی پبلک اوپینین دنیائے اسلام میں ہونی چاہئے، صحیح اسلام کی فہم ہونی چاہئے۔ بصیرت و حکمت پر مبنی ہونی چاہئے۔ اور مغرب کی صحیح فہم دنیائے اسلام میں ہونی چاہئے۔

آج مغرب کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر بہت گہرے ہیں۔ تعلیم و ثقافت اور ابلاغ کے شعبوں کا تو گویا اصل کنٹرول ہی اہل مغرب اور ان کے تلامذہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر معیشت، تجارت، صنعت اور زراعت کے دائرے تھوڑے بہت اس لئے آزاد تھے (کم از کم داخلی حد تک) کہ ان کی آزادی سے ایک طبقے کا ذاتی اقتصادی مفاد وابستہ تھا۔ لیکن اب گلوبلائزیشن، ڈبلیو ٹی او وغیرہ کے نتیجے میں یہ محدود آزادی بھی ختم یا کم از کم بہت محدود ہو جائے گی۔ اب ان چاروں شعبوں معیشت، تجارت، صنعت و زراعت کا کردار عالمی مالی نظام اور عالمی معیشت کے تابع فرمان خادم

Marfat.com

سے زیادہ نہ ہوگا۔

رہے سیاسیات اور عسکریات کے شعبے تو ان میں ماضی قریب کے واقعات نے آزادی اور خودمختاری کا جو تھوڑا بہت بھرم تھا وہ بھی کھول دیا ہے۔ عسکری خودمختاری کے مدعی ممالک کی قیادت دوسرے بہ ظاہر کم زور مسلم ممالک کے مقابلے میں کہیں بودی ثابت ہوئی۔ فالی اللہ المشتکی

ان حالات میں فہم اسلام اور فہم مغرب کے ساتھ ساتھ اس شدید ذہنی غلامی اور احساس شکست خوردگی سے آزادی حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۹۴۰ء۔ ۱۹۴۷ء کی تحریک پاکستان کی طرح ایک نئی تحریک آزادی کی ضرورت ہے جو ہمارے با اثر اور حکم ران طبقات کو ذہنی طور پر آزاد کرائے اور مغرب کی تہذیبی غلامی سے نجات دلائے۔

تہذیبی غلامی سے نجات کے معنی مغرب کے مفید تجربات اور فنی ایجادات سے صرف نظر کے نہیں ہیں۔ مفید علمی تجربات اور سائنسی انکشافات کسی کی میراث نہیں ہوتے۔ آخر خود مغرب نے مسلمانوں کے علمی ورثے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور مسلمانوں ہی کے تجربات پر اپنے بہت سے علمی معاملات کی بنیاد رکھی ہے۔ صدر اسلام کے مسلمانوں نے ہند و یونان، ترک و ایران اور روم و شام کے تجربات سے (اپنی شرائط پر) پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان کو اپنے فکری نظام میں سمو کر اپنے تہذیبی پیراڈائم کا حصہ بنایا۔ یہی کام آج ہمیں مغربی تجربات کے سلسلے میں کرنا چاہیے۔

آج جو ''الزامات'' تواتر اور کثرت سے دنیائے اسلام پر لگائے جا رہے ہیں، جن سے عالمی ذرائع ابلاغ بھرے ہوتے ہیں، جن کو ہمارا حکم راں طبقہ دل و جان سے حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لے آیا ہے، وہ دہشت گردی کی سرپرستی، پس ماندگی، تعصب، دوسروں سے نفرت اور جہالت کے الزامات ہیں۔ ان الزامات کو ہمارا با اثر طبقہ نہ صرف جوں کا توں قبول کر رہا ہے، بل کہ ان کو دور کرنے کے لئے بھی وہی نسخہ زبردستی آزمانے اور مسلمان اقوام سے منوانے پر مصر ہے جو طبیب مغرب نے تجویز کر دیا ہے۔ مغرب کا یہ نسخہ نہ صرف امراض میں اضافے کا سبب بن رہا ہے، بل کہ مزید نئے نئے امراض بھی پیدا

Marfat.com

کر رہا ہے۔ مغرب کا یہ نسخۂ علاج جن اصول موضوعہ پر مبنی ہے وہ مغرب کا سیکولر آئیڈیل، اہل مغرب کی فکری اور تہذیبی برتری کا تصور، مغربی طاقتوں کی معاشی اور عسکری بالادستی، گوری اقوام کا معلمانہ اور مربیانہ کردار (White Man's Burden) اور نئے عالمی نظام اور عالم گیریت یا گلوبلائزیشن کے تقاضے ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر جو علاج تجویز ہوتا ہے وہ منفی نتائج پیدا کرتا ہے اور امت مسلمہ کا اجتماعی ضمیر اور ملی خمیر اس کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

آج مغربی اہل علم وصحافت اسلام کی بہت سی قسمیں قرار دیتے ہیں، ماضی میں وہ کم وبیش ایک سو برس تک انڈین اسلام، ترکی اسلام، عرب اسلام اور ایرانی اسلام وغیرہ اصطلاحات استعمال کرتے رہے اور اپنے قارئین بالخصوص اپنے مشرقی عقیدت مندوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ ہر ملک اور ہر علاقے کا اسلام الگ الگ ہے۔ شاید مقصد یہ تھا کہ اسلام جو فرزندان توحید کے لئے ایک کلمۂ جامعہ رہا ہے وہ اب ایک کلمۂ جامعہ نہ رہے۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

شاید اسی مقصد کی خاطر آج سیاسی اسلام، تحریکی اسلام، سلفی اسلام، فقہی اسلام، بنیاد پرست اسلام، آزاد فکر اسلام، روشن خیال اسلام اور صوفی اسلام وغیرہ اصطلاحات زور شور سے استعمال کی جارہی ہیں۔ اول الذکر پانچ قسم کے اسلاموں کو خطرہ اور آخر الذکر تین اقسام کو قابل قبول ٹھہرایا جارہا ہے۔ یہ جو یکایک ہمارے حکمرانوں کو تصوف سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے یہ بے وجہ نہیں۔ یہ پیر مغرب کا سکھایا ہوا درس ہے جو مرید مشرق نے دہرانا شروع کر دیا ہے۔ آج جو لوگ دنیائے اسلام میں اچانک تصوف کے علم بردار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں ان کو اکابر صوفیا کی کتابیں تو بڑی بات ہے شاید نام بھی معلوم نہیں۔

اس تقسیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ آوازیں جو دنیائے اسلام کی فکری اور تہذیبی آزادی، اسلامی قوانین کے نفاذ اور بالادستی اور اسلام کی بنیاد پر ایک نئے تہذیبی اور فکری پیراڈائم کی تشکیل کے لئے بلند ہو رہی ہیں، وہ خواہ کتنی ہی کمزور ہوں، ان کو

Marfat.com

سیاسی اسلام، تحریکی اسلام یا سلفی اسلام کہہ کر بدنام کر دیا جائے اور دوسرے ناموں سے نسبتاً ''بے ضرر'' اسلام کو فروغ دیا جائے۔ لیکن یہ اہل مغرب کی خوش فہمی ہے کہ صوفی اسلام ان کے لئے بے ضرر ثابت ہوگا۔ جب تصوف کی بات ہوگی تو شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ایسے ہی دوسرے اکابر صوفیہ کی بھی بات ہوگی اور بات اسی اسلام پر آکر رکے گی جہاں جہاد اسلام کے قلعے کا سب سے اونچا برج ہے، اور جہاں فقہ و شریعت کے بغیر کوئی روحانی درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

یوں تو ایک طبقہ مغرب میں اسلام کے بارے میں ہمیشہ ہی سے فضول، بے بنیاد اور مضحکہ خیز باتیں پھیلاتا آیا ہے، لیکن ماضی میں اس طبقے کے اثرات بہت محدود بھی تھے اور بہت غیر عقلی بھی۔ اس لئے ان کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کے اثرات بہت محدود تھے۔ اب ذرائع ابلاغ کی وسعت اور تیز رفتاری نے ایسی باتوں کے اثرات کو بہت وسیع بھی کر دیا ہے اور ان کے نتائج و عواقب کو بہت زیادہ خطرناک بھی بنا دیا ہے۔

اسلام کے بارے میں بے بنیاد باتوں کا سلسلہ صلیبی جنگوں کے زمانے ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ استعماری دور میں بھی شروع شروع میں تو وہی بے بنیاد باتیں دہرائی جاتی رہیں۔ لیکن جب دنیائے اسلام کے علمی مراکز سے مغربی ممالک کے براہ راست روابط شروع ہوئے تو جہاں سنجیدہ اہل علم کا طبقہ سامنے آیا وہاں متعصبانہ اور بے بنیاد باتیں کرنے والوں نے بھی ذرا علمی انداز اپنا لیا۔ اس بہ ظاہر علمی انداز اور بہ ظاہر منطقی استدلال نے دنیائے اسلام کے اس طبقے پر بہت منفی اثر ڈالا جس کی تعداد اب دنیائے اسلام میں روز افزوں تھی، وہ طبقہ جو اپنے ورثے سے ناواقف اور مغرب کے طرز زندگی سے مرعوب اور مغربی تعلیم و ثقافت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان بہ ظاہر علمی کاوشوں کا ہدف قرآن مجید، ذات رسالت مآب علیہ السلام، حدیث نبوی، علوم سیرت، فقہ اسلامی، کلام، تاریخ، غرض اسلامی فکر و تہذیب کا ہر ہر پہلو بنا۔ ان میں سے ہر میدان میں مسلمانوں کے موقف کو (ان کے بیان کردہ دلائل و شواہد سے قطع نظر) مسترد کر کے نئے نئے مؤقف بیان کئے گئے اور بے بنیاد، کم زور، غیر علمی شواہد کی بنیاد پر ان کو منوانے کی

Marfat.com

کوشش کی گئی۔ ان کے زور بیان، طرز استدلال اور اسلوب تحقیق نے دنیائے اسلام کی ایک پوری نسل، بل کہ نسلوں کی نسلوں کو متاثر کیا اور اسلامی تہذیب کے بارے میں شدید قسم کی بداعتمادی، اسلامی ورثے کی توقیری اور مغربی افکار و اقدار کی پختگی کے تصورات ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیے۔

گزشتہ صدی کے وسط تک یہ اثرات بہت محدود تھے۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں سامنے آنے والا یہ مواد دنیائے اسلام کے ایک بہت چھوٹے سے طبقے تک محدود تھا۔ لیکن گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران مغربی ذرائع ابلاغ نے ان اثرات کو ہزار ہا گنا بڑھا دیا ہے۔ عالمی سطح پر مسلسل نشر ہونے والے ٹی وی پروگراموں میں چند منٹ بل کہ چند سیکنڈ میں دکھایا جانے والا ایک منظر وہ تمام منفی تاثرات پیدا کر دیتا ہے جو گزشتہ صدی میں پچاس سال کی کوشش سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں زور و شور سے اختیار کی جانے والی بڑی بڑی پالیساں خاص طور پر تعلیمی اور معاشی پالیسیاں وہ ہیں جن کا سبق اہل مغرب نے ہی سکھایا ہے۔ مثلاً یہ بات کہ ملک و ملت کی اربوں کی جائدادیں اونے پونے فروخت کر دی جائیں۔ ملک کے حساس مقامات پر پانی اور بجلی کے مراکز غیر ملکیوں کو فروخت کر دیے جائیں۔ ملک کی مواصلات کا نظام غیروں کے قبضۂ قدرت میں دے دیا جائے۔ یہ بات کسی اور جگہ طے ہوئی ہے جس کا سبق ہمارے ''قائدین'' کو پڑھا دیا گیا اور وہ پرائیوٹائزیشن کے نام سے اس کو نہ صرف دہرا رہے ہیں بل کہ اس قدر اخلاص اور تن دہی سے اس پر عمل کر رہے ہیں کہ اس کا ایک چوتھائی اخلاص اور ایک چوتھائی تن دہی بھی اللہ اور رسول کے احکام پر عمل کرنے میں دکھائی جائے تو دنیا اور آخرت کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔ جو کسر اس پرائیوٹائزیشن سے رہ جائے گی وہ یہ تجارتی معاہدے، تجارتی تنظیمیں، ڈبلیو ٹی او اور معیار بندیوں کے ادارے (آئی ایس او) وغیرہ پوری کر دیں گے۔ اس نو استعمار اور اس نئی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسے خوش نما پردوں اور خوب صورت نعروں سے سجایا گیا ہے کہ دیکھنے والے اس ظاہری حسن ہی پر ریجھ رہے ہیں، اصل حقیقت کے چہرے سے پردہ

Marfat.com

اٹھانے کی کسی کو فرصت نہیں۔ ظاہری حسن و جمال کا نشہ اترے تو بات آگے بڑھے۔ طب مغرب میں مزے بیٹھے اثر خواب آوری!

ان حالات میں مغرب کے ساتھ ایک مسلسل تہذیبی اور فکری مکالمے کی ضرورت ہے۔ یہ مکالمہ نہ غلامانہ ذہن رکھنے والے، کم فہم اور اسلامی روایات سے بے بہرہ دانش ور کر سکتے ہیں، نہ روایتی علمائے کرام اس میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ نہ اس میں دنیائے اسلام کے وہ پست حوصلہ اور شکست خوردہ حکم راں حصے لے سکتے ہیں جو اپنے ہر ہر فیصلے اور اقدام کے لئے بڑی بڑی مغربی طاقتوں کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے ہیں، جو اپنے کو ایک یا دوسری مغربی طاقت کے منصب دار اور Vassal (زیر سایہ رہنے والا آدمی یا ملک) سے زیادہ نہیں سمجھتے، اور حقیقت میں ہیں بھی نہیں۔

یہ مکالمہ دنیائے اسلام کی سطح پر آزادانہ انداز میں ہونا چاہئے۔ اس مکالمے کا مقصد وحدت مذاہب یا اضافیت مذاہب کا مغربی ایجنڈا نہیں، بل کہ اس کا مقصد دنیا کی دو تہائی سے زائد آبادی (مسلمان، مسیحی اور بدھ مت کے پیرو کاروں) کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ، مشترکہ اخلاقی اور روحانی اہداف کے حصول کی کوشش اور ایک دوسرے کے تہذیبی تجربات سے استفادہ ہونا چاہئے۔

۱۹۸۸ء۔۱۹۸۹ء میں افغانستان سے روسی افواج کے انخلا اور اس کے نتیجے میں روس کی شکست و ریخت اور بالآخر کمیونزم کے زوال کو اہل مغرب اس صدی میں اپنی سب سے بڑی کام یابی قرار دیتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ شکست صرف سویت یونین کی اور یہ زوال صرف کمیونزم کا نہیں تھا، بل کہ وہ اس کو ہر مغرب مخالف نظام کے زوال اور ہر غیر مغربی نظریئے کی شکست سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے میڈیا کی غیر معمولی طاقت سے کام لے کر بہت سے لوگوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ کمیونزم کا زوال دراصل مغربی لبرلزم کی فتح ہے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت درحقیقت مغربی افکار، لادینی جمہوریت، سیکولر نظریات، سرمایہ داری اور فری مارکیٹ اکانومی کی دائمی کام یابی کی مناد ہے۔ اب گویا امریکا واحد عالمی طاقت ہے۔ مغربی فکر ہی اب حقیقی اور دیرپا فکر ہے، مغربی

Marfat.com

تہذیب ہی واحد تہذیب ہے۔ ان کے صف اول کے اہل علم کی رائے میں اب تاریخ انسانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، ارتقا کا آخری مرحلہ طے ہو چکا ہے اور آخری مکمل انسان (بش اور اس کے مغربی اتباع کی صورت میں) وجود میں آچکا ہے۔ ان حالات میں بھی اگر دنیائے اسلام کے اہل فکر نے اپنی ذمے داری محسوس نہ کی اور فوری طور پر دنیائے اسلام کی فکری اور تہذیبی آزادی کے لئے کام نہ کیا تو طوفان سر سے گزر جائے گا اور جو تھوڑی بہت فرصت عمل آج باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ غرض یہ گھڑی محشر کی ہے اور دنیائے اسلام عرصۂ محشر میں ہے۔

باتیں تو کہنے کی بہت ہیں، بیچ بیچ میں جملہ معترضہ بھی کئی آ گئے۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ کچھ پوائنٹس میں نے لکھے تھے وہ کاغذ کھول کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اگر بات کچھ مفید ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق سے ہوئی، ہمارے بزرگ شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی برکت سے اور ڈاکٹر کشفی صاحب کے قرب کی وجہ سے ہوئی، اور اگر کوئی بات پیچیدہ یا کم زور رہی تو میری کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے رہی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

مکالمہ بین المذاہب

مقاصد، اہداف، اصول وضوابط

''عصر حاضر کے چیلنج اور ہماری ذمے داریاں'' کے زیر عنوان ایک
دو روزہ قومی سیمینار سے خطاب
زیر اہتمام انٹرنیشنل اسلامک سینٹر لاہور/ دار العلم والتحقیق کراچی
۹ دسمبر ۲۰۰۷ء

Marfat.com

مکالمہ بین المذاہب

مقاصد، اہداف، اصول وضوابط

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمد ونصلی علی رسوله الکریم، وعلیٰ آله واصحابه اجعمین

قابل احترام جناب سید فضل الرحمٰن شاہ صاحب

قابل احترام علمائے کرام

محترم جناب ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

برادران گرامی، مہمانانِ مکرم

مکالمہ بین المذاہب، بل کہ زیادہ صحیح الفاظ میں مکالمہ بین اتباع المذاہب ایک ایسا موضوع ہے جس پر گزشتہ ۴۵، ۵۰ سال کے دوران بہت کثرت اور تواتر سے گفت گو ہوئی ہے۔ عام طور پر اس بات پر اتفاق رائے محسوس ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مابین ایک سنجیدہ اور با مقصد مکالمے اور گفت گو کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مکالمے کی نوعیت کیا ہو؟ اس گفت گو کا انداز کیا ہو؟ اس کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟ اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہئے؟ اس کے آداب کیا ہونے چاہئیں؟ اس پر یا تو اتفاق رائے نہیں ہے یا اگر کچھ اتفاق رائے ہے بھی تو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے

Marfat.com

مابین نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی خاص مذہب کے ماننے والے دوسروں سے مکالمے اور گفت گو کے انداز، اسلوب اور مقاصد کے بارے میں اپنے اندر اتفاق رائے رکھتے ہوں، لیکن اگر اس مکالمے کا مقصد تمام دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مکالمہ ہے تو سب سے پہلے اس کے بنیادی قواعد، اس کے تصورات واہداف، مقاصد اور طریقہ کار کے بارے میں ایک عمومی اتفاق رائے کا حصول اولین مقصد ہونا چاہئے۔

مثال کے طور پر دنیا کے بڑے بڑے مذاہب تین ہیں، یا تعداد میں اگر اضافہ کریں تو بڑے مذاہب پانچ ہیں۔ وہ پانچ بڑے مذاہب جو دنیا کے معاملات میں، دنیا کی سیاست میں، دنیا کی اقتصادیات میں، دنیا کی معیشت وتجارت میں، خیالات وتصورات میں، تعلیم وثقافت میں، تہذیب وتمدن کے معاملات میں آج کل ایک موثر کردار ادا کر رہے ہیں، وہ ہیں اسلام، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندومت۔

عیسائیت کے ماننے والے تعداد میں سب سے زیادہ بتائے جاتے ہیں۔ مسلمان، بدھ مت، اور ہندوؤں کا درجہ تعداد میں عیسائیوں کے بعد آتا ہے۔ یہودی اگر چہ اپنی تعداد کے اعتبار سے بہت تھوڑے ہیں لیکن اثر ورسوخ کے اعتبار سے بڑے بڑے مذاہب کے ہم پلہ ہیں۔ اگر ان پانچ بڑے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ہی اتفاق رائے نہ ہو کہ مکالمہ کیا ہے؟ مکالمے کے مقاصد کیا ہیں؟ یا مکالمہ کیوں ہو؟ تو یہ ساری کوشش محض تضیع اوقات ہے۔ مقاصد پر اتفاق رائے جب تک نہ ہو تو ممکن ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے پیش نظر ایک مقصد ہو، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ذہن میں دوسرا مقصد ہو، اور جب یہ دونوں مکالمہ کریں تو کسی نتیجے تک اس لئے نہ پہنچ سکیں کہ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں۔

اسی طرح طریقۂ کار، اہداف، اور قواعد کے بارے میں بھی ایک عمومی اتفاق رائے درکار ہے۔ اس عمومی اتفاق رائے اور تصور پر یک ساں نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے مناسب اور بہتر طریقۂ کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختلف مذاہب کے ماننے والے آپس میں اپنا ذہن صاف کرلیں کہ ہمارے نقطۂ نظر سے مکالمہ کیا ہے؟ ہمارے نقطۂ نظر

Marfat.com

سے مکالمے کے اغراض و مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟ اور اس کے قواعد وضوابط کیا ہونے چاہئیں۔ مثال کے طور پر جب تک مسلمان اس پر متفق نہ ہوں اور ایک عمومی اتفاق رائے اس پر قائم نہ ہو کہ بطورِ مسلمان مکالمہ بین المذاہب کے بارے میں ہمارا تصور کیا ہے؟ اس مکالمے سے ہم کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اس کے قواعد وضوابط ہمارے تصورات کے مطابق کیا ہونے چاہئیں؟ اس وقت تک ظاہر ہے دوسروں سے ایسے اتفاق رائے کی توقع کرنا مشکل ہے۔

میری آج کی گفت گو کا یہی موضوع ہے کہ مسلمانوں کے تصور کے مطابق مکالمہ بین المذاہب کیا ہے؟ اور اگر یہ بات واضح نہیں ہے تو کیا ہونا چاہئے؟ اس کے مقاصد موجودہ حالات یعنی اکیسویں صدی کے سیاق وسباق میں کیا ہونے چاہئیں؟ ہماری تعلیم، تہذیب، ثقافت اور تاریخ کی روشنی میں اس کے قواعد وضوابط کیا ہونے چاہئیں؟

یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ مکالمے کا تصور واضح اور طے کئے بغیر مکالمے کے نام سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک بہت بڑی غلط فہمی جو شاید اصطلاح کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جس کو میں غلط فہمی سمجھتا ہوں، لیکن ممکن ہے دوسرے حضرات اس کو غلط فہمی نہ سمجھیں، وہ یہ ہے کہ مکالمہ بین المذاہب کی اصطلاح جب استعمال ہوتی ہے تو اس سے عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مذاہب کے درمیان مکالمہ ہے۔ یعنی اسلام اور عیسائیت آپس میں مکالمہ کریں گے۔ اسلام اور بدھ مت مکالمہ کریں گے۔ بدھ مت اور یہودیت مکالمہ کریں گے۔ میری ذاتی فہم میں، جو ممکن ہے غلط ہو، یہ بات مضحکہ خیز ہے اور ناقابل عمل ہے۔

اسلام کے مکالمے سے کیا مراد ہے؟ کیا اسلام کا کوئی مجسم وجود ہے؟ کیا اسلام کسی شخصیت کا نام ہے کہ جب وہ مکالمہ کرے تو اسلام کی طرف سے مکالمہ سمجھا جائے۔ کیا بدھ مت اور مسیحیت کسی شخصیت کے نام ہیں؟ مسیحیت میں تو چلئے ایک نمائندہ ہے، پوپ ہے جو دنیائے مسیحیت کے ایک بڑے حصے کا ترجمان ہے۔ یا کئی چرچوں کے سربراہان مل کر ممکن ہے مسیحیت کے ترجمان یا مسیحیت کے نمائندے کہلاسکیں، لیکن مسلمانوں میں تو ایسا کوئی نمائندہ موجود نہیں ہے۔ میری محدود معلومات کے مطابق ہندومت کا بھی کوئی ایسا

Marfat.com

ایک نمائندہ نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ جو بات یہ کہے گا وہ ہندو مت کی بات سمجھی جائے۔ مسلمانوں میں ہر صاحبِ علم بات کرنے کا مجاز ہے۔ مسلمانوں میں شریعت کا ہر عالم اسلام کی روشنی میں مسلمانوں کی طرف سے بات کرنے کا مجاز ہے۔ اس لئے میری ناچیز رائے میں یہ مکالمہ اتباعِ مذاہب کے درمیان تو ہوسکتا ہے۔ مذاہب کے درمیان اس کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مکالمہ ہونا چاہئے۔ ماضی میں بھی کسی نہ کسی شکل میں ہوا ہے۔ اس وقت بھی اس کی ضرورت ہے، اور آئندہ بھی یہ ضرورت قائم رہے گی۔۔ پہلی بات تو مکالمے کے لفظ سے میرے ذہن میں یہ آتی ہے۔

دوسری بات میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ جب ہم مکالمے کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو مکالمہ دراصل انگریزی اور مغربی اصطلاح ڈائیلاگ کا ترجمہ ہے۔ عربی میں آج کے روزمرہ اور محاورے میں حوار کی اصطلاح زیادہ استعمال ہوتی ہے، اردو میں مکالمے کی۔ لفظی معنی دونوں کے قریب قریب ایک ہی ہیں۔ اس سے پہلے حوار یا مکالمہ اردو یا عربی میں اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ یہ پچھلی ۴۰، ۵۰ سال پرانی اصطلاح ہے۔ اردو میں اور بھی نئی ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس سال سے سامنے آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی نئی اصطلاح آتی ہے تو وہ ایک خاص قسم کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے۔ اس ماحول کے اثرات اس اصطلاح پر بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اس ماحول کی تشکیل میں جو اثرات اور عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ اسباب وعوامل اس اصطلاح کے معنی ومفہوم کو متعین کرتے ہیں۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ جن اسباب وعوامل سے کوئی صورت حال پیدا ہوئی ہو اور اس صورت حال کو بیان کرنے کے لئے جو اصطلاح سامنے آئی ہو اس اصطلاح کا تعلق اسباب وعوامل سے نہ ہو، یہ نہیں ہوسکتا، یہ کبھی نہیں ہوا، آئندہ بھی نہیں ہوگا، ماضی میں بھی نہیں ہوا۔ اس لئے ہر اصطلاح کو سمجھنے کے لئے اس صورت حال کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور ان اسباب وعوامل کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے جن میں وہ اصطلاح پیدا ہوئی ہو۔

Marfat.com

اس بات کی وضاحت کے لئے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ غالباً اس سے اتفاق فرمائیں گے۔ اس لئے مکالمے کے معنی کو متعین کرنے کے لئے قدیم اور روایتی لغوی مباحث غیر متعلق ہیں کہ ابن منظور نے لسان العرب میں کیا لکھا ہے یا مولوی عبدالحق نے اردو لغت میں کیا لکھا ہے، یا اردو لغت نامے میں مکالمے کی کیا تعریف آئی ہے۔ یہ میرے خیال میں غیر ضروری ہے۔ اس لئے کہ مکالمے یا حوار کی اصطلاح ابن منظور کی لسان العرب سے نہیں لی گئی۔ وہ ڈائیلاگ کے عربی یا اردو ترجمے کے طور پر اختیار کی گئی ہے۔ اس لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ ڈائیلاگ سے کیا مراد ہے؟ اور یہ اصطلاح کب پیدا ہوئی؟ اس سے ملتی جلتی اصطلاحات دنیائے اسلام میں مرج رہی ہیں۔ دنیائے اسلام میں وہ اصطلاحات ایک خاص پس منظر کے ساتھ شروع سے قرآن پاک کی آیات کی روشنی میں، احادیث کی روشنی میں اختیار کی گئی ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا ہم حوار یا مکالمے کی اصطلاح چھوڑ کر قرآن پاک کی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں، یا ہمیں کرنی چاہئے، یا کم از کم مکالمے کے مفہوم اور پس منظر کو سمجھنے کے لئے ہم قرآن پاک کی اصطلاحات سے کام لے سکتے ہیں؟

میری ناقص رائے میں اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ مکالمے کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے اور کم از کم مسلمانوں کا موقف متعین کرنے کے لئے قرآن پاک کی متعلقہ اصطلاحات اور مسلمانوں کی مستعمل اصطلاحات کو ہمیں سامنے رکھنا چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ پچھلے تیس چالیس سال کے دوران دنیائے مغرب میں مکالمے کے بارے میں جو لکھا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہو۔

پچھلے ۵۰ سال کے دوران مذہبی مکالمے (ریلیجیس ڈائیلاگ) کے بارے میں چرچ نے بہت سی کتابیں تیار کروائی ہیں۔ یہ رومن کیتھولک چرچ نے بھی شائع کرائی ہیں، ویٹی کن میں شائع ہوئی ہیں۔ فرنچ میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض کا میں نے عربی ترجمہ بھی دیکھا ہے۔ ان کے ہاں اس مکالمے کے قواعد وضوابط کے بارے میں بھی بات ہوئی ہے۔ ان تحریروں کی روشنی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ رومن کیتھولک چرچ کا تصور حوار یا مکالمے کے بارے میں کیا ہے؟ اس کے بارے میں اچھی اور مفید معلومات ان

Marfat.com

کتابوں سے فراہم ہوتی ہیں۔لیکن اس طرح کی کتابیں دنیائے اسلام میں یا تو ہیں نہیں، یا ہیں تو بہت ہلکی اور ابتدائی نوعیت کی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمانوں میں اس بات کے بارے میں ذہن صاف ہو کہ ہم مکالمے سے کیا مراد لیتے ہیں؟ مکالمے کے قواعد اور تصورات ہمارے ذہن میں کیا ہیں؟

قرآن مجید کی جس مماثل یا متقارب اصطلاح کا میں نے ذکر کیا وہ مجادلہ ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱)

اور ان کے ساتھ بحث اچھے طریقے سے کیجئے۔

مجادلہ کے لفظ کو بہت سے اردو داں، اردو کے جنگ و جدل کے مفہوم میں یا اس کے قریب قریب کسی منفی تصور میں سمجھتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے۔عربی زبان میں مجادلے کا مفہوم اگر ہوسکتا ہے تو قریب قریب فکری یا دینی مباحثہ، انٹیلکچوئل ڈیبیٹ یا اکیڈمک ڈیبیٹ ہوسکتا ہے۔کسی ایسے شخص سے جس کا نقطۂ نظر آپ کے نقطۂ نظر سے مختلف ہو، آپ استدلال کے انداز میں تبادلۂ خیال کریں۔اپنا مؤقف دلائل کے ساتھ اس کے سامنے بیان کریں اور دلائل کے ساتھ اس کا مؤقف آپ سنیں اور ان دونوں مؤقفوں کو بیان کرنے، سننے کے بعد پھر جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی روشنی میں حاصل کریں۔

یہ قرآن پاک کی اصطلاح مجادلہ کا مفہوم ہے۔قرآن پاک نے مجادلہ کے بارے میں ہدایات بھی دی ہیں۔بہت سے احکامات بھی دیئے ہیں۔صحابۂ کرامؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام پر عمل کرنے کی مثالیں بھی چھوڑی ہیں۔نہ صرف یہ بل کہ قرآن مجید سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیائے کرام کو بھی اس مجادلے کے لئے ہدایات عطا فرمائی تھیں۔اگر اس کا Tentative یا عارضی اور وقتی ترجمہ صرف انٹلکچوئل ڈائیلاگ یا ریلیجن ڈائیلاگ کردیں تو بات سمجھنے میں ذرا آسانی ہوجائے گی۔اس کام کے لئے قرآن پاک میں سابقہ انبیائے کرام کے مجادلات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

قرآن مجید میں وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن یہ

۱۔النحل:۱۲۵

Marfat.com

بات بہت اہم ہے کہ قرآن پاک نے بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کا ایک بہت عمومی انداز استعمال فرمایا ہے۔ یہ بڑا عمومی صیغہ ہے۔ بہترین طریقے سے مجادلے کی بات کی گئی ہے۔ جو طریقہ بہترین ہو اس کے مطابق مجادلہ ہونا چاہئے۔ اس سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مجادلے کے لئے ہر دور کے لحاظ سے بہترین طریقے کو متعین کرنا چاہئے۔ اگر کوئی طریقہ یا دور ایسا ہے کہ اس میں فریقین مثال کے طور پر منطقی استدلال کے زیادہ خوگر ہیں، تو منطقی استدلال کے مطابق مجادلہ ہونا چاہئے۔ یا فریقین کسی اور طرزِ استدلال کے خوگر ہیں، انٹلکچوئل فریم ورک یعنی ذہنی ماحول کچھ اور ہے تو اس ذہنی ماحول کے لحاظ سے جو بہترین طریقہ ہے اسے اختیار کرنا چاہئے۔ اکثر مفسرین نے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ میں اَحْسَنُ کے معنی صرف اخلاقی طور پر احسن کے لئے ہیں۔ میرے خیال میں اس کو صرف اخلاقیات تک محدود کرنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً اخلاقی آداب کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ جس کی قرآن پاک میں بعض مثالیں بھی ہیں۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۱)

اور تم اس سے نرمی سے بات کرنا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲)

اور (اے مسلمانو) یہ مشرک اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم ان کو برا بھلا مت کہو۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جو بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے اخلاقی پہلو کو بیان کرتی ہیں۔ لیکن اخلاقی پہلو کے ساتھ اس کا ایک ذہنی اور فکری پہلو بھی ہے۔ یعنی جہاں مجادلے کی ایک اخلاقی جہت ہے وہاں اس کی ایک فکری اور استدلالی جہت بھی ہے۔ فکری اور استدلالی میدان میں بھی جو بہترین اور مؤثر ترین اندازِ استدلال ہو، جو سب سے زیادہ مقنع یعنی کنوینسنگ اور بدیہی انداز ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ جہاں قرآن پاک میں

۱۔ طٰہٰ: ۴۴

۲۔ الانعام: ۱۰۸

Marfat.com

اخلاقی اعتبار سے بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی وضاحتیں ہیں۔ جگہ جگہ مختلف آیات میں ان اخلاقی اصولوں کی وضاحتیں ہیں۔ خاص طور پر سورۃ النحل کے آخری حصے میں، وہاں علمی استدلال اور اس کے انداز کے بارے میں بھی بعض مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مجادلہ وہ اصطلاح ہے جو مکالمے کے سیاق وسباق میں بڑی متقارب اور متشابہ اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں ایک بڑی غلط فہمی جو ان ہی اصطلاحات کے اختلاط یا التباس سے پیدا ہوئی ہے وہ میری ناچیز رائے میں یہ ہے کہ بہت سے حضرات کے ذہن میں یہ بات ہے کہ مکالمہ مناظرے کی کوئی قسم ہے، اور مناظرے کے جو آداب رشیدی وغیرہ کتبِ مناظرہ میں بیان ہوئے ہیں وہ مکالمے میں استعمال ہونے چاہئیں۔ یہ تصور کیوں پیدا ہوا؟ میرے خیال میں اس کے بھی تاریخی اسباب ہیں۔

یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ مغربی استعمار کے ساتھ ساتھ مسیحیت اور مسیحی مبشرین دنیائے اسلام میں ہر جگہ کثرت سے وارد ہوئے۔ یہ بات تاریخی واقعہ ہے، جس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرسکتا کہ دنیائے اسلام میں مسیحی سرگرمیوں کا بڑے پیمانے پر جو طوفان آیا، یا بڑے پیمانے پر مسیحی مبلغین کا جو داخلہ ہوا وہ مغربی استعمار کے ساتھ ساتھ ہوا۔ ان دونوں کا زمانی توافق اور ان دونوں کا ایک وقت میں ہونا اتنا نمایاں ہے کہ اس سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ جب بڑی تعداد میں یہ عیسائی مشنریز دنیائے اسلام میں آئیں (برصغیر کی مثال سے آپ بہ راہِ راست واقف ہیں) تو مسیحی مشنریز کی جانب سے بڑے پیمانے پر علمائے کرام کو مناظروں کی دعوت دی گئی، چناں چہ برصغیر میں مناظرے ہونا شروع ہوئے۔ علمائے دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مناظرے، میلہ خدا شناسی، میلہ مذہب شناسی، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مناظرے، ڈاکٹر وزیر خان کے مناظرے، اور دوسرے متعدد علماء کے درجنوں مناظرے مشہور ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ مناظرے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئے۔ یہ مناظرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت بہت نمایاں رہے۔ مسلمان علما نے

Marfat.com

ان مناظروں میں حصہ لیا۔ ان مناظروں میں سے بعض کے تحریری ریکارڈ اور محضر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مناظرے مدون شدہ موجود ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مناظروں کی تفصیلات ان کی مرتب کردہ متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے کے بعد اور انگریزی حکومت کی بہ راہِ راست عمل داری کے آنے کے بعد یہ مناظرے قریب قریب ختم ہو گئے۔ کیوں ختم ہو گئے؟ برصغیر کے مسلمانوں نے اس پر کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ بڑے زور و شور سے یہ مناظرے ہو رہے تھے، اور حکومت کی سرپرستی میں ہو رہے تھے، حکومتی افسران اس کی سرپرستی کر رہے تھے۔ پھر اچانک یہ مناظرانہ سرگرمیاں بند کیوں ہو گئیں؟ یکایک ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اور مسلمانوں کی ناکامی کے بعد یہ مناظرے اور میلے ختم ہو گئے۔ آپ کو ۱۸۵۷ء کے بعد کوئی ایسا نمایاں مناظرہ نظر نہیں آئے گا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مناظرے البتہ ہوتے رہے، لیکن ایسی کوئی قابل ذکر مثال نہیں ملتی کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین کوئی بڑا مناظرہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہو، اس طرح کا قابل ذکر مناظرہ جس طرح کے مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے ہوئے، بعد میں نہیں ہوا۔ بعد میں ایک دوسرے انداز کی کاوش سامنے آئی جو ۱۸۵۷ء سے پہلے نہیں تھی۔ اس اعتبار سے اگر ۱۸۵۷ء نقطۂ افتراق قرار دیا جائے تو دو نمایاں چیزیں سامنے آتی ہیں۔

۱۹۵۷ء سے پہلے کا زمانہ، مناظروں کا اور ایک مذہبی ڈیبیٹ کا اور مذہبی مخاصمت کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ایک دوسرے انداز کے حملوں کا دور ہے۔ یہ دور بڑے پیمانے پر مغربی فاضلین کی علمی کتابوں کا دور ہے۔ سر ولیم میور کی کتاب اسی زمانے میں آئی۔ جس کے بارے میں سرسید جیسے آدمی نے لکھا تھا:

> جوں جوں سنتا جاتا ہوں، عبارت پڑھتا جاتا ہوں، دل کباب ہوتا جاتا ہے۔

یہ تاثر مسلمانوں کے اس طبقے کے نمائندہ شخص کا ہے جو انگریزوں سے بڑا

Marfat.com

قریب تھا۔ سب جانتے ہیں کہ انگریز سے معاملہ کرنے کے بارے میں سرسید کا نقطۂ نظر عام مسلمانوں سے خاصا مختلف تھا۔ لیکن ان جیسے آدمی کا دل بھی سر ولیم میور کی کتاب دیکھ کر کباب ہوگیا۔ اس طرح کی یہ ایک کتاب نہیں ہے بل کہ سلسلۂ کتب ہے۔

اس پس منظر میں پچھلے ۵۰، ۶۰ سال کے دوران مسلمان علما کے سامنے جب مکالمے کی اصطلاح آئی تو انہوں نے اسے اسی مناظرے کا ایک تسلسل سمجھا اور وہ یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھے۔ اگر مناظروں کی وہ نوعیت جو انیسویں صدی میں رہی ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ بیسویں صدی میں وہ نہ ہوتی۔ پہلے بہ راہِ راست مناظرے ہوئے۔ پھر علمی استدلال کے انداز کے مناظرے ہوئے۔ پھر بااثر حکام کی سربراہی میں علمی کتابوں کی صورت میں کیے جانے والے مناظرے ہونے شروع ہوئے۔ یہ علمی مناظرے خاصے عرصے تک ہوتے رہے۔ ایک عالمانہ کتاب بھی ایک طرح سے مناظرہ ہے۔ مناظرہ ضروری نہیں کہ دو فریق سامنے بیٹھ کر کریں۔ علمی تحریریں اور جوابی تحریریں بھی مناظرے کی ایک قسم ہے۔ تحریری مناظروں میں کتابیں بھی استعمال ہوتی ہیں، خط و کتابت بھی استعمال ہوتی ہے۔ آپ نے ایک مقالہ لکھا، اس کے جواب میں دوسرے مذہب کے عالم نے مقالہ لکھا۔ آپ نے جواب الجواب لکھا پھر اس نے جواب الجواب لکھا۔ اس طرح کے مناظرے بیس ویں صدی کے اوائل میں ہوتے رہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا مارگیولیتھ کے ساتھ مناظرہ مشہور رہا ہے۔ یہ مشہور جرمن یہودی مستشرق تھا، جس نے سیرت کے بارے میں بہت سی بے بنیاد باتیں کہی ہیں۔ اس کا علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جواب دیا۔ مستشرق مارگیولیتھ نے اپنا نقطۂ نظر دوبارہ بیان کیا۔ پھر علامہ نے جواب دیا۔ گویا ایک طویل علمی مناظرہ ہوا۔ اگرچہ یہ علمی مقالات تھے، جو معارف میں یا کسی اور جگہ شائع بھی ہوئے، غالباً اسلامی کلچر میں۔ لیکن دراصل یہ عالمانہ انداز کا ایک مناظرہ تھا۔

اسی طرح کتابوں کی شکل میں متعدد مناظرے ہوتے رہے۔ ایک مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے ایک کتاب آئی، اس کے جواب میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرف سے آئی۔ پھر جواب الجواب کے طور پر کتابیں آتی رہیں۔ ایسے مناظروں کی مثالیں بھی کم

Marfat.com

نہیں ہیں۔ بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ غازی محمود دھرم پال کے کتابی مناظرے اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔

ان تاریخی شواہد کی بنیاد پر اگر مسلمان علما نے مکالمے کی دعوت کو مناظرے کی دعوت سمجھا ہو تو یہ ایسی بے بنیاد بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بڑے تاریخی حقائق بھی تھے، اور طویل تجربات بھی تھے، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ آج جسے مکالمہ کہا جارہا ہے وہ ایک نئے انداز کی چیز ہے۔ ماضی میں اس کے اسباب جو بھی رہے ہوں، آج جس کو مکالمہ کہتے ہیں وہ مناظرہ نہیں ہے۔ اگرچہ مناظرہ بھی ایک طرح کا مدلل مکالمہ ہی ہے، لیکن مکالمہ اب ایک مختلف چیز بن گیا ہے۔ مکالمے میں اب مناظرے کا رنگ یا تو بالکل نہیں ہے، یا ہے تو بہت ہلکا اور برائے نام ہے۔ جس طرح سے مسلمان علما نے مناظرے کے آداب مقرر کیے۔ ان میں سے بعض مدارس میں پڑھائے بھی جاتے تھے۔ آج بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ رشیدی مشہور کتاب ہے جس میں مناظرے کے آداب پڑھائے جاتے ہیں۔ مناظرے کے انداز اور اسلوب سکھائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ علمائے کرام مناظرے کے لئے طلبہ کو تیار بھی کرتے ہیں اس کے لئے مخصوص کورس ہوتے ہیں، دورے ہوتے ہیں۔ اس طرح کا کوئی دورہ مکالمے کے لئے نہ تو مرتب ہوا نہ مناظرے کی طرح اس کے احکام مرتب کئے گئے۔ اگر مکالمے کے احکام مرتب کئے جائیں تو وہ مناظرے کے احکام سے خاصے مختلف ہوں گے۔

مناظرے کا مزاج آخر میں خاصا خراب ہو گیا تھا۔ شروع میں مناظرہ اہل علم کے درمیان محدود ہوتا تھا۔ بعد میں مناظرے میں عامۃ الناس بھی شامل ہو گئے۔ عامۃ الناس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو بہ ظاہر اہل علم کہلاتے ہیں لیکن ان کا شمار اپنے معیار کے مطابق عامۃ الناس ہی میں کیا جانا چاہئے۔ عامۃ الناس کی شرکت اگر اس طرح کے علمی کاموں میں ہو جائے تو پھر ان میں سطحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، عقلی استدلال کا عنصر کم ہو جاتا ہے، خطابی دلائل کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ اور انگلش میں کہتے ہیں Playing with the gallery کہ مخاطب عامۃ الناس ہو جاتے ہیں۔ جو فریق جتنی تالیاں بجوادے وہ

Marfat.com

اتنا ہی کام یاب سمجھا جاتا ہے۔ یہ چیز مکالمے میں آج غیر مفید ہے بل کہ مضر بھی ہے۔ اس لئے مکالمے کے آداب مرتب کرتے ہوئے مناظرے کے آداب سے شاید کوئی فائدہ نہ ہو سکے۔

مناظرے میں جب بہت زیادہ منفی اور عوامی انداز استعمال کیا گیا تو اس کے بہت سے نقصانات بھی ہوئے، مختلف مسلمان فرقوں کے درمیان بھی مناظرے ہوتے رہے، اور ان مناظروں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد ہی سے شدت پیدا ہوتی گئی۔ میں نہ صرف برصغیر کی تاریخ کا طالب علم ہوں، بل کہ میں نے برصغیر کی تاریخ کا بہت تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ خاص طور پر برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کی فکری اور مذہبی تاریخ کا مطالعہ میں نے خاص دل چسپی اور تفصیل سے کیا ہے، اس پر لکھا بھی ہے۔ ان موضوعات پر میری متعدد تحریریں مطبوعہ ہیں۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی، مجھے اس کا قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملا اور بغیر ثبوت کے میں بات نہیں کر سکتا۔

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان برصغیر میں باقاعدہ طور پر سن ۹۲ ہجری سے چلے آرہے ہیں۔ سن ۹۲ ہجری میں محمد بن قاسمؒ نے بلوچستان، سندھ اور ملتان تک پنجاب اور صوبہ سرحد کا کچھ حصہ فتح کیا۔ اس وقت سے یہاں مسلمان آباد ہیں۔ انفرادی طور پر اس خطے میں مسلمان سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے چلے آرہے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بمبئی کے علاقے میں اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں بلوچستان و مکران کے علاقے میں مسلمانوں کی آمد ہو گئی تھی۔ اس وقت سے لے کر تقریباً ۱۷۰۰ھ تک بل کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہونے تک یہاں مسلمان رہے۔ انہوں نے مناظرے بھی کیے، مکالمے بھی کیے، مباحثے بھی ہوئے لیکن وہ ان مسائل پر ہوئے جو مسلمانوں کے خالص کلامی یا فقہی یا استدلالی مسائل تھے۔ مثال کے طور پر خواجہ ضیاء الدین سنامی اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے درمیان سماع کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مشہور مناظرہ ہوا۔ یہ بڑا مشہور اور تاریخی واقعہ ہے۔ اس طرح کے مناظرے اور مباحثے دوسرے موضوعات پر بھی ہوتے رہے۔

لیکن جن سوالات کو انیسویں صدی کے اوائل اور اٹھارہویں صدی کے اواخر

Marfat.com

میں برصغیر میں اٹھایا گیا، وہ سوالات اس سے قبل نہ برصغیر میں کبھی اٹھائے گئے تھے اور نہ برصغیر کے باہر اٹھائے گئے تھے۔ مثال کے طور پر کیا اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) جھوٹ بول سکتا ہے؟ آپ مراکش سے لے کر ایران تک اور آرمینیا سے لے کر سوڈان کے جنوب تک چلے جائیں، مسلمانوں کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں، مجھے کسی قابل ذکر کلامی کتاب میں یہ بحث نہیں ملی کہ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا کرنا اس کے لئے آسان یا ممکن ہے؟ کیا رسول اللہ (نعوذ باللہ) فلاں فلاں (منفی) صفات سے متصف تھے؟ میں اس تکلیف دہ قصے کی زیادہ بحث میں نہیں جاتا۔ تاہم یہ سوالات تھے جو برصغیر میں انیسویں صدی میں ابھرے اور یہ وہ سوالات تھے جن کی بنیاد پر دو گروہ بن گئے۔ ان کی بنیاد پر مسلمان منقسم ہو گئے اور اس طرح منقسم ہو گئے کہ ہر ایسے آدمی نے اس بحث میں حصہ لیا جس کا کوئی خاص مذہبی مقام و مرتبہ یا دعویٰ نہیں تھا۔ ایسے حضرات بھی اس بحث میں شامل ہو گئے جو بڑے مشہور تھے، دنیائے اسلام میں اپنا احترام رکھتے تھے، برصغیر میں کسی مذہبی سبب سے نہیں بل کہ کسی اور سبب سے محترم تھے، جیسے مرزا غالب۔ مرزا غالب کی جو بھی وجۂ شہرت ہو، مذہبیات نہیں تھی۔ مرزا غالب جیسے آدمی نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ ان کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک رسالہ بھی ان سے منسوب بتایا جاتا ہے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان موضوعات پر مباحث انگریزوں کی آمد کے بعد ہی کیوں شروع ہوئے۔

یہ مناظرے جب شروع ہوئے تو سنجیدہ اہلِ علم مسلمانوں نے ان کو ایک منفی چیز قرار دے کر چھوڑ دیا۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ مناظرے کا دور بھی ختم ہو گیا۔ کم از کم پچھلے ۲۵، ۳۰ سالوں میں میں نے نہیں سنا کہ کوئی مذہبی مناظرہ پاکستان یا ہندوستان میں کہیں ہوا ہو۔ ہمارے بچپن میں کثرت سے ہوا کرتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ہوا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مختلف مسالک کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ مسلمان اہلِ علم نے مذہبی بحث کو ہی ایک منفی چیز قرار دیا۔ مذہبی بحث گویا منفی عمل کا ایک مترادف بن گئی۔ مناظرہ ایک منفی چیز قرار پایا۔

Marfat.com

اکبر آلہ آبادی کا ایک بڑا دل چسپ شعر ہے:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

تو مذہبی بحث کو گویا فالتو عقل ہونے کا ایک مظہر سمجھا گیا۔ یہ بات میں نے اس لئے عرض کی کہ مکالمے اور مناظرے کے درمیان بنیادی طور پر فرق کرنا چاہئے، اور مکالمے کو مناظرے سے ملتبس نہیں کرنا چاہئے۔ خود انگریزی زبان میں متعدد الفاظ ہیں، جو مکالمے کے قریب قریب مضامین کو بیان کرتے ہیں۔ انگریزی زبان تاجروں کی اور ڈپلومیسی کی زبان ہے۔ انگریزی زبان میں یہ خوبی یا خامی ہے، جو بھی ہے ایک وصف ہے۔ میں نہ خوبی کہتا ہوں نہ خامی۔ ایک صفت ہے کہ آپ اس میں ایسے بہت سے الفاظ استعمال کرسکتے ہیں جس سے آپ کے اصل عزائم یا نیت کا پتہ نہ چلے۔ آپ پوری گفت گو کرلیں، گھنٹوں بات کرلیں، بل کہ پوری کتاب لکھ دیں لیکن کسی لفظ سے یا کسی استدلال سے یا اسلوب سے آپ کے عزائم، نیت یا اصل حقائق کا پتہ نہیں چل سکتا۔ یہ خوبی بھی ہوسکتی ہے، خامی بھی ہوسکتی ہے۔ استعمال کی بات ہے۔ اس لئے انگریزی زبان کے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو بہ ظاہر بہت استعمال ہوتے ہیں لیکن کسی نے ان کا اصل مفہوم کبھی واضح نہیں کیا کہ ان سے مراد کیا ہے؟ مثال کے طور پر انگیج منٹ کا لفظ ہے، یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ You Engage the Muslims آپ مسلمانوں کو انگیج کریں You Engage the Ulama آپ علما کو انگیج کریں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ یہ لفظ سنا تو میرے ذہن میں انگیج کے جو معنی تھے ان کے لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی۔ لغت میں انگیج کے معنی وابستہ کرنے کے ہیں۔ آپ کسی چیز کو کسی سے جوڑ دیں، یا وابستہ کردیں، اس کو انگیج کرنا کہتے ہیں۔ اب علما کو انگیج کرنے سے کیا مراد ہے، میرے ذہن میں یہی تصور آیا۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے میں نے یہ لفظ سنا تھا۔ اس طویل عرصے میں پتہ چلا کہ انگیج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو گفت گو میں الجھائے رکھو، گفت گو میں مصروف رکھو، ذکر وفکر صبح گاہی میں ان کو مست رکھو۔ اس طرح کا تصور اب میرے ذہن میں آیا، ممکن ہے یہ

Marfat.com

غلط ہو، یا ممکن ہے غلط نہ ہو۔ لیکن انگیج منٹ کا باقاعدہ ایک طریق کار بن گیا۔ اب یہ ڈپلومیسی کا ایک مؤثر حصہ ہے۔

بہ ہر حال انگیج منٹ ایک اصطلاح ہے جو فریق مخالف سے مسلسل گفت گو کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر آپ غور فرمائیں تو امریکی اور مغربی سفارت کار اکثر استعمال کرتے ہیں۔

Pakistan should remain engaged with India. India should engage Pakistan on Kashmir.

اس سے مراد یہی ہے کہ گفت گو میں مصروف رکھو، کسی نتیجے پر پہنچو یا نہ پہنچو، لیکن گفت گو جاری رہے، تاکہ فریق مخالف کو کچھ اور سوچنے کا یا کسی متبادل امکان پر غور کرنے کا موقع نہ ملے۔ ممکن ہے انگیج منٹ کے یہی معنی ہوں۔ ممکن ہے انگیج منٹ کے معنی کچھ اور ہوں۔ لیکن عملاً انگیج منٹ کے نام سے یہی ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کو ان مسائل کے بارے میں لامتناہی اور بے نتیجہ گفت گو میں مصروف رکھا جاتا ہے، اور مسلم ''قائدین'' خوشی خوشی اس مصروفیت میں مبتلا رہنے کو اپنی بہت بڑی کام یابی سمجھتے ہیں۔

مکالمہ غالباً انگیج منٹ سے مختلف ہے۔ مکالمے سے اہل مغرب کی مراد بہ ظاہر (کم از کم میرا تاثر یہ ہے کہ) انگیج منٹ سے مختلف ہے۔ مکالمہ ایک علمی اور فکری سرگرمی ہے۔ جب کہ انگیج منٹ ایک سفارتی حربہ یا گُر ہے۔ لیکن بہ طور ایک سفارتی حربے یا گر کے بھی اس کی کام یابی محلِ نظر ہے۔ آخر دنیائے اسلام کو کب تک مصروفِ گفت گو رکھا جائے گا۔ اس لئے کہ دنیائے اسلام کا وجود کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ۳۰ سال بعد یا ۴۰، ۵۰ سال بعد ختم ہو جائے۔ کشمیر کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ سوچتے ہوں کہ ۲۰، ۳۰ سال میں ختم ہو جائے گا۔ فلسطین کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ چیچنیا کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ فلاں مسئلہ ختم ہو جائے گا، فلاں مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے اس وقت تک مسلمانوں کو انگیج رکھ کر اندر اندر مسئلے کو غتر بود کرتے رہو۔ لیکن جہاں تک اسلام اور دنیائے اسلام کے وجود کا تعلق ہے اس میں اگر انگیج منٹ سے کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال میں یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا تو

Marfat.com

وہ غلطی پر ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ مسئلہ، یعنی اسلام اور مغرب کے تصادم یا تفاہم کا مسئلہ نہ تو ختم ہوگا، نہ اس انگیج منٹ سے حل ہوگا۔ اس لئے انگیج منٹ کے معاملے کو تو الگ کر دینا چاہئے، اور مکالمے کو مکالمہ ہی سمجھنا چاہئے۔

ہم میں سے بہت سے حضرات بعض اوقات مکالمے کا مقصد تبلیغ سمجھتے ہیں۔ تبلیغ ایک مسلمان کی ذمے داری ہے، ہم میں سے ہر ایک کی ذمے داری ہے کہ دین کا علم جتنا جس کے پاس ہے وہ دوسرے تک پہنچائے:

بلغوا عنی ولو آیة (۱)

مکالمے میں تبلیغ کا فریضہ بھی انجام پا جاتا ہے، خود بہ خود انجام ہو جاتا ہے، جب مکالمے میں آپ اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں گے تو تبلیغ کا فریضہ بالواسطہ طور پر ادا ہو جائے گا۔ لیکن تبلیغ ایک مستقل بالذات عمل ہے۔ ایک مستقل بالذات اصطلاح ہے اور ایک مستقل بالذات ذمے داری ہے۔ جس کا مکالمے کی ذمے داری یا اس کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں۔ مکالمہ تو ایک وقتی چیز ہے جو موجودہ صورت حال میں موجودہ شدت کو کم کرنے کے لئے، تعلقات میں موجود تعطل یا کھنچاؤ کو نرم کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ تبلیغ سے ایک مختلف چیز ہے۔ تبلیغ ایک دائمی فریضہ ہے جو مسلمان علما کو انجام دینا ہے، اور مسلمان اس کو انجام دیتے چلے آ رہے ہیں۔

بلاشبہ مکالمے کی اصطلاح مغرب سے آئی ہے۔ اگر چہ مکالمے کا آغاز بنیادی طور پر چرچ کی طرف سے ہوا ہے۔ رومن کیتھولک چرچ کی طرف سے زیادہ ہوا ہے۔ یقیناً مکالمے کے آداب اور قواعد وضوابط زیادہ تر انھوں نے ہی بنائے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی مکالمے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو بھی تفاہم کی ضرورت ہے۔ دوسروں کو بھی ضرورت ہے۔ مزید برآں مسلمانوں کا مکالمہ غیر مسلموں کے ساتھ اور مسلمانوں کا مکالمہ آپس میں بھی ضروری ہے، جس کی ایک مثال یہ مکالمہ ہے، جو ہم آج کر رہے ہیں تا کہ مسلمانوں کا ایک مؤقف متفقہ طور پر سامنے آ جائے۔

۱۔ ترمذی: ج ۴، ۳۰۵۔ رقم ۲۶۷۸

Marfat.com

جتنی ضرورت مکالمے کی دنیائے اسلام کو ہے۔ اس سے زیادہ مکالمے کی ضرورت دنیائے مغرب کو ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کے تصور کو مان لیا جائے، ہن ٹنگٹن کے تصور کو درست مان لیا جائے۔ ہن ٹنگٹن نے یہ لکھا ہے کہ دنیا میں اس وقت تین بڑی تہذیبیں ہیں، ایک تہذیب مغرب ہے۔ جس کو وہ بہت اونچے درجے پر فائز مانتے ہیں۔ دوسری تہذیب اسلامی ہے۔ تیسرے بدھسٹ تہذیب ہے، جس کی نمائندگی چین اور جاپان کرتے ہیں۔ ہن ٹنگٹن کا خیال یہ ہے کہ آخری دونوں تہذیبیں، اسلامی تہذیب اور بدھسٹ تہذیب بالآخر ایک دوسرے کے قریب آجائیں گی اور قریب آنے کے بعد یہ دونوں مل کر مغربی تہذیب کو مٹانے کی کوشش کریں گی، اور جلد یا بہ دیر مغربی تہذیب کا ایک بہت بڑا تصادم ان دونوں تہذیبوں کے مشترکہ پلیٹ فارم سے ہوگا۔ اس ناگزیر تصادم کے نتیجے میں مغربی تہذیب کو شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ لہٰذا ابھی سے اس کا سد باب کرنا چاہئے، اور ابھی سے بدھسٹ دنیا اور دنیائے اسلام کے ممکنہ تعاون، اتحاد اور ہم کاری کو ختم کونے کی کوشش کرنی چاہئے، اور اس ممکنہ خطرے کا سد باب کرنا چاہئے، جس کی اس نے نشان دہی کی ہے۔ اور فلاں فلاں اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ خلاصہ ہے ہن ٹنگٹن کے مقالے کا اور بعد میں کتاب کا۔

اگر یہ تصور صحیح ہے، تو اب ایک شکل تو یہ ہے کہ اسی طرح کا ایک تصادم ہو۔ جیسا کہ ہن ٹنگٹن کا خیال ہے کہ ہوگا۔ اس تصادم کے نتیجے میں کس کے پاس کیا بچے گا، کوئی نہیں کہہ سکتا، دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب ہمیں پتھر کے دور میں پہنچا دے گا۔ مغرب ہمیں پتھر کے دور میں پہنچا دے گا تو ہم اسے کس دور میں پہنچا سکتے ہیں اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔

دنیائے اسلام کے پاس بھی بہت کچھ ہے، ایسا نہیں ہے کہ مغرب ہمیں پتھر کے دور میں پہنچا دے گا اور ہم انہیں کسی دور میں نہیں پہنچا سکتے۔ یہ تو چیونٹی اور ہاتھی کا معاملہ ہے۔ بچپن میں بچے حکایات پڑھتے تھے کہ کس طرح چیونٹی ہاتھی کو ہلاک کرسکتی ہے، اور چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی شیر کو سنچا سکتا ہے۔ کلیلہ ودمنہ کی حکایات آپ نے پڑھی ہوں

Marfat.com

گی، بچپن میں ہم نے بھی پڑھی ہیں۔ ان میں یہی سبق دیا گیا ہے کہ کم زور سے کم زور انسان کو بھی خوف اور بزدلی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مغرب ہی کے پاس Initiative ہے اور دنیائے اسلام کے پاس نہیں ہے Initiative دونوں کے پاس ہے۔ اس لئے تصادم کی راہ تو نہ ان کے حق میں ہے نہ ہمارے حق میں۔ ہمارے پاس کھونے کے لئے بہت تھوڑی چیزیں ہیں۔ ان کے پاس کھونے کے لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن اصل راستہ جو ایک باعزت تعایش کا، یا باعزت زندگی کا راستہ دونوں کے لئے ہے، وہ آپس میں ڈائیلاگ، تفاہم اور مکالمے کا راستہ ہے۔ ماضی میں بھی اسلام مختلف تہذیبوں کے ساتھ ایک پرامن بقائے باہمی کے ساتھ رہا ہے۔ مسلمانوں نے دوسروں کی تہذیبوں سے کسب خیر اور استفادہ کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ کبھی بھی مسلمانوں میں بہترین اہل علم نے، جید ترین اور مخلص ترین صاحب ایمان لوگوں تک نے، یونانیوں کے علوم و فنون سے استفادہ حاصل کرنے میں تامل نہیں کیا۔ یونانی تو مخلص مومن نہیں تھے۔ مشرک تھے، بت پرست تھے۔ ان کی شرکیات تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج تک ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ خود ہمارے ہاں بھی بہت سی یونانی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اولمپک گیم، یہ مقابلہ وہ مقابلہ۔ دکانوں کے ناموں تک میں یونانی دیوتاؤں کے نام جا بجا نظر آتے ہیں۔ میں جب بھی کسی بڑے شہر کے بازاروں سے گزرتا ہوں تو ہر جگہ دکانوں کے نام یونانی دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ یہ کسی دیوتا کا نام ہے، بس رکھ دیتے ہیں۔ یونانی شرکیات تو آج تک ہم پر مسلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان علما نے یونانی علوم سے استفادہ کرنے میں کسی تامل یا تعصب سے کام نہیں لیا۔ ان کی ہر مفید چیز سے استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ اتنا اعتراف کیا کہ مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے، اور مجھے اس پر افسوس بھی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بے تعصبی کا دنیا کیوں اعتراف نہیں کرتی کہ ارسطو کو انھوں نے معلم اول قرار دیا۔ دو جید مسلمان فلاسفہ کو اس کے بعد کا درجہ دیا۔ ابن سینا اور فارابی کا درجہ ارسطو کے بعد ہی قرار دیا گیا۔ مسلمان مفکرین نے ارسطو کو معلم اول قرار دیا ہے۔ یہ بات ہر مدرسے میں پڑھائی جاتی

Marfat.com

ہے لیکن کوئی مغربی فاضل اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ مسلمانوں نے اس بے تعصبی سے کام لیا ہے۔ کسی مغربی آدمی نے کسی مسلمان عالم کے علم وفضل کا آج تک اعتراف نہیں کیا۔ کسی فن میں کسی مسلمان عالم کو معلم اول قرار نہیں دیا۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ فلاں فن کے موجد مسلمان ہیں، یا فلاں فن پہلی مرتبہ مسلمان علما نے مرتب کیا، کسی نے کسی مسلمان عالم کو اس فن کا معلم اول قرار نہیں دیا۔

علمائے مغرب اپنی بے تعصبی کی مثال بیان کیا کرتے ہیں۔ یہ جو انٹرنیشنل لاء یعنی بین الاقوامی قانون ہے، اس پر سب سے پہلے جس مغربی فاضل نے باقاعدہ مرتب کتاب لکھی وہ ہیوگو گروشیس تھا۔ ہیوگو گروشیس کی وفات گیارہویں صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ He is the father of the international law. یعنی بین الاقوامی قانون کا بانی۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہیوگو گروشیس کی پیدائش سے نو سو سال پہلے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام واقدیؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ بن حسن شیبانی، یہ حضرات بین الاقوامی تعلقات کے قانون پر، جنگ وصلح کے قوانین پر تقریباً ایک درجن کے قریب کتابیں لکھ چکے تھے۔ اور ان میں سے امام محمدؒ کی تین کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، جن میں سے کم از کم دو تو چھپی ہوئی موجود ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور مختلف زبانوں میں ترجموں کے ساتھ۔ لیکن اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ ہیوگو گروشیس ہی اس شعبۂ قانون کا جد امجد ہے۔ ایک مغربی فاضل تھا جس نے کتاب لکھی تھی .Historian's history of the world یہ فاضل ہنگری کا تھا، اس نے پہلی مرتبہ امام محمدؒ کے اس کام کا اعتراف کیا، اور یہ لکھا کہ امام محمدؒ بین الاقوامی قانون کے سب سے اولین مصنفین میں سے ہیں، جن کی کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ ایک اور مغربی فاضل نے اپنی دانست میں بڑی بے تعصبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ شیبانی کو مسلمانوں کا ہیوگو گروشیس قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ میں ہوتا تو اس سے پوچھتا کہ آپ کو تو ہیوگو گروشیس کو عیسائیوں کا شیبانی قرار دینا چاہئے۔ اس لئے کہ جو پہلے آتا ہے وہ سنت قائم کرتا ہے اور ولکل سنۃ قوم وامامھا

Marfat.com

اگر پہل کرنے والے کے نام پر کوئی چیز کہی جاسکتی ہے تو امام محمدؒ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو انٹرنیشنل لاء کا بانی کہا جائے، اور ہیوگو گروشیس کو عیسائی دنیا کا شیبانی قرار دیا جائے۔ یوں یہ بات منطقی اور انصاف کی ہوگی۔ لیکن اس کا برعکس نہ عقل میں آتا ہے نہ انصاف کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اصول قانون کی پہلی کتاب انھوں نے لکھی۔ اصول قانون پر امام شافعیؒ سے پہلے کی کوئی کتاب آج دنیا میں کسی زبان میں موجود نہیں۔ اصول قانون پر امام شافعیؒ سے پہلے کی مخطوطہ، مطبوعہ، مکمل، نامکمل کوئی چیز موجود نہیں اور مغربی دنیا کے فاضلین بھی اس کو مانتے ہیں۔ مغربی دنیا کے ایک نام ور فاضلِ اسلامیات نے لکھا ہے کہ شافعیؒ کی حیثیت اصول قانون کے بارے میں وہی ہے جو حکیم ارسطا طالیس کی منطق کے بارے میں ہے۔ جس طرح اس نے منطق کو مرتب کر کے بیان کیا، اسی طرح امام شافعیؒ نے اصول قانون کو بیان کیا۔ لیکن آج تک کسی مغربی قانون داں نے امام شافعیؒ کو اصول قانون کا موجد اول نہیں مانا۔ میں نے علم قانون کی کسی تاریخ میں یا علوم اجتماعی کے کسی دائرۃ المعارف میں نہیں پڑھا کہ کسی نے کہا ہو کہ امام شافعیؒ اصول قانون کے موجد اول کی حیثیت رکھتے ہیں، یا امام محمد بن حسنؒ انٹرنیشنل لاء میں موجد اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں علمی اعتبار سے بے تعصبی ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے، یہ ایک متفق علیہ اور تسلیم شدہ تاریخی واقعہ ہے۔

اس لئے پوری اسلامی تاریخ میں مختلف تہذیبوں کے درمیان تعاون کی جو نوعیت اسلامی تاریخ میں رہی ہے، اس کی نظیر کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ جب مسلمانوں کا سابقہ اور واسطہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ ہوا تو جہاں اس کے نتیجے میں ہندوؤں نے بے شمار چیزیں مسلمانوں سے لیں، وہاں مسلمانوں نے بہت سی چیزیں ان سے لے لیں، جن میں سے بعض منفی بھی تھیں۔ جن کے بارے میں وقتاً فوقتاً علما اظہار خیال کرتے بھی رہے۔ اس لئے اگر مستقبل میں دنیائے اسلام اور دنیائے مغرب کے درمیان کوئی تعلق اور کوئی پرامن باہمی رابطہ قائم ہوتا ہے تو وہ تصادم اور Conflict کا

Marfat.com

نہیں ہوگا۔ تصادم اور Conflict کے راستے پر اگر دنیائے مغرب اگر چلنا چاہتی ہے (اور ایسا لگتا ہے کہ وہ چلنا چاہتی ہے) تو وہ نہ صرف فریقین کے لئے کارآمد اور مفید نہیں ہے، بل کہ یہ بات پوری انسانیت کے لئے نقصان دہ ہے۔

یہ بات دنیائے مغرب کے بہت سے لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ پرامن بقائے باہمی ہی اصل حل ہے۔ دنیائے مغرب میں کچھ لوگوں کا تو یہ خیال ہے۔ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ دنیائے اسلام منتشر ہے۔ غیر متحد ہے۔ اس کے تصورات میں ہم آہنگی نہیں ہے یا یک سانیت نہیں ہے۔ مزید برآں اہل مغرب پچھلے دو سو برس سے مختلف نوعیت کے اسلام بنانے میں مصروف ہیں، انڈین اسلام، مصری اسلام، سلفی اسلام، وہابی اسلام اور آج کل فنڈامینٹل اسلام اور فلاں اسلام۔ یوں انھوں نے طرح طرح کے اسلام بنالئے ہیں، طرح طرح کی قیادتیں پیدا کردی ہیں۔ مختلف لوگوں کو حرص اور تخویف کے ذریعے متاثر کردیا ہے یا خاموش اور غیر مؤثر کردیا ہے۔ اس لئے اگر دنیائے اسلام پر مزید دباؤ ڈالا جائے تو پھر یہ قیادتیں ہمارے مقاصد پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس وقت دنیائے اسلام کے قائدین یا تو ان کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں یا ان سے خائف ہیں۔

لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ اگر چند درجن قائدین خائف ہیں۔ تو ایک ارب چھپن کروڑ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد خائف نہیں! اور اتنی بڑی تعداد کو جبر سے یا زبردستی کسی خاص نقطۂ نظر کے اختیار کرنے پر کبھی بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنا قابل عمل بھی نہیں ہے، اور اگر اہل مغرب ایسا کرنا بھی چاہیں گے تو مغرب کے اتنے وسائل اس میں ڈوب جائیں گے کہ سارا مغرب ہی اس کوشش میں فنا ہوجائے گا۔ افغانستان میں کتنے وسائل ضائع ہوئے ہیں، اگر کانگریس کی ڈبیٹ آپ کے سامنے ہو، جو چھپتی رہتی ہے، اور وقتاً فوقتاً ہمارے اخبارات کی زینت بھی بنتی رہتی ہے تو اندازہ ہوجائے گا کہ افغانستان اور عراق میں ان کے کتنے وسائل ڈوبے ہیں۔ اس کے باوجود وہ عراق میں رہنے پر مصر ہیں۔ اس لئے کہ وسائل تو ریاست کے ڈوبے ہیں، جب کہ اس حملے اور قتل و غارت گری

Marfat.com

سے جو فائدہ ہوا ہے وہ افراد کو ہوا ہے۔ اور افراد اپنے فائدے ہی کے لئے وہاں موجود ہیں۔ یہ بات شاید آپ کے علم میں ہو کہ امریکی حکومت کے قائدین میں سے بہت سے بڑے بڑے لوگ تیل کے بین الاقوامی تاجر ہیں۔ بش صاحب خود اور ان کے قریبی رفقا میں بہت سارے تیل کے تاجر ہیں، اور انھوں نے اپنی تیل کی تجارت کو آئندہ سو برس تک کے لئے بالکل مضبوط بنیادوں پر قائم کرلیا ہے۔ اس لئے عراق میں امریکہ کے جو نقصانات ہوئے ہیں وہ امریکی خزانے کے اور امریکی عوام کے ہوئے ہیں، جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ صرف تیل کے تاجروں کو ہوئے ہیں، یا تعمیر نو کے امریکی اور مغربی ٹھیکے داروں کو ہوئے ہیں۔ لیکن یہ امریکہ کا آپس کا معاملہ ہے وہ خود طے کریں۔

ان سارے وسائل کے باوجود جو ناقابل بیان ہیں، پاکستان ان اعداد وشمار کا تصور نہیں کرسکتا جو امریکہ نے عراق میں استعمال کئے ہیں۔ عراق پر امریکی قبضہ مکمل نہیں ہوسکا۔ اب اگر ایک ملک پر جبر کرنے میں اتنے وسائل درکار ہیں تو ۵۷ ممالک پر مکمل جبر کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے گا۔

اس لئے اس طرح نہ تو موجودہ صورت حال جاری رہ سکتی ہے، نہ کھلا تصادم ہوسکتا ہے اور نہ بے یقینی کی کیفیت جاری رہ سکتی ہے۔ جو چیز قابل عمل ہے، جسے وہاں کے سنجیدہ لوگ اب تسلیم کررہے ہیں، وہ تفاہم اور مکالمے کا عمل ہے۔ مغرب کے بہت سے ذمے دار لوگ یہ مان رہے ہیں کہ یہ دونوں راستے خطرناک ہیں، ہمارے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی۔ جو راستہ بچا ہے وہ ڈائیلاگ اور مکالمے کا راستہ ہے۔ اس لئے جتنی ضرورت ہمیں مکالمے کی ہے، اس سے زیادہ مکالمے کی ضرورت مغرب کو ہے۔ لیکن اس سے پہلے مکالموں کی دو سطحیں ہمارے لئے ناگزیر ہیں۔

ایک مسلمانوں کا آپس میں مکالمہ۔ یعنی انگریزی میں یہ کہہ سکتے ہیں Intra muslim dialogue دوسرا مسلمانوں کا ڈائیلاگ جو دوسری غیر مغربی قوتوں سے کیا جانا چاہئے۔ یہ وہ غیر مغربی قوتیں ہیں جو مسلمانوں کے قرب وجوار میں ہیں۔ بدھ مت کی پیروکار ہیں، یا اور دوسری فورسز ہیں، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان بھی ایک مکالمہ

Marfat.com

الگ ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ کچھ مسائل ایسے ہیں کہ جو ہمارے اور ان کے مشترک ہیں۔ کچھ شکایات ایسی ہیں جو مشرقی دنیا کو مغربی دنیا کے ساتھ درپیش ہیں۔ ان شکایات کے سلسلے میں مسلمانوں کا اور ان قوتوں کا مشترک موقف اگر ہوسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ مثال کے طور پر گلوبلائزیشن کا معاملہ ہے۔ دنیا میں عالم گیریت کا ایک بھرپور نظام لایا جارہا ہے۔ گلوبلائزیشن کے ڈیکلئیرڈ (اعلانیہ) اہداف جو بھی ہوں۔ اصل اہداف بہت پریشان کن ہیں۔ ڈیکلئیرڈ اہداف تو ہمیشہ بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ دنیائے مغرب جیسا کہ میں نے عرض کیا اصل اہداف کو پردوں میں رکھتی ہے۔ ظاہری اور اعلان شدہ مقاصد اور ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی زبان میں ڈپلومیسی بہت مؤثر ہوتی ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ان کے ڈیکلئیرڈ Objectives ہوں، اعلان شدہ مقاصد کہ ہر جگہ، کتابوں میں، مکالموں میں، سیاسی تقریروں میں، گفت گوؤں میں، سرکاری تقاریب میں بہت خوب صورت الفاظ میں دہرائے جاتے ہیں۔ ان خوب صورت الفاظ سے کوئی آدمی اختلاف نہیں کرسکتا۔ لیکن دوسری طرف ان کے اصل مقاصد ہوتے ہیں۔ جو دراصل حقیقی سیاسی عزائم Real political aims کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کے اصل عزائم ہیں، وہ کبھی لکھے نہیں جاتے۔ ان کا کوئی مغربی فاضل کبھی ان کا اعلان نہیں کرتا۔ کبھی کسی نے اعلان نہیں کیا کہ آئندہ ۵۰ سال کے لئے ان کے عزائم کیا ہیں آئندہ دس سال کے لئے کیا ہیں۔ آئندہ ایک سال کے لئے بھی کیا ہیں، اس کا کوئی بھی اعلان نہیں کرتا۔

ایک ذاتی مثال جو میرے ذاتی علم میں ہے میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض مسلمان اور عرب نوجوانوں نے شہری ہوابازی کی تربیت حاصل کی۔ شہری ہوابازی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ دو جہازوں میں سوار ہوئے، اور ان دو جہازوں کو انھوں نے اغوا کرلیا، اور ان دو جہازوں کو دو بڑی بلڈنگوں سے ٹکرادیا۔ وہ ساری بلڈنگیں بیٹھ گئیں اور اس کے نتیجے میں ہزاروں افراد مارے گئے۔ یہ دونوں جہاز جو گرائے گئے امریکی جہاز تھے۔ یہ سارے نوجوان اسامہ بن لادن کے ایجنٹ بتائے گئے۔ کہا گیا کہ اسی نے پیسہ دیا تھا۔ اسامہ بن لادن افغانستان میں تھا۔ لہٰذا افغانستان

Marfat.com

سے مطالبہ کیا گیا کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ جب افغان حکومت نے اسے حوالے کرنے میں تامل کیا، اور اس واقعے میں اسامہ کے ملوث ہونے کا ثبوت مانگا، کسی انٹرنیشنل ٹریبونل کی بات کی تو امریکہ آپے سے باہر ہو گیا۔ افغانستان کو تہس نہس کر دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ جو ملک افغانستان کا ساتھ دے گا، اسے بھی تہس نہس کر دیا جائے گا۔

چلئے اس بات کو اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یہ کام کیا وہ پہلے سے تو آپ کے علم میں نہیں تھے۔ نیو یارک کے ان دو میناروں پر اچانک حملہ ہو گیا۔ جو سارا سیناریو تھا وہ یہ ہے کہ یہ واقعہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پیش آیا۔ فروری یا مارچ ۲۰۰۰ء میں ہماری بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی کی کچھ کتابیں چھپوائی جانی تھیں۔ بڑے پیمانے پر کتابیں چھپنے کا جو کام ہوتا ہے وہ خاصا مشکل ہوتا ہے۔ چوں کہ شریعہ اکیڈمی ایک ایسا ادارہ ہے جو حکومت سے بجٹ لے کر کام کرتا ہے، اور حکومت کے قواعد کے مطابق کام کرتا ہے۔ حکومت کے قواعد کے رو سے یہ اجازت نہیں ہوتی کہ آپ جس سے چاہیں جو چاہیں کام کروا سکیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ اخبار میں ٹینڈر پیش کریں گے کہ ہمیں اتنے کا کام، اس نوعیت کا درکار ہے، اس کی پوری تفصیل ہوگی۔ جو پریس چھاپنے کے لئے آمادہ ہیں وہ اپنے ٹینڈر داخل کریں گے اور اس کی قیمت بھی بتائیں گے کہ وہ یہ کتابیں کتنی رقم میں چھاپیں گے، اس میں سے جو سب سے کم قیمت آپ کو پیش کرے، اسی سے آپ کو معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے ہٹ کر حکومت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ شریعہ اکیڈمی نے ٹینڈر کیا تھا۔ اس میں جو سب سے کم ٹینڈر آیا اس سے بات طے کر دی، اور پانچ سات کتابیں، مجھے یاد نہیں لیکن کئی کتابیں تھیں چھاپنے کی بات ہو گئی۔ اس وقت کے ہمارے شریعہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل بار بار اس کو یاد دہانی کرواتے رہے، لیکن پرنٹنگ پریس نے بروقت کتابیں تیار نہیں کیں۔

یہ فروری ۲۰۰۰ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اور ابھی اس ''حادثے'' کے پیش آنے میں ڈیڑھ پونے دو سال باقی ہیں، لیکن جب پریس نے بہت تاخیر کی تو خیال ہوا کہ ڈائریکٹر جنرل خود جا کر بات کریں، انہوں نے پرنٹر سے جا کر بات کی کہ پہلے تو آپ کام

Marfat.com

وقت پر کیا کرتے تھے۔اب وقت پر کیوں نہیں کرتے؟ اس نے کہا میرے پاس بہت کام آیا ہوا ہے اور میں نے بہت ذمے داری لے لی ہے، میں معذرت چاہتا ہوں۔آپ جو تاوان بھی چاہیں وہ مجھ سے لے لیں، مگر میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ڈائریکٹر جنرل نے کہا کہ ایسا کون سا کام آگیا ہے؟ وہ بے چارا سادہ لوح آدمی تھا، تاجر تھا، بازار میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ فلاں مغربی ملک سے جس کا امریکہ سے بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں، بہ ظاہر وہ مغربی ملک امریکہ کی مخالفت کا مظاہرہ کرتا ہے، ان کے ذمے داروں کے بیانات اکثر امریکہ کے خلاف چھپتے رہتے ہیں۔امریکہ کے خلاف ان کے مؤقف کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔دونوں میں بہ ظاہر خاصی کش مکش پائی جاتی ہے۔اسی ملک کے بارے میں پریس والوں نے بتایا کہ فلاں ملک سے بڑا کام آیا ہے، ان کی درسی کتابیں ہم چھاپ رہے ہیں۔ انھوں نے وہ کتابیں اٹھا کر دکھائیں۔یہ سب پشتو اور فارسی میں تھیں اور درسی کتابیں معلوم ہوتی تھیں۔یہ کتابیں جو فروری ۲۰۰۰ء میں وہاں چھپ رہی تھیں، یہ ہمارے ملک میں تیار ہوئی تھیں، اور افغانستان میں مستقبل میں پڑھائے جانے والے اس نصاب کا حصہ تھیں جو امریکی قبضے کے بعد مقبوضہ افغانستان میں نافذ کیا جانا تھا۔جب وہاں امریکی قبضے کے بعد مغربی دنیا کے لئے حالات سازگار ہوگئے، امن وامان کے معاملات ذرا بہتر ہوئے اور وہاں امریکی انتظام میں اسکول کھولے گئے تو وہ کتابیں وہاں پڑھائی جارہی تھیں۔یہ سب درسی کتب ستمبر ۲۰۰۱ء سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھیں۔کتنا پہلے لکھی جا چکی تھیں۔اتنے بڑے حادثے کا کتنا عرصہ پہلے فیصلہ ہو چکا تھا۔یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

جو بات میرے علم اور میرے رفقا کے مشاہدے میں آئی وہ یہ ہے کہ مارچ ۲۰۰۰ء میں وہ کتابیں چھپ چکی تھیں، اور اسلام آباد کے ایک پریس میں چھپ کر وہ تیار ہوئیں۔پھر اچانک ڈرامے کا بقیہ حصہ سامنے آیا، بعض مسلمان ''دہشت گردوں'' نے امریکہ بہادر پر حملہ کردیا۔چند منٹ کے اندر اندر اسامہ بن لادن اس حملے کا ذمے دار قرار پاگیا۔طالبان اس لئے مجرم قرار پاگئے کہ ان کے ملک میں اسامہ مقیم تھا۔طالبان حکومت نے اس کو پناہ دے رکھی تھی۔طالبان کی حکومت بڑی ''ضدی'' تھی۔سب

Marfat.com

بڑے ''نالائق'' تھے۔ طالبان اس ''مجرم'' کو چھوڑتے نہیں تھے۔ لہٰذا طالبان کو ختم کرنا ضروری تھا۔ طالبان افغانستان جیسے پس ماندہ اور تہذیب سے دور ملک میں رہتے تھے، اس بنا پر اس کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ افغانستان جیسا ملک پاکستان کے قریب تھا، اس لئے اس کو بھی تباہ کرنا ضروری تھا۔ یہ سارے کام بعد میں ضروری ہو گئے۔ اس لئے جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے سادہ لوح قائدین Decleared Objectives یعنی اعلان کردہ مقاصد کو سمجھ لیتے ہیں کہ یہی ان کے Real Objectives بھی ہیں۔ حقیقی مقاصد تو پردوں میں رہتے ہیں، فی ظلمت ثلث یا فی ظلمات سبع، وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس کے لئے تو بصیرت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ بصیرت دے تو سمجھ میں آجاتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیات، اور احکام ایسے ہیں کہ ان کی روشنی میں معاملات کو پرکھا جائے تو سمجھ میں آجاتے ہیں۔

یہ ہمارے سامنے صورت حال ہے۔ ہم کسی پر بدگمانی نہیں کرتے۔ لیکن جب مکالمے کی بات ہوگی تو مکالمے کے پس منظر کی بھی بات ہوگی۔ سیاست کی بات ہوگی تو سیاسی تصورات کے مطابق بات ہوگی۔ کسی تہذیبی معاملے پر گفت گو ہوگی تو تہذیبی قواعد و ضوابط کے مطابق ہوگی۔ لیکن ہمیں ایک بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے، جو میں نے عرض کردی کہ مکالمہ مذاہب کے درمیان نہیں ہے اور کوئی مسلمان کسی دوسرے مذہب سے مکالمے کو مکالمہ بین المذاہب نہیں سمجھتا۔ یہ مکالمہ بین اتباع المذاہب ہے۔

لیکن اس مکالمہ بین اتباع المذاہب کا بھی اصل مقصود کیا ہے؟ بعض حضرات کے خیال میں اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان جو مشترکہ مقاصد اور اقدار ہیں ان کی نشان دہی کی جائے۔ بہ ظاہر یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر مشترکہ مقاصد و اقدار مختلف مذاہب میں پائے جاتے ہیں تو ان کی نشان دہی کی جائے، لیکن ان مشترکات کی نشان دہی کیوں کی جائے؟ اور ان مشترکات کی نشان دہی مقصود کیوں ہے؟ اس پر غور کریں تو لگتا ہے کہ یہ امر بھی خطرات سے خالی نہیں ہے۔ یہ مقصد اپنی جگہ بہ ظاہر تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا اس کو کریدیں اور انگریزی محاورے میں اس کو UnPack

Marfat.com

کریں تو اس میں سے ایسے عناصر نکلتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں محتاط ہونا چاہئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب مشترکہ عقائد اور تعلیمات کی نشان دہی کی جائے گی، تو مشترکہ تعلیمات اور مقاصد میں بعض اوقات زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کم از کم مسلمانوں کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ بہ ظاہر مشترک نظر آنے والی دو چیزوں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ خود بہتر جانتے ہوں گے۔ اسلامی شریعت میں مختلف چیزوں کے درجات اور مدارج مقرر ہیں۔ ایک چیز ہے جو مقصدِ شریعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بارے میں کوئی لین دین یا سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔ ایک وہ چیز ہے جو شریعت میں فرضِ عین ہے۔ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے، اس کے بارے میں کوئی دو آرا نہیں ہوسکتیں۔ ایک وہ چیز ہے جو ظنی الثبوت ہے لیکن نص سے ثابت ہے۔ اس کے بارے میں ایک سے زائد آرا ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ ہے جو ظنی الدلالۃ ہے اس کی تعبیر و تشریح کے بارے میں بھی ایک سے زائد آرا ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ چیز ہے مستحبات کی حیثیت رکھتی ہے۔ کچھ چیزیں ہیں جو آداب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کسی مذہب میں آداب کی حیثیت رکھتی ہو، اگر ان کے مذہب میں اس طرح کی درجہ بندی ہو، جب کہ ہمارے یہاں وہ فرائض کے زمرے میں آتی ہو۔ یوں مشترکہ آداب کی نشان دہی میں دونوں چیزیں برابر ہو جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کسی دوسرے مذہب میں صف اول کی حیثیت رکھتی ہو۔ ہمارے نظام میں وہ مستحبات اور آداب کے درجے کی چیز ہو۔ تو اس کا امکان ہے کہ ایک رجحان ایسا جنم لے لے کہ اشتراک کے شوق میں جو آداب اور مستحبات ہیں وہ فرائض کی حیثیت اختیار کر لیں، اور فرائض نظر انداز ہو جائیں۔ دوسرا بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ چیزیں جو شریعت میں مقاصد کا درجہ رکھتی ہیں جو فی نفسہ مطلوب ہیں، فقہا کی اصطلاح میں مطلوب لعینہ ہیں وہ دوسرے مذہب میں کم اہمیت کی حامل ہوں اور تلاشِ مشترکات کے جذبے میں کچھ لوگ ان کی اہمیت کو کم کر دیں۔ ضروری نہیں کہ جو مشترک تعلیمات اور مشترک مقاصد دریافت ہوں۔ ان میں ہمارے سارے مطلوبات لعینہ شامل ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ شریعت میں اگر ۲۰ چیزیں مطلوب لعینہ ہیں تو ان میں سے پانچ

Marfat.com

مشترکات میں آ جائیں، بقیہ پندرہ مشترکات میں نہ آئیں، تو اس کا امکان موجود ہے کہ یہ پندرہ نظر انداز ہو جائیں، اور ان کی اہمیت گھٹ جائے، اور ان پانچ چیزوں کی اہمیت بڑھ جائے، اس ردو بدل کا کسی بھی مسلمان عالم کو حق نہیں ہے۔ اسلام نے کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ جس چیز کو شریعت نے جتنا وزن دیا ہے اس کو اس سے کم وزن دینے کی کوشش کرے۔ جس چیز پر شریعت میں جتنا زور اور جتنا وزن ہے اتنا ہی زور اور وزن دینے کے ہم پابند ہیں۔ نہ اس وزن کو ہم کم کرنے کے مجاز ہیں، نہ زیادہ کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر فقہائے کرام اور حکمتِ شریعت کے ماہرین کو غور کرنا چاہئے کہ اس خطرے کا سد باب کرنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟

اس عمل میں دوسرا بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں بعض اوقات مداہنت کا امکان ہو جاتا ہے۔ مداہنت کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ انسان کا خاصا یہ ہے کہ دوسرے کو خوش کرنے کے لئے وہ بعض چیزوں کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ اس کو اچھی لگے۔ لیکن پیش کرنے کا انداز دوسرے کو مطمئن کرنے کے لئے یا خوش کرنے کے لئے جب شریعت کی ترتیب سے ہٹ کر ہوگا تو اس سے اسلامی تعلیم وتہذیب میں تحریف کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کسی شخص سے مداہنت کی خاطر ایک تعلیم کو ایسے انداز میں یا صیغے میں پیش کر دیا جائے جو اس کے اصل اسلوب سے متعارض ہو یا اس کے خلاف ہو، اور آگے آنے والے اصل اسلوب کو نظر انداز کر کے اس نئے اسلوب کو ہی اصل قرار دے دیں۔

اگر شریعت ہر زمانے کے لئے ہے تو جو شریعت کے علما ہیں ان کی ذمے داری موجودہ نسلیں بھی ہیں۔ ان کی ذمے داری یہ ہے کہ آئندہ نسلوں تک بھی دین وشریعت کو اصل حالت میں محفوظ و مامون طریقے سے پہنچانے کا بندوبست کریں، بل کہ اس بات کو بھی یقینی بنائیں کہ آئندہ ہزار پانچ سو سال بعد بھی کوئی آدمی کسی تحریر، بیان یا کسی رائے یا فتوے سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اگر سلف نے دین وشریعت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ آج ہمارے پاس یہ تفصیل موجود ہے کہ اصل بنیاد کیا ہے؟ اس کو کس نے کتنا پھیلایا؟ کس بنیاد

Marfat.com

پر پھیلایا؟ اس میں تفریعات کتنی ہوئیں؟ ان کی بنیاد کیا ہے؟ مزید تفریعات در تفریعات کتنی ہوئیں؟ ان کی بنیاد کیا ہے؟ آج کا فقیہ اگر جزوی تحقیق سے اختلاف کرے تو اس کے سامنے ہر چیز واضح ہے کہ کس حد تک اختلاف کر سکتا ہے اور کس حد تک نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آج کل کے فقہا کی ذمے داری ہے کہ آئندہ نسلوں تک اسی دیانت اور احتیاط کے ساتھ اس شریعت کو پہنچائیں۔ خلاصہ یہ کہ مشترکات کی نشان دہی میں یہ خطرات ہیں، جن سے ہمیں واقف ہونا چاہئے، اور اس معاملے میں پیش رفت کرنے سے پہلے ان خطرات کا سدباب ہونا چاہئے۔

لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جو لازمی ہیں اور ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو موجودہ کشاکش کی فضا جس کو تعطل کی فضا بھی کہہ سکتے ہیں، یہ ایک کھنچاؤ کی فضا ہے، اس کھنچاؤ میں بڑی حد تک کمی آسکتی ہے۔ اگر اسلام کے صحیح موقف کو بغیر مداہنت کے بیان کر دیا جائے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے، کئی دفعہ کا تجربہ ہے کہ اسلام کے صحیح موقف کو بغیر کسی تردد یا بغیر کسی تامل کے بیان کیا جائے تو اس کا بہت مثبت اثر ہوتا ہے، ماننے والا اس کو سمجھتا ہے اور اس کو Appriciate کرتا ہے۔ اتفاق کرنا یا نہ کرنا تو ہر ایک کے اختیار میں ہے، لیکن ایک مرتبہ انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۱)

جو ہلاک ہونے کا فیصلہ کرے وہ دلیل کی بنیاد پر کرے، اور جو زندہ رہنے کا فیصلہ کرے وہ بھی دلیل کی بنیاد پر کرے۔

اس طرح کی بہت سی غلط فہمیاں دنیائے اسلام میں بھی مغرب کے بارے میں پائی جاتی ہیں اور دنیائے مغرب میں بھی دنیائے اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں۔ اگر وہ غلط فہمیاں دنیائے اسلام میں موجود ہیں اور دنیائے اسلام کے فیصلہ ساز، ان حقائق کی بنیاد پر فیصلے کریں گے وہ فیصلے دینی بھی ہو سکتے ہیں، وہ فیصلے سیاسی امور کے بھی ہو سکتے ہیں، فیصلے ہر طرح کے ہوتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگ یعنی ہر تخصص کے لوگ وہ اپنے میدان تخصص کے دلائل میں فیصلے کریں، علمائے کرام اور فقہائے کرام علمی اور فقہی

۱۔ الانفال: ۴۲

Marfat.com

معاملات میں فیصلے کریں گے اگر ان کے علمی اور فقہی فیصلے غلط معلومات کی بنیاد پر ہوئے تو ان کے دیئے ہوئے جوابات بھی غلط ہوں گے، اگر مفتی کو حقائق معلوم نہ ہوں تو پھر مفتی کا فتوی قابل عمل نہیں ہوگا۔من جهل أهل زمانه فهو جاهل، امام ابو یوسف نے غالباً لکھا ہے کہ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانے کے حقائق کو جانتا ہو، اگر دنیائے مغرب میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں، فقہی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، مسلمانوں کے اجتماعی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، نکاح و طلاق کے قصے ہو رہے ہیں، غیر مسلموں سے میل جول کی نوعیت کے بارے میں سوالات پیدا ہو رہے ہیں، ان سوالات کے جوابات دینے کے لئے وہاں کے مسائل کا جاننا ضروری ہے۔ان سوالات کے جوابات نظری اعتبار سے محض کسی قدیم کتاب میں دیکھ کر بیان کر دینا کافی نہیں ہیں۔ یہ کام تو وہ آدمی خود بھی کر سکتا ہے۔ ہدایہ کا ترجمہ ہر جگہ دست یاب ہے، عالم گیری کا ترجمہ ہر جگہ دست یاب ہے۔ اس کو دیکھ کر آدمی رائے دے دے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے وہاں کے حقائق سے واقفیت خالص دینی اور فقہی معاملات میں بھی ضروری ہے۔ مغرب فہمی، علمی اور فقہی معاملات میں بھی ضروری ہے اور اس کے لئے مکالمہ ایک ضروری میدان فراہم کرتا ہے۔

یہ غلط فہمیاں مغرب میں بھی ہیں اور ہم سے بہت زیادہ ہیں، اس لئے کہ ان کے ہاں باقاعدہ مطالعے کی روایت ہے، تخصص کی روایت ہے۔ یہ روایت ان کے ہاں طویل عرصے سے چلی آرہی ہے، اس لئے وہاں کے محققین جو غلط بیانی کرتے ہیں اس کے اثرات بہت جلد عام ہو جاتے ہیں۔اس لئے ان کی غلط فہمیاں ہمارے مقابلے میں زیادہ ہیں، ہماری غلط فہمیاں نسبتاً کم ہیں۔ان غلط فہمیوں کی وجہ سے کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے تو اس کھنچاؤ میں اگر کمی آجائے اور ایک پر امن بقائے باہمی کا کوئی قابل عمل اور اطمینان بخش تصور سامنے آجائے تو ان مسلمانوں کے لئے بہتر ہے جو وہاں رہتے ہیں، اور ان مسلمانوں کے لئے بھی بہتر ہے جو مغرب سے باہر رہتے ہیں لیکن مغرب سے روزانہ ان کا واسطہ پڑتا ہے۔

تیسری بڑی چیز یا مقصد جو مکالمے میں سامنے رہنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فی

Marfat.com

نفسہ کسی کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، اور کسی سے کوئی ایسا قول یا عقیدہ منسوب نہیں کرنا چاہئے جو اس کا قول یا عقیدہ نہ ہو۔ یہ خود عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ دوسروں سے وہ بیانات اور دعاوی منسوب کئے جائیں جن سے وہ اظہارِ برات کرتے ہوں۔خود قرآن پاک نے اس سے منع کیا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱)

جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو۔

اس لئے میں اگر عیسائیت کا علم نہیں رکھتا تو میں عیسائیت سے وہ عقائد کیوں منسوب کروں جو ان کے عقائد نہیں ہیں، یا ان سے وہ محرکات اور عزائم کیوں منسوب کروں جو ان کے محرکات اور عزائم نہیں ہیں یہ بات اخلاقاً بھی درست نہیں ہے۔قرآن پاک کی تعلیم کی رو سے بھی درست نہیں ہے۔قرآن کہتا ہے:

وَلَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (۲)

اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف ترک کرنے پر مجبور نہ کرے۔

اس کا اندازہ مجھے خود ذاتی طور پر ہوا، میں ایک زمانے تک یہ سمجھتا تھا کہ میں نے مسیحیت کو اچھے طریقے سے پڑھ لیا ہے۔ یہ غلط فہمی میرے دماغ میں گھس گئی تھی اور ہر کم فہم اور کم علم آدمی کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ میں نے بہت پڑھ لیا ہے۔ مجھے بھی اپنی کم فہمی اور کم علمی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ جو کتابیں متداول ہیں۔ بائبل کا ترجمہ انگریزی، اردو اور عام کتابیں، چند مذاہب پر، تاریخ مذاہب پر، مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتب، اس طرح کی بیس تیس کتابیں میں نے دیکھ رکھی تھیں، اس محدود سے مطالعے کی بنا پر مجھے غلط فہمی ہوگئی اور میں یہ سمجھنے لگا کہ میں نے مسیحیت کو کماحقہ سمجھ لیا ہے۔

آج سے کوئی پندرہ، سولہ سال پہلے مجھے ایک مغربی ملک کی ایک معروف

۱۔الاسراء:۳۶

۲۔المائدہ:۸

Marfat.com

یونیورسٹی نے بلایا کہ آپ ۱۵ دن کے لئے ہمارے ہاں ایک لیکچر پروگرام میں بہ طور مقرر شرکت کریں۔ یہ دو ہفتوں کا تربیتی پروگرام تھا جس میں عیسائی پادریوں کو دنیائے اسلام میں بھیجنے کے لئے تیار کیا جارہا تھا۔ وہ لوگ ان پادریوں کو اسلام پڑھانا چاہتے تھے۔ مجھے انہوں نے بلایا۔ میں نے شروع میں تامل کیا۔ لیکن بعض دوستوں اور صائب الرائے بزرگوں نے باصرار مشورہ دیا کہ تمہیں جانا چاہئے۔ میں چلا گیا۔ وہ ۱۵ دن میرے لئے بڑے غیر معمولی ثابت ہوئے۔ مسیحیت کے بارے میں میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ پروگرام کا انداز یہ ہوتا تھا کہ پندرہ بیس بنیادی مسائل کا انتخاب کیا گیا تھا، مثلاً نجات اخروی، وحی والہام، حیات بعد الممات وغیرہ، اس طرح کہ ان میں سے ہر موضوع پر ایک بہت سیر حاصل گفت گو اسلامی نقطۂ نظر سے ہو، ایک سیر حاصل گفت گو عیسائیت کے نقطۂ نظر سے ہو، جو آپ کا نقطۂ نظر ہے وہ آپ بیان کریں، اور شرکا سوال کریں گے۔ شرکا میں ۳۰ پادری تھے، جو تربیت یافتہ تھے، اور اس دو ہفتے کے پروگرام کے بعد مختلف ممالک میں انہیں مقرر کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کا مؤقف اکثر و بیشتر میں ہی بیان کرتا تھا۔ روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں متعلقہ موضوع پر مسلسل اظہارِ خیال کرتا تھا، اس کے بعد وہ عیسائی فاضلین اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے تھے۔ مجھے تھوڑا سا نقصان (Disadvantage) یہ تھا کہ اسلام کا موقف بیان کرنے کے لئے اکثر میں ہی ہوتا تھا۔ سولہ سترہ موضوعات میں سے بیشتر موضوعات پر میں نے ہی اظہارِ خیال کیا۔ عیسائی مؤقف بیان کرنے کے لئے مختلف عیسائی علما اور ماہرین بلائے جاتے تھے، جن میں سے ہر ایک اپنے مضمون کا بہت بڑا ماہر ہوتا تھا۔

ایک دن کی گفت گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر تھی۔ مسلمانوں کا مؤقف حضور ﷺ کے بارے میں بیان کرنا تھا۔ عنوان تھا ''محمدؐ''۔ عیسائی موقف بیان کرنے والی ماہر خاتون کا موضوع تھا ''جیسس کرائسٹ''۔ اس کے لئے ایک خاتون پروفیسر کو بلایا، اس کا نام میں بھول گیا، لوگوں نے بتایا کہ یہ کرسچن تھیالوجی کی سب سے بڑی ماہر ہے، اس سے بڑے ماہر دنیائے مغرب میں بہت کم

Marfat.com

ہیں یا ہیں ہی نہیں۔ جب وہ خاتون آئی تو ابتدائی گفت گو میں ہی اس کے علم وفضل کا اندازہ ہو گیا، اس کی زبان ایسی غیر معمولی تھی کہ میں نے اتنی فصیح و بلیغ انگریزی بولتے کسی کو نہیں دیکھا۔ اتنی روانی کے ساتھ اور اتنی عالمانہ گفت گو اور ادیبانہ زبان میں نے نہیں سنی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بڑی بلاغت کے ساتھ اس نے اپنا مؤقف بیان کیا۔ اس سے بہتر انگریزی میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ میں سمجھتا تھا کہ بروہی صاحب کی انگریزی سب سے زیادہ اچھی ہے۔ میں نے بارہا سنی تھی لیکن وہ ان سے آگے کی معلوم ہوتی تھی۔ اب سچی بات ہے مجھے ذرا خوف محسوس ہوا۔ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (۱) خیال ہوا کہ میں تو اتنے بلیغ اور عالمانہ انداز میں اپنا مؤقف بیان نہیں کرسکتا۔ لیکن جب اس نے گفت گو شروع کی (ہمارے عیسائی بھائیوں سے معذرت کے ساتھ) تو اس نے کہا

Jesus christ is God head, Jesus Christ is a humen being. He is both at the same time. This is a riddle that can not be solved. Let us proseed.

عیسیٰ ایک انسان ہیں، عیسیٰؑ ایک خدا ہیں۔ یہ دونوں بہ یک وقت ہیں، یہ ایک معمہ ہے جو حل نہیں ہوسکتا، اس لئے ہمیں آگے چلنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے دل میں بات ڈالی۔ میری باری آئی تو میں نے کہا

Muhammad is a humen being first. Muhammad is a humen being last. There is no riddle in his life. Let us proceed.

محمد (ﷺ) اول بھی انسان ہیں، محمد آخر بھی انسان ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی معمہ نہیں ہے۔ چلئے آگے چلیں۔

جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان پندرہ دن میں میری بہت سے غلط فہمیاں دور ہوئیں! بہت سے معاملات جو میں سمجھتا تھا کہ عیسائیت کے اس طرح ہیں،

ا۔ طہ: ۶۷۔ ''پھر موسیٰ کو دل میں خوف محسوس ہونے لگا''۔

Marfat.com

اس طرح نہیں تھے۔ بہت ساری کتابیں پڑھنے کے باوجود یہ غلط فہمیاں موجود تھیں۔ اگر یہ غلط فہمیاں مکالمے کے ذریعے دور ہو جائیں تو اچھی بات ہے۔ اس سے علم میں بہتری پیدا ہو گی جو ہونی چاہئے۔ یہ کشاکش جو اس وقت پائی جاتی ہے ختم یا کم ہو جائے گی۔ کشاکش کو ختم ہونا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے جو بالآخر انسانیت کے لئے مفید اور باہمی تعاون کے لئے مدد معاون ثابت ہو۔ انسانیت کو ایک ایسے کشمکش کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جا سکے، جس میں وہ موجودہ تصادم کے نتیجے میں گر سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک بہت بڑی انسانی خدمت بھی ہے۔

ہماری ذمے داری اس بارے میں یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم ایک بین الاسلامی مکالمے کا بندوبست کریں۔ بین الاسلامی مکالمے کے لئے کئی سطحیں ہو سکتی ہیں۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو کلامی مسائل ہیں، ان کے بارے میں مکالمہ ہو اور ایک دوسرے کے موقف کو سمجھا جائے۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں میں اس موضوع پر مکالمہ ہو کہ جب مسلمانوں کا دوسرے مذاہب سے مکالمہ کیا جائے گا تو اس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ مقاصد و اغراض کیا ہوں گے اس کے خطوط کیا ہوں گے؟ جو خطوط یا مقاصد یا طریقہ کار مغرب میں مرتب ہوئے ہیں وہ ہمارے لئے کئی پہلوؤں سے ناموزوں ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مکالمہ طویل عرصے خود مغرب میں آپس میں بھی جاری رہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اصلاحِ مذہب کے نتیجے میں جب مذہبی عقائد کی تدوینِ نو ہوئی اور اصلاحِ مذہب کے نتیجے میں دو بڑے فرقے سامنے آئے، پروٹسٹنٹ مذہب زور و شور سے سامنے آیا تو ان دونوں فرقوں کے درمیان بڑی شدید کشمکش ہوئی، اور ڈھائی تین سو برس میں ایک دوسرے کا قتل و خون ہوا، لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا، اور ہزاروں لاکھوں بے گناہ انسان تہ تیغ ہو گئے۔ اس شدید کشاکش کے نتیجے میں جو رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان ہوئی، بے پناہ نقصانات ہوئے۔ یورپ کی پوری تاریخ ان دردناک تفصیلات سے بھری ہوئی ہے۔ سو سالہ جنگ، تیس سالہ جنگ اور چالیس سالہ جنگ اور پتہ نہیں کون کون سی جنگ۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے ان کو

Marfat.com

خاصی محنت کرنی پڑی۔ اس مکالمے نے بھی انہیں نکلنے میں مدد دی، تو مکالمے کا آغاز یا اصطلاح اس وقت نہیں تھی۔ لیکن تفاہم کا عمل شروع ہوا اور باہمی بقائے باہمی کا ایک نظام بن گیا جو مغرب میں پچھلے سوسوا سو برس سے عموماً ٹھیک چل رہا ہے۔ اب کوئی پچھلے سوا سو برس میں یا ڈیڑھ سو برس میں کوئی بڑی جنگ یا اختلاف، مختلف مذاہب یا فرقوں کے ماننے والوں کے درمیان نہیں ہوا۔ اس عدمِ اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں آپس میں تقسیم کار موجود ہے، اختلافات کے باوجود شکارگاہیں ہیں، ان شکارگاہوں کی آپس میں تقسیم ہوگئی ہے کہ یہ آپ کی شکارگاہ ہے، یہ ہماری شکارگاہ ہے، یہ مغربی دنیا کے طریقے ہیں، یوں مشرقی دنیا بھی ان کی شکارگاہ ہوگئی۔ آپس میں یہ طے ہوگیا کہ جہاں ہم نہ جائیں گے وہاں آپ جائیں گے۔ جیسے سندھ میں ہوتا ہے، سندھ کے بڑے بڑے زمینداروں میں آپس میں یہ غیر تحریری معاہدہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شکارگاہ میں دخل نہیں دیتے، اگر کوئی دیتا ہے تو اس سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ یوں قتل و غارت سے بچنے کے لئے شکارگاہیں آپس میں تقسیم کرلی جاتی ہیں۔ وہاں بھی شکارگاہیں طے ہوگئیں۔ اب اس کے مطابق عمل ہوتا ہے کہ کون سا ملک یہاں کام کرے گا؟ کون فلاں جگہ، کون فلاں جگہ۔

اس طرح کے ماحول میں مکالمے کے جو قواعد تیار ہوئے وہ شاید ہمارے لئے زیادہ بامعنی، نہ ہوں، یا ان کی معنویت ہمارے لئے نسبتاً محدود ہو، اس لئے ہمیں اس کے لئے خود کچھ کام کرنا چاہئے، اور آپس میں تبادلہ خیال کے بعد اس کے قواعد طے کرنے چاہئیں۔ ظاہر ہے جو قواعد دوسروں سے تبادلہ خیال کے نتیجے میں حتمی شکل اختیار کریں گے وہ ضروری نہیں کہ اسلام کے مفاد میں ہوں۔

دو بڑے مذاہب کے ماننے والے مکالمہ کریں گے تو جن قواعد کی بنیاد پر کریں گے، وہ دونوں کے متفق علیہ قواعد ہونے چاہئیں۔ اس معاملے میں تھوڑی سی مثال یا راہ نمائی برصغیر کے تجربے سے مل سکتی ہے۔ برصغیر میں اس طرح کا مکالمہ تو نہیں ہوا جس طرح کا مکالمہ آج درکار ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ اس میدان میں برصغیر میں ہوا ہے۔ یہاں ہمارے اور مغرب کے سابقہ تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے نتیجے میں مکالمے کی ایک فضا بنی۔

Marfat.com

سرسید احمد خان کی مثال اس باب میں نمایاں ہے۔ سرسید احمد خان ہندوستان میں جس زمانے میں کام کر رہے تھے، اس زمانے میں وہ دنیائے اسلام کی مین اسٹریم کے ترجمان نہیں سمجھے گئے۔ ان کے پورے احترام کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مین اسٹریم کا نمائندہ ان کو نہیں سمجھا گیا۔ وہ ایک بہت محدود طبقے کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا تجربہ اہم تھا۔ انگریز سے اور حکمرانوں سے مکالمہ کرنے کا ان کو خوب موقع ملا۔ اس میں انھوں نے بعض اوقات جرأت سے بھی کام لیا۔ جرأت سے کام لینے کی ایک مثال ان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند ہے، جس میں انھوں نے انگریزوں کو یہ بتایا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب کیا تھے؟ مسلمانوں کی ناراضی کے اسباب کیا تھے؟ مسلمانوں کی ناراضی کے اسباب کو دلائل وشواہد کے ساتھ انگریز کے سامنے بیان کرنا واقعی ان ہی کا کام ہے، وہی کر سکتے تھے، اور کوئی کر نہیں سکتا تھا۔

انگریز نے اس پر غور بھی کیا، اس کے نتائج بھی نکلے، کچھ اچھے، کچھ برے۔ بہ ہر حال یہ ایک تجربہ ایسا ہے کہ جو ہمارے سامنے ہے اور جس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔ بعد میں اور حضرات نے بھی اس طرح کے مکالموں میں حصہ لیا اور ان سے کچھ اصول ہمیں ملتے ہیں۔

ظاہر ہے جب مکالمے کی بات ہوگی تو وہ صرف اتباع مذاہب کے درمیان میں ہوگی، یہ مکالمہ جب ہوگا تو ظاہر ہے محض مذہبی معاملات تک محدود نہیں رہے گا، یعنی یہ بھی نہیں ہوگا کہ محض علمائے کرام اور فقہا کا مناظرہ چرچ کے لوگوں سے ہو رہا ہو، بل کہ مکالمہ تو وسیع پیمانے پر ہوگا، سیاسی لوگ سیاست دانوں سے کریں گے، مفکرین مفکروں سے کریں گے، دانش ور دانش وروں سے کریں گے، اخبار نویس اخبار نویسوں سے کریں گے، یوں یہ مکالمہ بہ یک وقت مختلف سطحوں پر ہوگا، مقاصد سب کے سامنے مشترک رہیں گے۔ اصول ومبادی مشترک ہوں گے، طریقۂ کار ملتا جلتا ہوگا، قواعد وضوابط بھی متقارب اور متشابہ ہوں گے، لیکن سطحیں مختلف ہوں گی۔ میدان مختلف ہوں گے۔

اس میدان میں ایک بڑی غلط فہمی جو پیدا ہوتی ہے، اور اس غلط فہمی کے نتیجے میں

Marfat.com

بہت سی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں (وہ بدگمانی حقیقتاً بدگمانی ہے یا اس کے پیچھے کوئی اور منفی محرک ہے اس کا تعین کرنا مشکل ہے) اس بدگمانی کا تعلق ایک اہم سوال سے ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ جب دنیائے اسلام اور دنیائے مغرب آپس میں پرامن بقائے باہمی کریں گے۔ جب پرامن بقائے عالمی کا ایک نقشہ بن جائے گا، اس نقشے کے بنانے میں جو چیز بہت نمایاں اور مؤثر ہوگی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہوگی، جس کے بارے میں کچھ نہ کچھ طے کئے بغیر بتائے بقائے باہمی مشکل معلوم ہوتی ہے، وہ دو باتیں ہیں۔ کچھ چیزیں تو وہ ہیں کہ جو مسلمانوں کے نزدیک، مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے ان کے دین اور مذہب اور تہذیب کی Core ہیں یعنی مسلمانوں کے عقیدے کی صمیم میں شامل ہیں، اساس اور بنیاد میں شامل ہیں جس پر مسلمان کبھی بھی مصالحت نہیں کرسکتا، اس میں کوئی سودے بازی یا دو آرا نہیں ہوسکتیں، لیکن اہل مغرب کے نظر میں وہ محض ایک رائے یا محض نظریات ہیں اور قابل تغیر ہیں۔ اب ظاہر ہے یہ دو بالکل متعارض موقف ہیں ان کو ایک دوسرے کے قریب کیسے لایا جائے۔ بعض معاملات ایسے ہیں، جن پر بحث ہوتی رہتی ہے۔ اب مسلمان نمائندے جو عام طور پر ان کے سیاسی حکم راں ہوتے ہیں، ان کا رویہ ایک معذرت خواہانہ سا ہوتا ہے۔ ان کا انداز مغربی اعتراضات کے جواب میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جی ہاں یہ بات آپ کی صحیح ہے، لیکن ہمارے مولوی نہیں مانتے۔ کیا کریں ہمارے عوام جاہل ہیں، عوام کو علم نہیں ہے، نالج نہیں ہے۔ مغربی تعلیم پھیلے گی تو ماحول خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بات کہہ کر وہ معاملہ ٹال دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوتا، وہ دلائل نہیں دے سکتے، قائل نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ اس طبقے میں اسلام کو پوری طرح سمجھنے والے اور اس پر اعتماد رکھنے والے قریب قریب ناپید ہیں۔

مسلمان علما سے بات ہوتی ہے تو وہ شرح وقایہ کے انداز کے دلائل دیتے ہیں جو آج کے بازارِ استدلال میں چلتے نہیں ہیں، وہ اس زمانے کا سکہ رائج الوقت نہیں ہیں۔ یہاں خدانہ خواستہ شرح وقایہ کی توہین یا تخفیف مقصود نہیں ہے لیکن ہر دور کا ایک محاورہ یا Formulation ہوتی ہے۔ ہر دور کی زبان الگ ہوتی ہے۔ استدلال کا انداز الگ

Marfat.com

ہوتا ہے۔ جس دور میں آپ استدلال کر رہے ہیں اس دور کے محاورے میں بات کریں گے تو آپ کے استدلال میں وزن ہوگا۔ قدیم انداز استدلال سے بات نہیں بنتی۔ قدیم انداز کا استدلال اور قدیم محاورہ اب لوگوں کو سمجھ نہیں آتا، یوں وہ محاورہ چلتا نہیں ہے، اس سے مسلمان ہی قائل نہیں ہوتا، غیر مسلم کہاں قائل ہوگا؟ مسلمان بھی اگر صاحب ایمان ہے تو خاموش ہو جاتا ہے اور دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ ٹھیک ہے، کوئی بات ہوگی، میں چپ ہو جاتا ہوں۔ اب اگر اس کا ایمان کم زور ہے تو اس کے دماغ میں خلش شروع ہو جاتی ہے۔ دو خانے بن جاتے ہیں، ایک اس کی دانست میں غیر عقلی مذہب کا خانہ، دوسرا عقلی خانہ، جدیدیت کا خانہ۔ ان دونوں خانوں کے مابین مسلسل کشاکش جاری رہتی ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف غلط ہے بل کہ یہ اسلام کی یا مسلمانوں کی خدمت نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات بڑی اہم ہے کہ مسلمانوں کے ذہن اس طرز استدلال کے بارے میں صاف ہوں کہ کیا چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی اور اسلام کی اساس سے تعلق رکھتی ہیں، اور کیوں؟ ان کی علمی تشریح یا عقلی تاویل کیا ہے؟ دوسری وہ چیزیں ہیں جو Core یا صمیم سے تعلق نہیں رکھتیں لیکن مسلمانوں کی روایت کے تسلسل کی نمائندہ ہیں۔ روایت کا تسلسل ختم کرنا کوئی قوم گوارا نہیں کرتی تو ہم کیوں گوارا کریں۔ انگریز گوارا نہیں کرتا تو ہم کیوں گوارا کریں۔ وہاں چھوٹی چھوٹی روایت کی پابندی ہوتی ہے۔

میری زیادہ دل چسپی قانون سے ہے تو میں اکثر اس حوالے سے چیزیں نوٹ کرتا رہتا ہوں۔ اہلِ مغرب کے ہاں بعض روایات بہت عجیب ہیں۔ قدیم ترین پارلیمنٹ برطانیہ کی بتائی جاتی ہے (ہوگی قدیم ترین۔ وہ یہی دعویٰ کرتے ہیں) اس کی نوعیت آغاز میں یہ تھی کہ جب بادشاہ ٹیکس لگایا کرتا تھا تو لوگ یہ ٹیکس دینے کو آسانی سے تیار نہیں ہوتے تھے۔ بڑے بڑے زمین دار اور جاگیردار اس غرض کے لئے دارالحکومت آیا کرتے تھے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ کو قائل کریں کہ وہ زیادہ بھاری ٹیکس نہ لگائے یا کم لگائے۔ وہ کہتا تھا زیادہ لگاؤں گا، یوں ہر سال ٹیکس کے موقع پر، خاص طور پر اس وقت جب فصل کٹتی تھی، تو ملک کے اطراف سے زمین دار اور جاگیردار لوگ آیا کرتے تھے۔ بادشاہ کے پاس جو

Marfat.com

بات کرنے آتے تھے وہ مل کر ایک بڑے گروہ کی صورت میں آیا کرتے تھے۔ بات کرنے کو پارلے کہتے تھے۔ پارلے کے معنی ہی ہیں دراصل بات کرنا۔ پارلیمنٹ کا مطلب وہ جگہ جہاں بات کی جائے۔ یعنی المکان الذی یتکلم فیہ۔ یہ پارلے سے نکلا ہے۔ وہ ہر سال بادشاہ سے بات کرنے جاتے تھے۔ اس سے پارلیمنٹ کا تصور پیدا ہوا اور یوں سالانہ پارلیمنٹ ہوتی تھی۔ یہ اس کا آغاز ہے۔ ایک مرتبہ کوئی بادشاہ تھا، وہ اس طرزِ عمل سے ناخوش ہوا، اور وہ ناخوش ہوا تو جہاں لوگ جمع ہو کر مشورہ کر رہے تھے کہ یہ بات کریں گے وہ غصے میں وہیں پہنچا اور جا کر ان کو فوج کے ذریعے منتشر کرنا چاہا اور عمارت کا دروازہ ہتھوڑا مار کر توڑ دیا۔ گویا بادشاہ نے ہتھوڑے سے پارلیمنٹ کا دروازہ توڑ دیا اور ان کو بھگا دیا۔ اب جب پارلیمنٹ ٹوٹتی ہے تو ایک خوب صورت سا ہتھوڑا اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں، آپ کے ہاں بھی، پارلیمنٹ میں جا کر دیکھیں تو اسپیکر کی میز پر ایک چھوٹا سا ہتھوڑا رکھا ہوتا ہے، جب پارلیمنٹ ٹوٹتی ہے تو اسپیکر وہ ہتھوڑا اٹھاتا ہے اور شیشے پر ہتھوڑا ہلکے سے ٹک کرتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پارلیمنٹ آج سے ٹوٹ گئی، اس لئے کہ بادشاہ نے ہتھوڑا مار کر دروازہ توڑ دیا تھا۔

ایک روایت وہاں یہ بھی ہے کہ جب اسپیکر کا انتخاب ہوتا ہے تو اسپیکر خود جا کر وہاں نہیں بیٹھتا، وہ اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہتا ہے، پارلیمنٹ کے ارکان میں سے چار پانچ آدمی آتے ہیں، اور اس کو زبردستی اٹھا کر وہاں سے لے جاتے ہیں اور اسپیکر کی سیٹ پر لے جا کر بٹھاتے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب وہ لوگ ایک مرتبہ کسی سخت گیر بادشاہ کے ہاں بات کرنے کے لئے جانے لگے تو بادشاہ کے سامنے بات کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ وہ خود کوئی بات نہ کرے، بل کہ کوئی دوسرا شخص بات کرلے۔ جس شخص کے بارے میں سب نے طے کیا کہ وہ بادشاہ کے روبہ رو بات کرے گا، اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کو زبردستی اٹھا کر لے گئے کہ جا کر بادشاہ سے بات کرے۔ اب چوں کہ یہ زبردستی لے گئے تھے تو اس روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اسپیکر ہوتا ہے از خود اپنی نشست پر جا کر نہیں بیٹھتا بل کہ دو تین آدمی آ کر

Marfat.com

اس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس وقت اسپیکر بات کرتا تھا، اب اسپیکر بات نہیں کرتا، مگر اسی پس منظر کی وجہ سے اس کا نام اب بھی اسپیکر ہے۔ جو بالکل نہیں بولتا اس کو اسپیکر کہتے ہیں۔ جو پورے پانچ سال بولتا رہتا ہے وہ اسپیکر نہیں کہلاتا۔ اس لئے کہ اس وقت اسپیکر ان کے حق میں بات کرتا تھا۔ یہ گویا روایت ہے، تسلسل ہے روایت کا۔ ان کے ہاں تو یہ روایت ہے اور آج تک موجود ہے اور ہمارے ہاں بھی استعمال ہو رہی ہے۔ خوشی سے لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن ہماری اپنی ہر روایت کو ختم کرنے کے لئے ہر وقت نہ صرف مغرب تیار رہتا ہے، بل کہ خود بہت سے اہلِ مشرق بھی آمادہ رہتے ہیں کہ آج مغرب کا اشارۂ ابرو ہو اور روایت بدل دی جائے۔ کہتے ہیں کہ روایت میں کیا رکھا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اپنی روایت پر دنیا کی ہر قوم کار بند رہتی ہے۔ اس کی تاریخ کا تعلق روایت سے ہوتا ہے، اس کی ہر چیز کا دارومدار روایت پر ہوتا ہے۔ روایت قوم کا حافظہ ہے۔ اس لئے جو چیز مسلمانوں کی روایت ہے اور تسلسل سے ثابت ہے، تعامل امت کے ذریعے چلی آرہی ہے، اس کے بارے میں مسلمانوں کو آسانی سے سمجھوتا نہیں کرنا چاہئے۔

روایت کے بعد وہ چیزیں ہیں جو وقتی رائے یا انفرادی اجتہاد کی حیثیت رکھتی ہیں، یا جن کا تعلق عرف سے، یا مقامی رواج یا ماضی میں مقامی مصلحت سے تھا، آج وہ مصلحت بدل گئی یا اس کو کسی وسیلے کو طور پر اختیار کیا گیا۔ آج اس سے بہتر وسیلے وجود میں آگئے، اس طرح کی چیزوں کو بدلنے میں مسلمانوں کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن موضوعات کی یہ تقسیم اور ان کی درجہ بندی فقہائے کرام ہی کریں گے۔ یہ فیصلے علمائے کرام ہی کریں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے ان ترجیحات اور درجہ بندیوں کا تعین ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر مکالمے کی بات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے کنفیوژن یا غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ بعض اصطلاحات جن کی حدود ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں ان کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر دنیائے اسلام میں اس بات پر تقریباً اتفاق رائے ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھایا جائے اور زندگی کی مادی سہولتوں کو اختیار کیا جائے۔

Marfat.com

جب اس فیصلے پر عمل درآمد ہوتا ہے تو اس کی حدود ماڈرنائزیشن سے جا ملتی ہیں۔ یہاں بہت سے حضرات کا خیال یہ ہے کہ ماڈرنائزیشن کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام ماڈرنائزیشن کو نہیں روکتا۔ یہ بات ترکوں نے سب سے پہلے کہی۔(۱) سب سے پہلے آج سے کوئی دو سو سال قبل ترکوں نے طے کیا کہ ماڈرنائزیشن کو قبول کرنے میں کئی حرج نہیں۔ لیکن ماڈرنائزیشن سے مراد اگر یہ ہو کہ جو تجربات دنیائے مغرب میں ہوئے ہیں، انتظامات کے سلسلے میں، فوج کے نظم ونسق کے سلسلے میں، ذرائع مواصلات کی شکل میں، پرنٹنگ پریس کی شکل میں، یا کسی ہتھیار کی تیاری کی شکل میں، یا فوجوں کی ترتیب وتنظیم کی شکل میں، اور وہ اچھے ثابت ہوئے اسے مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اس میں تو کوئی اختلاف آج بھی نہیں کرتا، لیکن جب یہ ماڈرنائزیشن کا عمل آگے بڑھتا ہے تو ایک مرحلہ ایسا آتا ہے، جہاں ماڈرنائزیشن ختم ہو جاتی ہے اور ویسٹرنائزیشن شروع ہو جاتی ہے۔ ویسٹرنائزیشن سے مراد یہ ہے کہ مغربی دنیا میں جو طور طریقے رائج ہیں، مغرب سے مراد ایک اور گفت گو میں بھی عرض کیا تھا، جغرافیہ نہیں بل کہ تہذیب ہے۔ اس تہذیب کی حد میں آپ داخل ہو جائیں، ممکن ہے اس میں کچھ چیزیں قابل قبول ہوں۔ لیکن اب آپ ایک ایسے علاقے یا دائرے میں داخل ہو گئے، جو پہلے کی طرح واضح اور بے خطر نہیں ہے۔ جس طرح پہلا علاقہ واضح اور صاف تھا، یہ علاقہ اتنا صاف نہیں ہے۔ پہلے علاقے کو آپ قبول کر رہے تھے، وہاں محض وسائل کی بات تھی، وہ آپ نے اختیار کر لئے۔ گویا آپ مناسب سواری کی تلاش میں تھے، ایک طرف اونٹ کھڑا تھا، ایک طرف تیز رفتار ترکی گھوڑا کھڑا تھا، ، ایک طرف کار تھی، ایک طرف ہوائی جہاز کھڑا تھا، آپ بلا تامل ہوائی

---

(۱)۔ ایک ضمنی بات یہاں عرض کردوں کہ ترکوں کی تاریخ کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ اگرچہ ہم میں ترکی جاننے والے تقریباً ناپید ہی ہیں اور ترکی تاریخ کے اصل مصادر تک رسائی بہت مشکل ہے، لیکن پھر بھی ہمیں ترکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مغربیت سے جو واسطہ یا احتکاک ترکوں کا طویل ترین رہا ہے! اس کے اثرات بھی بڑے گہرے ہوئے، ان اثرات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنے کے لئے ترکی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔

Marfat.com

جہاز میں بیٹھ گئے، کوئی تامل نہیں کرنا پڑا۔ لیکن اب بعد میں آپ ایک ایسی حد میں داخل ہو گئے جہاں ایک ہی چیز میں کئی پہلو ہوں گے، اب آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا لینا ہے اور کیا چھوڑنا ہے۔ مثلاً آپ کھانے کی میز پر گئے وہاں شربت بھی رکھا ہوا ہے، زمزم بھی رکھا ہوا ہے، شراب بھی رکھی ہے، گوشت بھی کئی طرح کا رکھا ہے، ایک مسلمان ذبیحے کے نتیجے میں آیا، ایک پورک ہے، ایک کچھ اور ہے۔ لیکن اب وہاں آپ کو انتخاب کرنا پڑے گا۔ وہ پہلے کی طرح آسان اور سادا بات نہیں ہوگی۔ یوں آپ ویسٹرنائزیشن کے ایریا میں داخل ہو گئے۔

ویسٹرنائزیشن کی حد جہاں پر ختم ہوتی ہے وہاں سے کرسچینائزیشن شروع ہو جاتی ہے، جیسا کہ دنیائے افریقہ میں ہوا کہ پہلے ماڈرنائزیشن کے نام سے کام شروع ہوا، پھر ویسٹرنائزیشن آگئی، پھر بات کرسچینائزیشن میں داخل ہوگئی کہ آپ عیسائیت میں داخل ہو جائیں۔ کرسچینیٹی جب ختم ہوتی ہے تو امپیریل ازم آجاتا ہے۔ یہ حدیں بہت نازک اور غیر واضح ہیں۔ یہاں حدود کی پابندی بڑی دشوار ہے اور یہ کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے کہ کب کون سی حد شروع ہوگئی۔ یہ تو خود ہی اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عقل اور فہم دے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں سے فلاں حد شروع ہوگئی۔ یہ فیصلہ ہمارے ترک قائدین نے نہیں کیا اور وہ ایک لامتناہی دوڑ میں چلتے گئے، چلتے چلے گئے اور یہ دوڑ وہاں تک چلی گئی جہاں تک شاید وہ لے جانا نہ چاہتے ہوں، یا ان میں سے بہت سے نہ چاہتے ہوں۔ ترک قوم کا بہت سا حصہ وہاں تک جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے غیر معمولی تیقظ اور غیر معمولی بصیرت اور بیداری کی ضرورت ہے۔

عرب کا شاعر طرفہ بن عبد اپنی تعریف میں کہتا ہے، اور جو منظر بیان کرتا ہے وہ مجھے بڑا پسند آتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میں ایسا بیدار ہوں کہ ہر لمحے چوکنا رہتا ہوں خشاش کراس الحية المتوقدی جیسے ایک بیدار سانپ ہوتا ہے، پھن اس کا اس طرح سے کھڑا رہتا ہے کہ کدھر سے مخالف آرہا ہے اور جدھر سے مخالف آرہا ہے ادھر سے وہ اس پر حملہ کرے گا۔ اس طرح سے میں بیدار رہتا ہوں، اس طرح سے بیدار رہنے

Marfat.com

والے قائدین اگر ہوں تو ضرور ان حدود میں داخل ہوں اور جو اس طرح بیدار نہ ہوں، ان کو کیا کرنا چاہیے؟ ان کو ہم یا تو بیدار کر سکیں، اور اگر بیدار نہ کر سکیں تو ان کے اس حد میں جانے کا راستہ روکیں۔ اس لئے جس چیز کو ماڈرنائزیشن کہتے ہیں، جس کی قبولیت پر تقریباً اتفاق ہے، اس کی حد جا کر ملتی ہے ویسٹرنائزیشن سے، جس کے بارے میں اختلاف ہے، مسلمانوں کی اکثریت اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہے، کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کو بھی تیار ہیں، قائدین خاص طور پر، سیاسی قیادتیں اور دوسری قیادتیں، لیکن کرسچنائزیشن کو وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نہیں قبول کرتے۔ بہت کم ہوں گے، اکادکا، ہزار میں ایک دو، وہ اس کو بھی قبول کرنے کو تیار ہوں گے، لیکن امپیریل ازم کو قبول کرنے کو شاید وہ بھی تیار نہ ہوں۔ لہٰذا یہ ایک ایسا طویل عمل یا کہ سفر ہے جس کے بارے میں یہ تو اتفاق ہے کہ اس کا آغاز کرنا چاہیے، لیکن یہ اتفاق رائے کہ یہ سفر کہاں رک جانا چاہیے اور کہاں احتیاط سے کام لینا چاہیے، یہ ابھی تک پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اس پر بات ہونی چاہیے۔

گزشتہ ۳۰، ۵۰ سال سے جب سے مکالمہ شروع ہوا ہے، میرا تاثر یہ ہے کہ اس میں پہل چرچ نے کی ہے۔ ہمیشہ چرچ نے پیش قدمی کر کے مکالمے کی دعوت دی ہے۔ ایسے کسی مکالمے کی پہل یا **Intiative** دنیائے اسلام کی طرف سے قابل ذکر نہیں، اکادکا مثالیں ضرور ہیں، ایک دو میں میں بھی شریک ہوا تھا، لیکن زیادہ تر **Initiatiave** مغرب ہی کی طرف سے ہوا ہے، اور مغرب میں بھی چرچ کی طرف سے اور چرچ میں بھی خاص طور پر رومن کیتھولک چرچ کی طرف سے۔ اس مکالمے کی اب تک جو مثالیں میرے سامنے آئیں اگرچہ میں نے اس پر زیادہ نہیں پڑھا مگر جو مثالیں میں نے دیکھیں یا جو واقعات میں نے سنے وہ اکثر وہ معاملات ہیں جن پر اہل مغرب اہل اسلام کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں۔

سب سے پہلا مکالمہ جس کی تفصیل میں نے پڑھی وہ غالباً ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اور جو لوگ اس میں شریک ہوئے ان میں سے ایک دو سے مجھے تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا، اس کی روداد بھی میں نے پڑھی۔ یہ روداد انگریزی میں مطبوعہ دستیاب ہے۔ اس مکالمے میں بعض عرب ممالک کے فضلا شریک ہوئے، اور رومن کیتھولک

Marfat.com

چرچ کے نمائندے شریک ہوئے، یہ مکالمہ ویٹی کن میں ہوا۔ اس میں جو مسائل اٹھائے گئے، وہ اس نوعیت کے تھے، مثلاً حدود کے قواعد، شریعت میں انسانی حقوق، عورت کا مقام اور مرتبہ، ریاست اور مذہب کا تعلق، مسلمانوں کی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق، مذہبی تعلیم کے ادارے خاص کر مدارس اور مدرسہ، ٹیرر ازم اور دہشت گردی، یہ مسائل ہیں، جن پر اکثر مکالمہ ہوا ہے۔ اس میں مسلمان علما کثرت سے آتے جاتے رہتے ہیں، اور انہوں نے مکالمے میں حصہ لیا۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ مسلمان علما مکالمے میں کیوں گئے؟ ضرور جانا چاہئے، لیکن یہ بات ہمیشہ مجھے سوال پر مجبور کرتی رہتی ہے کہ یہ سوالات اسلام ہی کے بارے میں کیوں ہوں؟ کیا اسلام ایک ملزم اور متہم ہے جو اپنی صفائی پیش کرے۔ گویا اسلام ایک مجرم ہے جس پر بہت سارے الزامات لگائے گئے ہیں، اور ایک مشترکہ کمیٹی ان الزامات کا جائزہ لے، مسلمان علما اپنا دفاع کریں، اور مغربی فضلا وعلما بیٹھ کر اس دفاع کا جائزہ لیں اور طے کریں کہ وہ اس دفاع سے مطمئن ہیں کہ نہیں۔ یہ تصور یا تاثر میرے خیال میں مسلمانوں کے وقار اور اسلام کی شان کے خلاف ہے، یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ایسے مکالمے کی نوعیت یہ ہو سکتی ہے کہ مثلاً دونوں مذاہب میں فلاں بنیادی حکم ہے تو ان کے ہاں کیا تصور ہے، ہمارے ہاں اس کا کیا تصور ہے۔ وہ مسلمان جو مغرب سے واقف ہیں، وہ تعین کریں کہ آپ کے ان معاملات پر ہم مکالمہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس میں مسلمانوں کی طرف سے وہ لوگ شریک ہوں جو ان معاملات پر مسلمانوں کے نقطۂ نظر یا تحفظات کو بیان کر سکیں، اور وہ اپنے تحفظات بیان کریں۔ لہٰذا یا تو مذہبی مسائل دونوں طرف سے ہوں یا پھر وہ مسائل مکالمے کا موضوع ہوں جو دونوں کے مستقبل اور مشترک مقاصد کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہ بات اس لئے اہم ہے کہ آپ کی اہل مغرب سے کن موضوعات پر، کن مسائل پر گفت گو ہونی چاہئے یہ امور پہلے سے طے کرنا ضروری ہیں۔ موجودہ صورت حال میں اسلام کی حیثیت ایک مستقل ملزم کی بنا دی گئی ہے جو اپنا مؤقف بیان کرنے کے لئے کبھی اس عدالت میں، کبھی اس عدالت میں پیش ہو رہا ہے اور

Marfat.com

کسی عدالت میں اس کی شنوائی ہوتی نظر نہیں آرہی۔ جیسا آج کل ہو رہا ہے۔

- اگر یک ساں سطح پر باعزت تبادلہ خیال کرنا مقصود ہے تو یہ دونوں طرف سے ہونا چاہئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اہل مغرب کے ہاں قابل غور یا قابل تحفظ چیزیں نہیں ہیں۔ ایسی چیزیں ان کے ہاں بے شمار ہیں جن پر مسلمانوں کو شدید تحفظات ہیں۔ ان کے بارے میں اہل مغرب کو بتانا چاہئے کہ ان کا دفاع ان کی نظر میں کیا ہے۔ مسلمانوں کو سیکولرازم پر تحفظات ہیں۔ مذہب اور ریاست کی تفریق کا تصور مسلمان نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کو قانون اور اخلاق میں جو دوری اور علیحدگی ہے اس پر تحفظات ہیں۔ مسلمانوں کا خاندانی ادارہ جو وہاں تباہ ہو رہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔ بغیر شادی کے رہنے والے جوڑوں کی تعداد ۶۰ فیصد ہوگئی ہے، مسلمان اس کو غیر اخلاقی سمجھتے ہیں، اس پر غور ہونا چاہئے۔ یہ انسانیت کا ایک مشترکہ مسئلہ ہے۔ بعض ممالک میں خودکشیوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے، جن ممالک میں خوش حالی بہت زیادہ ہے۔ وہاں تو خودکشیاں بہت زیادہ ہیں۔ کئی بڑے ممالک ایسے ہیں جہاں ہر دو سیکنڈ کے بعد عورت کے ساتھ ظلم ہوتا ہے، بدکاری ہوتی ہے، زنا بالجبر ہوتا ہے۔ اس پر بات ہونی چاہئے۔ اس پر کوئی بات نہیں کرتا، آپ کے ہاں مختاراں مائی کو کوئی پکڑ کر لے جائے تو پوری دنیا ہل جاتی ہے اور وہاں ہر دو سیکنڈ بعد ایک عورت کے ساتھ زنا بالجبر ہوتا ہے کوئی نہیں پوچھتا۔ یوں تو یہ ساری بات یک طرفہ ہو جاتی ہے۔

ان سب امور پر مسلمانوں کو غور کر کے یہ طے کرنا چاہئے کہ مجوزہ مکالمے کے مسائل کیا ہونے چاہئیں، اور مسائل و موضوعات کے تعین کا مقصد یہ ہو کہ سب فرق ایک دوسرے کے مؤقف کو سمجھ لیں، نہ یہ کہ ایک فریق کو مکمل طور پر قفسِ اتہام میں یا کٹہرے میں بہ طور ملزم کے کھڑا کیا جائے اور مسلمان مسلسل پچاس پچاس سال مستقل جواب دہی کرتے رہیں، اور ڈائیلاگ کے نام سے اپنے دفاع میں مصروف رہیں، جیسا کہ گزشتہ دو سو برس سے ہو رہا ہے۔ پہلے یہ سلسلہ استشراق کے نام سے جاری تھا، اس سے پہلے کسی اور نام پر چلتا رہا، اگر یہ سلسلہ لامتناہی طور پر رہے گا تو تعطل بھی جاری رہے گا، تعلقات میں کشاکش بھی قائم رہے گی، معاملات کے چلانے میں اور مستقبل کی نقشہ کشی کرنے میں

Marfat.com

رکاوٹیں قائم رہیں گی۔ اس لئے اگر سنجیدگی سے مستقبل کی نقشہ کشی کرنا مقصود ہے، تو وہ متفقہ خطوط پر ہونی چاہئے۔

جب مکالمے کی بات آتی ہے تو ایک بات پر سب مذاہب کے ماننے والوں کے مابین اتفاق ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی ایسے مقاصد ہیں جو تمام مذاہب کے مشترک مقاصد ہیں، اور کسی مذہب کو اس کے مقصد ہونے میں کوئی تامل نہیں ہے تو ایسے مقاصد پر تبادلۂ خیال، اتفاق رائے اور تعاون ہوسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال حلف الفضول بھی ہے، جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

ولو دعیت الیه فی الاسلام لاجبت (۱)

اگر حلف الفضول جیسے کی معاہدے کے لئے مجھے بلایا جائے گا تو میں یہ دعوت ضرور قبول کروں گا۔

یہ تو حدیث سے ثابت ہے لیکن خود قرآن میں کلمۂ سواء کی دعوت ہے:

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (۲) اور کلمۂ سوا پر اتفاق رائے ہو جانے کے بعد پھر کلمۂ سوا ہی مقصود نہیں ہے پھر تین مقاصد اور بھی ہیں جو آیت میں مذکور ہیں۔ اگر اس طرح کے مقاصد ہوں جو تمام مذاہب کے درمیان واقعی مشترک ہوں تو ان کے لئے تعاون اور تعاون کے لئے مکالمہ ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ تعاون اور مکالمے کی بنیاد مقاصد ہوں گے تعلیمات نہیں۔ مقاصد اور تعلیمات میں فرق ہے۔ مقاصد اگر ایک ہیں، اہداف اگر ایک ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ اہداف میں سے اگر دو مشترک ہیں تو ان دو کے لئے کام ہوسکتا ہے، ان اہداف کے لئے کام ہونا چاہئے، ان میں سب سے بڑا ہدف توحید اور انسانی آزادی کا ہدف ہے۔ توحید کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ انسان ہر قسم کے تعصبات سے آزاد ہو، انسان ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو، انسان ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے آزاد ہو۔ یہ وہ

۱۔ سہیلی: الروض الانف: ج ۱، ص ۱۵۶

۲۔ آل عمران: ۶۴

Marfat.com

مقاصد ہو سکتے ہیں، جن پر دنیائے اسلام حصہ لے سکتی ہے اور مستفید ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں آداب مکالمہ کچھ تو وہ ہیں جو عمومی قسم کے ہیں، ہر قسم کے مکالمے کے لئے ضروری ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خاص اس طرح کے مکالمے میں محدود معاون ہو سکتے ہیں۔

ا۔ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا (۱) کا تقاضا ہے کہ عدل وانصاف کا دامن کسی صورت ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے، عدل وانصاف کا دامن تو دشمن کے معاملے میں بھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ لہٰذا ایک ایسے پرامن مکالمے یا ڈائیلاگ میں جہاں مقصد ہی تفاہم اور ہم آہنگی ہو، وہاں عدل وانصاف کا دامن بالکل ہی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس لئے مکالمہ چاہے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں سے ہو، حتیٰ کہ یہودی مذہب کے ماننے والوں سے بھی، جن سے مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کافی نمایاں ہے، عدل وانصاف مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین آج بھی ایک بڑا الاینحل مسئلہ موجود ہے، جس کی وجہ سے تعلقات ایک تعطل اور کشمکش کا شکار ہیں، اس کے باوجود بھی شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہودیوں سے معاملہ کرتے ہوئے عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔ عدل کا معاملہ تو آخرت کی جواب دہی میں بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اصل بنیاد جو قرآن نے مسلمانوں کو بتائی ہے وہ عدل ہے، وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا اور قول میں عدل پر کاربند ہونا بڑا مشکل ہے، طرزِ عمل میں عدل تو نسبتاً آسان ہے، اس لئے کہ سب کو نظر آجاتا ہے، قول میں عدل کا ذرا مشکل سے احساس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس کے جو جی میں آتا ہے کہہ دیتا ہے، اور پھر اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا، یہ بات کہ زبان سے نکلنے والا ہر لفظ لکھا جارہا ہے اور ہر لفظ کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے، یہ بات تو قرآن پاک نے بتائی ہے۔ شاید دیگر آسمانی کتابوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہئے۔

ا۔ الانعام: ۱۵۲

۲۔ الاحزاب: ۷۰

Marfat.com

۲۔ قول سدید کہنا چاہئے۔ قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا (۲) کسی پر طنز کرنا یا کوئی ایسی چیز کسی سے منسوب کر دینا جو اس کا موقف نہ ہو درست نہیں ہے۔ اکثر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زور بیان میں ہم ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو فریق ثانی کا موقف نہیں ہوتیں۔ اور وہ یہ بات نہیں کہتے۔ اس لئے محض زور بیان کے خاطر یا اپنے عقیدت مندوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ایسی بات کہنا، جو دوسرے مذہب کا عقیدہ نہیں ہے یا اس کی تعلیم نہیں ہے یہ قرآن پاک کے حکم کے خلاف ہے۔

۳۔ بعض اوقات علم نہیں ہوتا لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ بہت سی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہوتی ہیں، یہ بھی قرآن کریم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (۱) حدیث میں بھی اس کی ممانعت آتی ہے۔ یہ ایک طرح کی گواہی ہے۔ میں بدھ مت پر ایک کتاب لکھوں یا تقریر کروں اور ایسی باتیں ان سے منسوب کر دوں جو انھوں نے نہیں کہیں تو یہ جھوٹی گواہی ہے اور قول زور ہے، اور قرآن پاک، حدیث و سنت کے خلاف ہے۔

۴۔ پھر ایک بڑی بات یہ ہے جو اسلام کے آداب میں بتائی گئی ہے اور خود مسلمانوں کے آداب کلام میں بھی شامل ہے۔ قرآن سے ہٹ کر اور شریعت سے ہٹ کر بھی مجرد آداب کلام کا حصہ ہے۔ لکل مقام مقال ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے کہ وہاں کیا بات کہی جائے اور کیا نہیں۔ اس کا لحاظ مناظرے میں نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ دور انحطاط میں مناظرے کا رنگ خاصا حقی انداز کا ہو گیا تھا۔ مناظرانہ شدت میں ایسی باتیں آجاتی تھیں جو فریق مخالفین کی دل آزاری کا باعث بنتی تھیں۔ دل آزاری کا باعث نہ بھی بنیں تو اس کو کم از کم آپ کے قریب لانے میں معاون نہیں ہوتی تھی۔ ایسے مناظروں سے دوری پیدا ہوتی تھی۔ جب کہ مکالمے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوں، ایک دوسرے کو سمجھیں، اور وہ مشترک مقاصد کے لئے تعاون پر آمادہ ہوں۔

ان خطوط پر کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیائے مغرب کو ایک چیز ہمت،

۱۔ الاسراء: ۳۶

Marfat.com

صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ بتائی جائے۔ ان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ڈائیلاگ کی یا مکالمے کی کام یابی کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ باعزت طور پر دوسرے کا یہ حق تسلیم کریں کہ وہ آپ سے مختلف یا مخالف رائے رکھتا ہے۔ اگر میرا یہ حق مغربی دنیا تسلیم نہیں کرتی کہ میں کسی معاملے میں مختلف رائے رکھ سکتا ہوں تو پھر مکالمہ نہیں ہوگا۔ یہ مکالمہ (ڈائیلاگ) نہیں ہوگا۔ یہ تو یک طرفہ بات (مونولاگ) یا خود کلامی کی ایک شکل ہوگی۔ ایسے میں مکالمے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ بتائیے، لکھ کر دے دیجیے، ہم تو مریض ہیں، جو بھی نسخہ آپ لکھ کر دیں گے چپ چاپ پی جائیں گے۔ یہ مکالمہ نہیں ہے یہ تو یک طرفہ بات ہے۔ یہ بات کہ مغربی دنیا طے کرے اور ہم اس کی بلاچوں چرا پیروی کریں اور اگر پیروی کرنے کوئی تامل کریں تو آپ اور آپ کے کارندے اس کو مار پیٹ کر منوالیں، جیسا کہ کئی لیڈروں نے کیا، زبردستی دنیائے مشرق سے اپنی باتیں منوالیں یہ مکالمہ نہیں ہے۔ یہ نسخہ کارگر ہوتا تو پچھلے سو برس میں ہو چکا ہوتا، یہ نسخہ تو کارگر نہیں ہوا، جیسا کہ تجربہ شاہد ہے، بل کہ اس کا ردعمل شدید تر ہوتا ہے۔ مخالفانہ جذبہ اتنا ہی ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے۔ یہ نسخہ تو تجربے نے بتایا کہ کارگر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آپ Diversity کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنا وجود برقرار رکھے تو میرا حق اختلاف تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر وحدتِ کثرت ہے تو یہ حقیقت عمل میں بھی تسلیم کیجیے۔ اور آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ڈائی ورسٹی دنیائے اسلام کے بارے میں بھی تسلیم ہونی چاہیے۔

یہ بات کہ ہمارے ہاں اگر کوئی غیر مسلم اقلیت ہے تو اس کو Diversity کی بنیاد پر اپنے ثقافتی امتیازات کے تحفظ حق ہے، لیکن ایک ارب چھپن کروڑ مسلمانوں کو Diversity کی بنیاد پر اپنے شعائر دین کے تحفظ کا حق نہیں ہے، یہ بات کوئی باعزت مسلمان بل کہ کوئی بھی غیرت مند انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور ایک ارب چھپن کروڑ مسلمان بھی اس غیر منصفانہ رویے کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ سو پچاس یا سو دو سو لیڈروں کو خرید لیں، انھیں دنیائے اسلام پر مسلط کروا دیں، ان کے ذریعے ڈنڈا چلوا دیں، تلواریں چلوا دیں، تو وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے، شاید آئندہ بھی ہوتا رہے گا، لیکن اس

Marfat.com

سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ بات پہلے ہی سے تسلیم کرنے کی ہے کہ اختلاف اور تنوع ایک حقیقت ہے، جس کو ماننا چاہئے۔ اختلاف کا مکمل خاتمہ قبرستان میں ہوسکتا ہے یا جیل خانے میں ہوسکتا ہے۔ مکمل یک سانیت یا جیل خانے میں ہوسکتی ہے، یا پھر قبرستان میں ہو سکتی ہے، باقی کہیں نہیں ہوسکتی۔ اس طرح کی یک سانیت حقائق کی دنیا میں نہیں ملتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آزادیٔ اختلاف ایک آزاد بامعنی مکالمے کے لئے ضروری ہے۔ اگر آپ مکالمہ چاہتے ہیں تو آپ مجھے اپنی رائے قائم کرنے کا اختیار دیں۔ اگر آپ کو آزادیٔ رائے کا اختیار ہے تو مجھے بھی ہے۔ اگر آپ کو اللہ کی شریعت کے مقابلے میں قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہے تو مجھے کم از کم شریعت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہئے۔ آپ ننگے پھرنے کی قوم کو آزادی دیتے ہیں، اس کے تحفظ لئے قوانین بنا رکھے ہیں، لیکن بچیوں کو سر ڈھانپنے کی آزادی نہیں ہے۔ یہ بات کسی مسلمان کی سمجھ میں نہیں آتی، لیکن چوں کہ آپ کے پاس ڈنڈا ہے، آپ کے پاس قوت ہے، ایٹم بم ہے، پیسہ ہے، اس لئے آپ نے زبردستی دنیا سے منوالیا کہ ننگے پھرنے کی آزادی تو ہے سر ڈھکنے کی آزادی نہیں ہے، یہ بات جس طرح بدیہیات میں سے ہے وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ پھر ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی دستاویزات میں لکھا ہوا ہے کہ ہر شخص کو اپنی مقامی تہذیب و ثقافت اختیار کرنے اور اس کو فروغ دینے کا حق ہے۔ اس بنا پر اگر ہمارے ہاں کوئی غیر مسلم اقلیت ہے تو اس کو تو سارے حقوق حاصل ہیں، لیکن اگر مسلمان بہ حیثیت مجموعی اپنی ثقافت کو فروغ دیں تو وہ آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

عجیب بات ہے، آج سے ۲۰، ۲۵ سال پہلے ایک جگہ بات ہو رہی تھی، میں نے کہا کہ ایک مرحلہ ایسا آئے گا، ویسے ہی میں نے ہنسی میں بات کہی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ مغربی ممالک میں مسجدیں بنانے پر پابندی لگادی جائے گی اور اس پابندی لگانے کے لئے وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ ہم مذہب پر پابندی لگا رہے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہے گا۔ کریں گے وہی جو جی چاہتا ہے لیکن زبان سے نہیں کہیں گے۔ وہ یہ کہیں گے کہ مسجدیں ہماری ٹاؤن پلاننگ میں فٹ ہی نہیں ہوتیں، ہمارا جو آرکیٹکچر ہے اس کو سوٹ نہیں کرتیں،

Marfat.com

یہ کہہ کر مسجدوں کو گرایا جائے گا۔ یہ خیال ایسے ہی میرے ذہن میں آیا تھا، اور میں نے بر سبیل مزاح یہ بات کہی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ یہی بات کہی جا رہی ہے اور سوئٹرز لینڈ میں ہو رہی ہے، میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ فلاں جگہ پر مسجد کو گرا دیا جائے، اس لئے کہ ٹاؤن پلاننگ کی اسکیم میں وہ فٹ نہیں ہوتی اور مسجد اس علاقے آرکیٹیکچرل انوائرمنٹ میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ یہ بات ایسی ہے کہ ہر ایک کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی مسلم ملک میں یہ کہیں کہ فلاں مذہبی طبقے کی جو فلاں مذہبی عمارت ہے وہ ہمارے فلاں نقشے سے متعارض ہے، لہٰذا اس کی اجازت نہیں ہونی چاہئے تو اہل مغرب کو الجھن ہوتی ہے، غلط فہمی ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی قانون بنائیں کہ فلاں قسم کا نقشہ صرف مسجد کے لئے مخصوص ہوگا تو مغربی میڈیا اس پر زمین آسمان سر پر اٹھا لے گا۔

اگر آپ کہیں گے کہ فلاں مصطلحات ہماری دینی مصطلحات ہیں، اس کا کوئی اور استعمال کرے گا، یا ان کو کوئی اور مفہوم پہنائے گا، یا ان کا کوئی اور مقصد قرار دے گا تو ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے، اس لئے ہم اب اس کو اپنے لئے محدود کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنا اہل مغرب کے نزدیک انصاف کے خلاف ہے۔ دوسری طرف اگر آپ دکان کھول لیں، دکان کا کوئی نام رکھ لیں تو آپ دوسروں کو وہ نام استعمال کرنے سے روک سکتے ہیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ آپ کے بنیادی حقوق کا مسئلہ آجائے گا، انٹلکچوئل رائٹس کا مسئلہ آجائے گا، اہل مغرب دنیا کو سر پر اٹھا لیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دکان کے نام کو تو تقدس حاصل ہے لیکن ایک ارب چھپن کروڑ مسلمانوں کی کسی مذہبی اصطلاح کو تقدس حاصل نہیں ہے۔ یہ بات مسلمانوں کی عقل میں نہیں آتی، اس لئے جب تک یہ ڈائی ورسٹی اور آزادی لوکل کلچر کے سلسلے میں نہیں ہوگی، اس وقت تک یہ مشق بے کار رہے گی، نتیجہ خیز نہیں رہے گی، جیسا کہ گزشتہ ۵۰ سالوں میں نہیں ہوئی۔

آخری سوال یہ ہے کہ یہ مکالمہ کون کرے؟ یہ مکالمہ کس کو کرنا چاہئے؟ میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں (اگر اس میں کسی کی دل آزاری ہو تو پہلے سے معذرت کرتا ہوں) اس طرح کا مکالمہ نہ تو موجودہ سیاسی قیادت کرسکتی ہے، اور نہ مذہبی قیادت۔

Marfat.com

سیاسی قیادت تو پہلے ہی غلام ذہن رکھتی ہے۔ وہ کہیں گے، سرکار آپ حکم دیجئے جو آپ کہیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ ہمارے ایک صاحب نے چند سال پہلے ملکہ برطانیہ کے حضور عرض کیا تھا کہ ہم تو آج بھی آپ کے وفادار ہیں، ہم آپ کی رعایا ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے ایک ذمے دار بڑے سیاسی لیڈر نے ملکہ برطانیہ سے کہا تھا، جس کی حکومت ختم ہوگئی ہے، پہلے کہتے تھے کہ وہاں سورج غروب نہیں ہوتا، اب وہاں سورج نکلتا ہی نہیں ہے۔ مگر یہ طبقہ آج بھی زبان حال سے یہی کہتا ہے کہ ہم اب بھی آپ کی رعایا ہیں۔ یہ لوگ کیا مکالمہ کریں گے؟ ان کو تو مکالمے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ وفادار غلام اور آقا میں مکالمہ نہیں ہوا کرتا۔ وہاں غیر مشروط فرماں برداری ہوتی ہے، جو ہمارا سیاسی طبقہ دو سو برس سے کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ لوگ تو کہیں گے کہ آپ حکم دیں ہم تعمیل کریں گے۔ ان کا مکالمہ یہ ہوگا کہ وہ حکم دیں اور آپ تابع داری کریں، وہاں تو مکالمہ ہی ختم ہو جائے گا۔

مکالمے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ مذہبی قائدین کریں۔ وہ بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ مذہبی قائدین وہ زبان نہیں بولتے جو اہل مغرب سمجھ سکیں۔ جس انداز سے آج کل ایک فائر برانڈ گفت گو ہو رہی ہے وہ مکالمے کی زبان نہیں ہے، اس فائر برانڈ گفت گو سے مکالمہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے مزید دشمنی یا کم از کم دوری پیدا ہوتی ہے۔

میں آپ کو بتاؤں، آج سے ۲۰ سال پہلے، یہ بات میں نے مولانا زاہد الراشدی کو بھی بتائی تھی، انگلستان کے ایک بڑے شہر میں ایک مسجد تھی یہ غالباً ۸۰ یا ۸۲ وغیرہ کی بات ہے، اسی کی دہائی کے لگ بھگ کی بات ہے۔ وہاں سیرت کا ایک بڑا جلسہ تھا، لیسٹر کی بڑی مسجد تھی۔ پتہ نہیں مولانا راشدی اس میں تھے کہ نہیں، مجھے یاد نہیں، مگر مجھے وہاں بلایا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ اندر محراب تک پہنچنے میں مجھے وقت لگا، وہاں ہمارے صوبہ سرحد کے ایک پٹھان مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے۔ (میں پٹھانوں کا شاگرد ہوں، پٹھانوں کا احترام کرتا ہوں، میرے انتہائی محترم اساتذہ میں پٹھان اساتذہ شامل ہیں، پٹھان کے لفظ سے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں یہ بات کسی لسانی بنیاد پر کہہ رہا ہوں) وہ وہاں تقریر میں فرما رہے تھے کہ بہت جلد ایسا دور آنے والا ہے کہ یہ سب

Marfat.com

انگریز عورتیں تمہاری باندیاں بنیں گی اور پھر تم ان کو اٹھا کر لے جانا۔ یہ الفاظ اس گفت گو کا انتہائی محتاط خلاصہ ہیں جو وہ فرما رہے تھے۔ وہاں تو دنیائے مغرب میں مسلمانوں کے بارے میں بہت ساری چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ ہر چیز ریکارڈ ہوتی ہے کہ کون کیا کہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی نوٹس نہیں لیتا ہو۔ اگر اس رائے یا طرز گفت گو کو مکالمے کے لئے استعمال کریں گے تو جیسا مکالمہ ہوگا اس کا نتیجہ پہلے ہی آپ کے سامنے ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مکالمے کے لئے کچھ لوگ تیار ہونے چاہئیں، جن کو بصیرت کے ساتھ یہ علم ہو کہ اسلام کا کون سا اساسی اور اصلی موقف ہے جس پر کوئی لین دین نہیں ہوسکتا۔ وہ کون سے معاملات ہیں جن پر حالات اور زمانے کے لحاظ سے نظر ثانی ہونی چاہئے یا ہوسکتی ہے۔ پھر مغرب کی تاریخ اور ثقافت کا پتہ ہو۔ ان کے حالات وعقائد کا صحیح علم ہو، ان کی سیاسی پیش رفت اور جو اغراض وعزائم ہیں ان کا علم ہو۔ اور جو مشترکات ہیں ان کا کچھ اندازہ ہو، تاکہ ایک بامعنی گفت گو ہو سکے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس کے لئے کچھ لوگوں کو تیار کیا جانا چاہئے۔ جو علمائے کرام میں سے بھی ہوں، ان میں سے جو ذوق رکھتے ہوں، اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی کچھ لوگ ہوں، قانون وعمرانیات کے ماہرین، صحافت، ثقافت کے ماہرین، تعلیم کے ماہرین اور دوسرے مضامین کے ماہرین، جن کے لئے کوئی ایسا پروگرام ترتیب دیا جائے جو کچھ مہینوں کا یا کم وبیش اتنے ہی دورانئے کا ہو، جس میں اسلام کے موقف کے بارے میں بہت اچھی طرح سے ٹھوس انداز میں بتایا جاسکے کہ اسلام کا موقف فلاں فلاں معاملے میں کیا ہے۔ تاکہ مکالمہ کرنے والے بہتر انداز میں اس طرح کا مکالمہ کرسکیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اجازت چاہتا ہوں۔ اگر گفت گو لمبی ہوگئی تو میں معذرت خواہ ہوں

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

عالمی امن کے قیام کے لئے
تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت

زیرِ نظر مضمون ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے عربی مقالے

أهمية الحوار بين الحضارات فی تحقيق السلام العالمی

کا ترجمہ ہے، جو رابطہ عالمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ۲۰۰۸ء میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ عالمی اسلامی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ ترجمہ وحواشی سید متین احمد شاہ (ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد) کے قلم سے ہیں۔

اس سائٹ پر اس کانفرنس کے مقالات کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

http://ipc.org.kw/bookpage-8-1

Marfat.com

عالمی امن کے قیام کے لئے تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت

امنِ عالم کا مسئلہ موجودہ دور میں ان اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جو تمام انسانیت کے لئے اہمیت کے حامل ہیں۔ چناں چہ عالمی امن، قوتوں کے توازن، قیامِ امن اور عدل وانصاف کے اصولوں کی پابندی پر انسانیت کے مستقبل کا دارومدار ہے، کیوں کہ عمومی تباہی پھیلانے والے وہ ہتھیار، جنہیں بڑی عالمی قوتوں نے تیار کر رکھا ہے، کرۂ ارض کو متعدد بار تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہیں۔

یہ صورت حال اس وقت مزید خطرناک ہو جاتی ہے جب ہم بڑے ممالک کی بعض ذمے دار شخصیات اور اصحاب علم و دانش کو اقوام اور تہذیبوں کو الٹی میٹم دیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ خبردار کر رہے ہیں کہ تہذیبوں کے درمیان ایک عالم گیر تصادم ہونے والا ہے، جو اگر خدانہ خواستہ وقوع پذیر ہو گیا تو انسانیت نے پچیس سو سال کے عرصے میں ترقی خوش حالی اور علم و معرفت کی جو جوت جگائی ہے، اس کا خاتمہ ہو کر رہ جائے گا۔

یوں لگتا ہے کہ بدترین بدشگونی پر مبنی ان افکار کا منبع و منشا اسلام فوبیا (Islam Phobia) ہے جس کے علم بردار بعض اہل مغرب ہیں، جو یہ چاہتے ہیں کہ مغرب کے

Marfat.com

بڑے ممالک کی تدابیر وانتظام ان کی خواہشات واغراض کے مطابق ہوں۔

یہ خود غرض اقلیت اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ ساری دنیا کو ذلت ورسوائی اور تباہی وبربادی کے گڑھے میں ڈال دے۔ اس انجام سے انسانیت کی نجات اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ تہذیبوں اور مختلف ادیان کے پیروکاروں کے درمیان پرامن مکالے کو فروغ دیا جائے۔ اسی طرح بہت سی مشکلات اور مسائل سے عہدہ برآ ہونا بھی، جن کا سامنا ساری انسانیت کر رہی ہے، ایسے مکالمے کے بغیر ممکن نہیں جو آزادی اور اہل مکالمہ کے درمیان مساوات کے اوصاف سے متصف ہو۔ لہٰذا مکالمہ ہی تہذیبوں کے مابین تعاون، اقتصادی اور اجتماعی بقائے باہم، امن عالم کے قیام اور عالمی مشکلات کے حل کا واحد راستہ ہے۔ ان میں سے ایک مشکل ایک ایسی دنیا میں انسانیت کی مشترکہ اقدار کا تعین ہے، جہاں ترکِ اقدار کا فلسفہ راج کر رہا ہے، جہاں ایسے نعرے بلند ہو رہے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اقدار کوئی چیز نہیں ہے اور اخلاقی قدریں ایک امرِ اضافی ہے۔ ان نعروں اور فلسفوں کا نتیجہ انجام کار تمام اقدار واخلاقیات سے مادر پدر آزادی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خاندان کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑنے والے عناصر، عالمی دہشت گردی اور نشہ آور اشیا کا پھیلاؤ، یہ سب امور اخلاقی اصولوں سے فرار اور اخلاقی اقدار کے اضافی ہونے کے نظریے پر اصرار کا ہی ناگریز نتیجہ ہیں۔

اس تناظر میں ان بڑی تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی اہمیت ضروری ہو جاتی ہے، جو معرفت وثقافت اور سائنس وٹیکنالوجی کے میدانوں میں انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔

تہذیب کیا ہے؟

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے یہ بات بیان کرنا مناسب ہے کہ لفظِ تہذیب کا اطلاق مختلف سیاق وسباق میں مختلف مفاہیم پر ہوتا ہے۔ لیکن اس گفت گو میں تہذیب سے ہماری مراد تمدن، ثقافت، فکر اور مظاہرِ حیات (اپنے تمام مادی اور مصنوعی

Marfat.com

نمونوں کی شکل میں) کا مشترکہ ورثہ ہے۔ اس معنی کی رو سے تہذیب کے مفہوم میں سائنسی ترقی، فنی ارتقا، ادبی پیش رفت، اقتصادی ترقی، اجتماعی طرز عمل اور مادی خوش حالی جیسے تمام امور شامل ہو جاتے ہیں، جن کو کوئی قوم حاصل کرتی ہے۔ یہ عمومی تعریف قدیم اور جدید تمام تہذیبوں پر صادق آتی ہے، خواہ ان تہذیبوں کی بنیاد ادیانِ سماویہ پر ہو یا مادی نظریات پر۔ لیکن کسی تہذیب، ثقافت یا تمدن کے یہ مادی مظاہر اسی وقت وجود پذیر ہوتے ہیں جب ان کے پیچھے عقائد اور نظریات کا ایک نظام کارفرما ہو۔ یہ عقائد ونظریات اپنے اندر سے پھوٹنے والی تہذیب کا رخ متعین کرتے ہیں اور اس کو زندگی بخشتے ہیں۔ ان ہی کی بنیاد پر ایک تہذیب کے مظاہر واجزا ایک کامل وحدت کی شکل میں ڈھلتے ہیں۔

کسی بھی تہذیب یا تمدن کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ عقائد ونظریات سے جدا ہو سکے، جو اس کے مادی وجود میں اس طرح سرایت کئے ہوتے ہیں، جیسے جیتے جاگتے جسم میں روح اور خون۔ اور کسی تہذیب وثقافت کی حامل کوئی قوم اپنی اس تہذیبی روح اور ثقافتی جوہر سے الگ نہیں ہو سکتی جو کائنات کے بارے میں اس کے نظریے کے ترجمان ہوتے ہیں۔

اس بنا پر ہر تہذیب کے بنیادی نشانات وہ امور ہوتے ہیں جو کسی قوم کے عقائد ونظریات اور تہذیبی مظاہر کے مابین رشتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ گویا یہی نشانات تہذیبی عمارت کے ستون ہوتے ہیں، جو دین وعقیدے کی بنیادوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ تہذیب ان ہی سے اپنی قوت اخذ کرتی ہے اور ان ہی سے اس کے دوام وبقا کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ یہی تہذیبی خصائص اور نشانات تہذیبوں میں باہم دگر امتیاز پیدا کرتے ہیں، اور ان ہی کے تناظر میں تہذیب کی شناخت اور شخصیت کی تصویر کاری ہوتی ہے۔

اسلامی عقیدہ، دین حنیف کی تعلیمات اور شریعت اسلامی کے اصول (جیسا کہ وہ قرآن میں وارد ہوئے ہیں اور جس پر امت مسلمہ کے تمام طبقوں کا ہر زمان ومکان میں تعامل رہا ہے) ہی اسلامی تہذیب کے اصول اور بنیادیں ہیں، جن پر تہذیب اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہی اس تہذیب کے اساسی نشانات ہیں، جن سے امت مسلمہ کسی

Marfat.com

حال میں بھی جدا نہیں ہوسکتی۔ اس نظریے اور ان تہذیبی نشانات کے خصائص آفاقیت، روحانیت، اخلاق، انسانیت اور عمومیت جیسے امور ہیں۔

اسی طرح معاصر مغربی تہذیب کے بھی اصول اور بنیادیں ہیں، جن کا ایک طرف یونانی پسِ منظر ہے، جس سے یہ تہذیب اپنے بہت سے نظریات اور عقائد اخذ کرتی ہے، اور دوسری طرف ان کا تعلق اس رومی تہذیب کے ساتھ ہے، جس سے اس تہذیب کی متعدد قانونی آرا اور فکری رویے ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ اس تہذیب کی بنیادوں میں اس کے اپنے مسیحی عقائد اور مادی رجحانات بھی شامل ہیں۔ یہ تمام عناصر مغربی تہذیب کی بنیادوں اور اصولوں کی ترجمانی کرتے ہیں جن پر اس تہذیب کے آثار استوار ہیں۔

یہ تہذیبی نشانات اور خطوط بہت سے امور میں اسلامی تہذیب سے مختلف ہیں، جب کہ بہت سے امور میں اس کے ساتھ اشتراک بھی رکھتے ہیں۔ اس تہذیب کے اہم ترین خطوط میں سیکولرازم کا نظریہ بھی ہے، جس کو اہلِ مغرب اپنی تہذیب کے پسندیدہ ترین اصول، اہم ترین نشان اور گراں قدر سرمایہ سمجھتے ہیں۔

اسی طرح دیگر تہذیبوں میں بھی ہمیں ایسے اصول اور آثار ملتے ہیں جن سے وہ اقوام دست بردار نہیں ہوسکتیں، بل کہ اپنے تمام اسباب و وسائل سے ان کی مدافعت کرتی ہیں۔ ان اصولوں کے دفاع ہی سے تہذیبوں کی بقا ہے، ان کو مضبوطی سے تھامنے میں ان کی تازگی اور ان کی بقا میں ان کی اپنی بقا کا راز مضمر ہے۔ ان بنیادوں کی کم زوری اور اضمحلال سے تہذیبیں کم زور ہوتی ہیں۔ چناں چہ تہذیبیں اپنی اصل کے اعتبار سے باہم برسرِ پیکار نہیں بل کہ وہ باہم مکالمے پر آمادہ ہوتیں، آرا و افکار کا تبادلہ کرتیں اور ایک دوسری سے سیکھتی ہیں۔ چناں چہ کوئی بھی تہذیب ایسی نہیں ہے، جس نے دوسری تہذیبوں سے اخذ و استفادہ نہ کیا ہو، جیسا کہ تہذیبوں اور اقوام کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ اسلامی تہذیب تو اس معاملے میں تمام تہذیبوں کے سرفہرست ہے، جس نے دوسری تہذیبوں سے استفادے اور انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مفید امور کے حصول میں کسی

Marfat.com

تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور یہ استفادہ اپنے عقیدے، دینی بنیادوں، تہذیبی آثار اور ثقافتی مظاہر کو نقصان پہنچانے کی قیمت پر نہیں ہے۔ چناں چہ علمائے اسلام کو ائمہ یونان سے منطق اور منطقی فکر کے اصولوں کے سیکھنے میں کسی قسم کا تردد نہیں ہوا۔ انہوں نے ہندوؤں سے ریاضیاتی علوم، طب اور دیگر مفید علوم کے سیکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ اسی طرح علمائے اسلام نے مشرق و مغرب کی اقوام کو اپنے علوم و معارف کی تعلیم دینے میں کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انسانیت کی تاریخ میں کوئی بھی تہذیب دوسری تہذیبوں سے اخذ و استفادہ اور علم و معرفت کی دریافتوں سے آگاہی کے بغیر سرسبز و شاداب نہیں ہو سکتی، اور ہر تہذیب یا ثقافت اسی وقت پژمردہ ہوئی اور فنا کے گھاٹ اتری ہے، جب اس نے اپنے آپ پر جدید آرا اور تعمیری افکار کے دروازے بند کئے ہیں۔

معاصر مغربی تہذیب بھی اسلامی تہذیب سے بہت کچھ سیکھنے کے بعد اس اوجِ کمال پر متمکن ہوئی ہے۔ اس استفادے کی جہات متنوع اور متعدد ہیں۔ ان میں سے ایک بات جنوبی اور مشرقی یورپ میں طویل عرصے تک اسلامی تہذیب کی حکم رانی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب نے اپنے علمی مراکز میں طب، تجربی علوم، فلسفے اور یہاں تک کہ دینی فکر میں بھی اسلامی علوم و معارف سے طویل استفادہ کیا ہے۔ چناں چہ متعدد انصاف پسند محققین نے یہ بات ثابت کی ہے کہ اسلامی تہذیب نے مغرب کے تہذیبی، ثقافتی اور فکری میدانوں میں گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

ماضی میں اسلامی تہذیب اور دیگر تہذیبوں کے مابین مکالمے اور افادے و استفادے کے تعلقات رہے ہیں۔ اور بہت سی جنگوں کے باوجود (جن کا آغاز صلیب پرستوں نے کیا) اسلامی ممالک کے اندر مسلمانوں کے یہود و نصاریٰ کے ساتھ تعلقات باہمی امن و سلامتی پر استوار رہے ہیں۔ مشرق و مغرب کے تمام علاقوں سے طلبائے علم اسلامی دارالخلافوں میں موجود مراکزِ علم کی طرف رختِ سفر باندھتے رہے ہیں۔ اور یہ طویل تہذیبی مکالمہ غیر معمولی طور پر ثمر بار مکالمہ ثابت ہوا ہے، جس کے ذریعے علومِ قدیمہ کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو سکا ہے۔ جیسا کہ اس بات کا اعتراف مشرق و مغرب کے

Marfat.com

مؤرخین نے کیا ہے۔ جس طرح اسلامی تہذیب نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں، اسی طرح ہندو تہذیب نے بھی (اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید دشمنی کے باوجود) اسلامی تعلیمات اور اسلام کے تہذیبی مظاہر کے اثرات قبول کیے ہیں۔

افادے اور استفادے کا یہ معاملہ صرف اسلامی تہذیب اور ان بڑی تہذیبوں کے مابین ہی منحصر نہیں رہا، بل کہ مسلمانوں نے ہر اچھی عادت، مفید اسلوب اور حکمت پر مبنی بات کو ان تہذیبوں سے حاصل کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کیا، جن کے ساتھ ان کا تعلق واسطہ رہا ہے۔ اس لئے کہ دانائی کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے، وہ اس کو جہاں بھی پائے اس کا حق دار ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے انسانیت کو اپنے پاس موجود ہر علم وفن، آداب، صنعت اور تجربے کی تعلیم میں کسی نسل یا جغرافیائی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ان سب امور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکمت ومعرفت کے باب میں افادہ اور استفادہ اور علمی وثقافتی مکالمہ تہذیبِ اسلامی کے امتیازات میں سے ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ استعمار کا طویل دور اور موجودہ مغربی تسلط آج اس تہذیبی مکالمے کے جاری رہنے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا باعث بنا ہوا ہے، جس کی روح کو زندہ کرنے اور نئے سرے سے اس کی طرف لوٹنے کی ضرورت ہے۔

داخلی مکالموں کی اہمیت

دوسری تہذیبوں کے ساتھ تہذیبی مکالمے کی بحث میں داخل ہونے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم عالم اسلامی میں پائے جانے والے مختلف رجحانات کے مابین داخلی مکالمات کی بحث سے ابتدا کریں، خواہ ان رجحانات کا تعلق معتدل اسلامی جماعتوں سے ہو یا منحرف مذاہب سے یا جزوی رجحانات سے۔ اس لئے کہ ان رجحانات کے آگے بند باندھنا شاید کوئی سودمند بات نہیں ہے، جیسا کہ پہلے تھا۔ مجھے صراحتاً یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جزوی آرا اور اقلیتوں کے ان نمائندہ رجحانات سے روایتی اسالیب کے ساتھ

Marfat.com

تعرض کرنا کوئی مفید یا نفع بخش چیز نہیں ہے۔ پہلے دور میں ان منحرف رجحانات کا تعاقب کرنے میں علما کے فتوے ایک موثر اسلوب ہوتے تھے، لیکن عہد حاضر نے ابلاغ کے دروازے اس طرح وا کردیئے ہیں کہ ان کے ذریعے ہر شخص کسی بھی وقت اپنے افکار و آرا کو چار دانگ عالم میں پہنچا سکتا ہے۔ ان منحرف اور لادین افکار کے پھیلاؤ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ علما کے فتوے اس کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ پھر ان فتووں کی جو زبان اور اسلوب ہے وہ اکثر اوقات آج کی تعلیم یافتہ نسل اور عصری مزاج کی حامل نسلِ نو کو مطمئن نہیں کرسکتا، اور یوں لگتا ہے کہ لوگوں کی رہ نمائی، معاشروں کی اصلاح اور نوجوانوں کی تربیت کے معاملے میں فتوے کا کردار روز بہ روز محدود تر ہوتا جارہا ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں دینی نصوص (جن میں نصِ قرآنی سرفہرست ہے) پر نظرِ ثانی اور ان کی نئی تعبیر و تفسیر کے جو نعرے بلند ہوئے ہیں، کوئی دُور کی بات نہیں ہے۔ اپنے علمی بودے پن، (ایک انسانی تاریخی نص کی طرح) مواد کی رکاکت، اور دلیل کے لحاظ سے کم زور ہونے کے باوجود یہ نعرے اور افکار عالم اسلام میں پھیل گئے۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر ان ہی کا چرچا ہے، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان پر گفت گو کررہے ہیں اور قلم ان کو لکھتے چلے جارہے ہیں اور لوگوں کی اکثریت ان کے بارے میں دینی مراکز کی طرف سے صادر ہونے والے فتووں کو درخورِ اعتنا بھی نہیں جانتی۔ یہ ساری صورتِ حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم دیگر تدابیر اختیار کرنے کے امکان پر غور کریں، تاکہ موجودہ تدابیر اور وسائل کے ساتھ ان کا اضافہ کرسکیں۔ اور بہ ظاہر مکالمہ ان ممکن وسائل میں سے ہے جس کو متوازن اسلامی گفت گو کے ترجمان حضرات (جو اہلِ سنت والجماعت اور معروف فقہی مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور امت مسلمہ کے سوادِ اعظم کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔) آزاد خیال حضرات کے ساتھ مکالمے میں استعمال کرسکتے ہیں۔ مغربی دنیا کے اصحابِ حل وعقد عالمِ اسلام میں آزاد خیال لوگوں کے ساتھ تعاون اور ہر ممکن مدد کے لئے کوشاں ہیں، جیسا کہ بعض اہم جگہوں سے سامنے آنے والے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ مسلمان رہ نما ایسی خدمات، جماعتیں، اسلامی مراکز اور علمی اداروں کے قیام کا آغاز کریں، تا کہ بائیں بازو کے حضرات، بنیاد پرستوں اور گروہی تعصب والوں کے ساتھ مکالمے کی راہ ہم وار ہو سکے، جن کو دشمنانِ اسلام امت کے افراد کے درمیان اختلافات کو زیادہ کرنے اور مسلم دنیا میں موجود مختلف رجحانات کے درمیان نزاعات کی خلیج کو گہرا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اس بات میں شک نہیں کہ بہت سے مسلم ممالک میں ان رجحانات کا پایا جانا ایک امر واقعی ہے جس سے غفلت برتنا ممکن نہیں۔ اس بات میں بھی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ اس قسم کے اختلافی رجحانات کا وجود ایک ایسی خلا ہے جس کو دشمنانِ اسلام اپنے مقاصد کے لئے ان ممالک میں استعمال کر سکتے ہیں، خصوصاً اس وقت جب کہ مسلم قیادتیں ان کے وجود اور ان کو ہاتھ میں لینے سے تغافل برتیں۔ ان رجحانات اور گروہوں کے درمیان عقیدے، مسلک اور جنس کے اختلافات، بہت سے اسلامی ممالک کے داخلی استحکام میں شگاف ڈالنے کا سبب بنتے رہے ہیں، اور یہ بات واضح ہے کہ داخلی عدمِ استحکام معاشرے اور ملک کے استحکام کے اختلاف کا سبب بنتا ہے، اور کسی معاشرے، ملک یا خطے میں عدمِ استحکام ان کے نظامِ امن وعدالت کی بربادی اور انہدام پر منتج ہوتا ہے، اور امن وانصاف کے نظام میں فساد اور طوائف الملکی کے حالات پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے، جن میں لوگوں کی عزتوں اور جان ومال پر شب خون مارنے کے لئے اہلِ اغراض اور اصحابِ شہوات کی سرگرمیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں، پھر یہ سب کچھ مل کر داخلی امن اور عالمی سلامتی کی تباہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہٰذا عالم اسلام اور امتِ مسلمہ کے اندر ایک دائمی اور مسلسل مکالمہ آج امتِ اسلامیہ کی اہم ترین ضروریات میں سے ہے۔ اسبابِ اختلاف کو کم کرنے اور امت کے مختلف گروہوں کے درمیان دوریوں کو ختم کرنے کے ساتھ باہمی مکالمہ ایک طرح کا ذاتی احتساب (self-criticism) بھی ہے، جس کی ضرورت اس آخری دور میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

Marfat.com

تہذیبوں کا تصادم

امریکی مفکر سموئیل پی ہن ٹنگ ٹن (Samuel P.Huntington) (۱) کے لکھے گئے مضامین کے منظر عام پر آنے کے بعد تہذیبی کش مکش اور تصادم کا موضوع اب مجالس ومحافل کا ایک گرم ترین موضوع بن چکا ہے۔ ہن ٹنگ ٹن نے اپنا ایک مضمون معروف امریکی مجلّے Foreign Affairs (Summer 1993) میں شائع کروایا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک مفصل کتاب تحریر کی جس میں اس نے تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں اپنے نظریے کی وضاحت پیش کی۔ (۲) اس نے مغربی دنیا کو ایک بڑے متوقع

۱۔ سموئیل پی ہن ٹنگ ٹن (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۸ء) امریکہ کا مشہور ماہر سیاسیات تھا۔ اپنی کتاب The Clach of Civilizations (1993,1996) کے ذریعے اس نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب اپنے عشرے کی موضوعِ بحث بننے والی نمایاں ترین کتابوں میں سے ہے۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ ''تہذیبوں کا تصادم'' کے نام سے محمد احسن بٹ نے کیا ہے، جس کو دوست ایسوسی ایٹس لاہور نے شائع کیا ہے۔

۲۔ ہن ٹنگ ٹن نے یہ مقالہ پہلے The Clach of Civilizations کے نام سے Foreign Affairs (Summer 1993) میں شائع کروایا۔ اسی مقالے کا مرکزی خیال بعد میں اس نام سے The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order کتابی شکل میں سامنے آیا، جو نیو یارک کے اشاعتی ادارے Simon & Schuster سے ۱۹۹۶ سے شائع ہوئی۔ تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ بنیادی طور پر ہن ٹنگ ٹن کا نہیں ہے بل کہ اس سے پہلے بھی اس نظریئے کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ نیاز سواتی اپنے مضمون ''تہذیب اور تہذیبوں کا تصادم'' میں لکھتے ہیں کہ ہن ٹنگ ٹن سے تقریباً گیارہ برس قبل مشہور یہودی مورّخ برنارڈ لیوس اپنی کتاب A Middle East Mosaic میں اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان ٹکراؤ کا تجزیہ کر چکا تھا۔ برنارڈ لیوس سے بھی پہلے برطانوی مفکر آرنلڈ ٹائن بی کے لیکچرز پر مشتمل کتاب The World And The West اس موضوع کا احاطہ کر چکی تھی۔ البتہ برنارڈ لیوس اور ٹائن بی کی زبان علمی ہے اور سیموئیل ہن ٹنگ ٹن کا انداز عام فہم ہے۔ تہذیب۔ اور۔ تہذیبوں کا تصادم http://islamojadidiat.wordpress.com/2012/02/03/

Marfat.com

(یا مقصود) تصادم سے خبردار کیا ہے، جو مغربی تہذیب (جس کی نمائندگی مغربی دنیا کر رہی ہے اور امریکہ کے ہاتھ میں اس کی زمامِ کار ہے) اور بہت سی مشرقی تہذیبوں کے مابین ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ امریکی یہودی مصنف کے خیال میں یہ مشرقی تہذیبیں مغرب کے عالمی غلبے کے خلاف باہم حلیف بن کر اس کے لئے ایک موثر طاقت ثابت ہوں گی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ مزعومہ اتحاد اسلامی تہذیب (جس کے نمائندہ اسلامی ممالک ہیں، جو تیل کے وسائل اور عظیم عسکری قوتوں کے مالک ہیں) اور بدھ مت تہذیب (جو اپنے کثیر متبعین کی وجہ سے امتیاز رکھتی ہے) کو اپنے جلو میں لئے ہوگا۔

امریکی مصنف کا خیال ہے کہ بدھ تہذیب کا نمائندہ چین ہے جو غیر معمولی وسائل کا مالک ہے۔ امریکی مصنف مغربی دنیا کو دعوت دیتا ہے کہ اس سے پہلے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے، وہ اس تصادم کے لئے تیاری کرے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہا ہے، تاکہ مغرب، دنیا پر سیاسی اور عسکری اعتبار سے اپنے غلبے کو باقی رکھ سکے اور اقتصادی و مادی اعتبار سے کرۂ ارض پر اس کا استیلا برقرار رہے۔ مصنف اہل مغرب کے لئے ایسے متعدد اقدامات تجویز کرتا ہے جن کی پاسداری اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

امریکی مصنف جس حقیقی ہدف کو پورا کرنا چاہتا ہے وہ اس متوقع جنگ کے لئے مغربی دنیا کو نفسیاتی طور پر تیار کرنا ہے، لیکن وہ اس کوشش کو تہذیبوں اور عہد حاضر میں انسانیت کے تہذیبی ارتقا کی تاریخ میں ایک نئی فکر کے ذریعے جواز فراہم کرنا چاہتا ہے۔ بہ ظاہر وہ متعدد تہذیبوں اور ثقافتوں پر مبنی ایک عالمی نظام کو تشکیل دینے کی دعوت دیتا ہے، لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اسلامی تہذیب کو اس معاملے میں کوئی قائدانہ کردار ادا کرنے کی اجازت دی جائے کہ وہ انسانیت کو کوئی تہذیبی اقدار یا ایسا مستقبل عطا کر سکے جو مصنف کے پیش نظر ہے، جس میں مغربی ثقافت اور تہذیب کا بول بالا ہو، مغربی نظام ہائے اقتصادی کو غلبہ حاصل ہو اور امریکہ بہادر کا فرمایا ہوا ہی مستند شمار ہو۔

یہ وہ غیر معمولی سوچ ہے جو دنیا کے اصحاب علم وفکر کو اس بات کی دعوت دیتی

Marfat.com

ہے کہ وہ اس کا گہرا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس میں پائے جانے والے نہایت اہم امور پر اپنی آرا پیش کریں۔ نیز اس سوچ کے نتیجے میں دنیا کے مستقبل پر عموماً اور عالم اسلام کے مستقبل پر خصوصاً مرتب ہونے والے نتائج کے بارے میں اظہارِ خیال کریں۔ کیوں کہ اس فکر کو رائج کرنے کے پیچھے یہ فکر کارفرما معلوم ہوتی ہے کہ مشرق و مغرب میں تیزی سے پھیلتی ہوئی دعوتِ اسلام کی راہ میں بند باندھا جائے، کیوں کہ مشرق اور مغرب میں افرادی قوت اور اثر رسوخ رکھنے والی Muslim Communities نے زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنی موجودگی کا اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ مغربی دنیا کے بہت سے اصحابِ علم و دانش کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی وسعتوں کا راستہ روکنا، مغرب کے لئے عام طریقوں سے ممکن نہیں، بل کہ اس کے لئے سخت تدابیر اور غیر روایتی اقدامات کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

اس سوچ کی تائید ہنری کیسنجر (Henry Kissinger)، سابق امریکی صدر نکسن(Richard Nixon) اور دیگر امریکی مصنفین کی تحریروں سے ہوتی ہے جنہوں نے اسلام کی وسعتوں کی راہ میں بند باندھنے اور مغرب کے تہذیبی واقتصادی غلبے کے لئے غیر روایتی اقدامات کرنے کی ضرورت کی تصریح کی ہے۔ اس طرح کی شائع شدہ تمام تحریروں مقالات اور مختلف مواقع پر بیان کی گئی آرا سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مغربی دنیا میں اس عسکری تصادم کے خطرناک مرحلے میں داخل ہونے کا قوی رجحان پایا جاتا ہے جو مغربی طاقتوں (جن کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔) اور دیگر طاقتوں کے درمیان بپا ہونے والا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح ایک پردہ ہے جس کو اس شدید تصادم کے چہرے پر ڈال دیا گیا ہے، جس کا مقصود عالمی وسائل پر مکمل بالا دستی اور ہر اس چھوٹی بڑی قوت کا خاتمہ ہے، جو مغربی استیلا کے لئے رکاوٹ اور چیلنج ہو۔ عراق و افغانستان پر غلبہ پانے کی کوششیں اور سوڈان اور صومال میں درپیش مشکلات ان ہی نئی تدابیر کے مظاہر اور ان کو نافذ کرنے کے اور عملی شکل دینے کے اقدامات ہیں۔ عالم گیریت(Globalization) کی فکر، اس کے ادارے اور آلہ ہائے

Marfat.com

کا راسی اقتصادی اور تہذیبی تصادم کا ایک میدان ہے۔

عالم گیریت اور تہذیبی تصادم میں اس کا کردار

ہم مختصراً یہاں پر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ عالم گیریت، عالمی بالا دستی کے اس فلسفے کا جدید ایڈیشن ہے، جو مدتوں سے صہیونیت کی تگ و تاز کا محور رہا ہے، کیوں کہ جس نظامِ عالم گیریت کو یہ لوگ قائم کرنا اور تشکیل دینا چاہتے ہیں، اس کی کنجیاں ان معدودے چند سرمایہ دار ہاتھوں میں ہیں، جو عالمی منڈی کے ساہوکار ہیں اور ان کی غالب اکثریت یہودیوں پر یا ان کے دست نگر لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنی مطلق العنانی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے کسی بھی ملکی نظام کو تہ و بالا کرنا چاہتے ہیں، اور انجام کار عالمی کمپنیوں کے مالکان کا یہ گروہ قومی ریاستوں پر غلبہ پالے گا جن کے لئے بازار کی حرکت اور اس کی مصلحتوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے لئے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم گیریت کی حکومت صرف کاروبار اور پیسے والوں کی حکومت کا نام ہے۔ اور عالم گیریت کا دستور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون سے ہرگز مختلف نہ ہوگا، جس کی کش مکش انسانیت کے ساتھ شروع دن سے جاری ہے۔ ایک مغربی مصنف کہتا ہے: جب عالم گیریت اپنا مطلوبہ ہدف حاصل کرلے گی تو دنیا میں خاص اصولوں پر مبنی ایک ہی معاشرہ اور یک ساں نوعیت کی اقدار ہوں گی، کرۂ ارض پر ایک ہی ثقافت کا راج ہوگا اور ان امور کو منظم کرنے کے لئے کوئی مرکزی حکومت نہ ہوگی۔ چناں چہ اس وقت جغرافی حدود مٹ جائیں گی اور انسانوں کے درمیان تہذیبی، اجتماعی اور دینی فرق پادر ہوا ہوکر رہ جائیں گے، ثقافت کو منظم کرنے کے لئے کوئی اصول باقی نہ رہیں گے اور سیاسی سرحدوں، اجتماعی حدود اور دینی اصولوں سے برتر ایک عالمی معاشرہ ظہور پذیر ہوگا۔ ہم مسلمانوں کی نظر میں اس کا مطلب تہذیبی انتشار کے علاوہ کچھ نہیں ہے جس میں آسمانی مذاہب، قدیم ثقافتیں اور انسانی و اخلاقی اقدار پر قائم تہذیبیں مٹ کر رہ جائیں گی۔ ایک اور مغربی مصنف رولینڈ رابرٹسن (Roland Robertson) کہتا ہے کہ عالم گیریت کوئی

Marfat.com

نیا مظہر نہیں ہے بل کہ وہ مغربی استعمار کے وقت کی قدیم سوچ ہی ہے اور موجودہ مرحلے تک پہنچنے سے پہلے پانچ مراحل سے گزری ہے۔(۱)

عالم گیریت پر جب ہم اس پہلو سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط استعماری بنیادوں پر استوار ہے جو اپنی سنگینی میں سابقہ استعمار سے بھی بڑھ کر ہیں۔اس کی

۱۔رولینڈ رابرٹسن(Roland Rabertson)(پیدائش ۱۹۳۸ء) مشہور برطانوی ماہرِ عمرانیات جس نے پہلی بار عالمگیریت کی اصطلاح کی تعریف پیش کی۔اس کے نزدیک موجودہ عالمگیریت اصل میں ایک طویل تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے،جس کے پانچ مراحل ہیں۔

الف:۔-The Germinal Phase(تخلیقی مرحلہ) یہ مرحلہ پندرھویں صدی کے آغاز سے اٹھارھویں صدی کے نصف کا ہے۔اس میں فرد اور انسانیت کے بارے میں تصورات میں تبدیلیاں ہوئیں اور کیتھولک چرچ کے دائرے میں وسعت ہوئی۔اسی دور میں اس تصور کو پذیرائی ملی کہ اجرامِ سماوی ساکن سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور جدید جغرافئے کا آغاز ہوا۔

ب۔-The Incipient Phase(ابتدائی مرحلہ) یہ مرحلہ اٹھارھویں صدی کے نصف سے ۱۸۷۰ء کا ہے۔یہ مرحلہ بین الاقوامی تصورات کے ارتقا کا ہے۔صنعتی دور کی بنیادیں اسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔

ج۔ -The Take-Off Phase(اٹھان کا مرحلہ) یہ مرحلہ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۲۰ء کا ہے۔بین الاقوامی معاشروں کا ظہور، ذرائع ابلاغ میں تیزی سے اضافے عالمی سطح کے مقابلوں کے آغاز کا دور۔

د۔ -The Struggle-for-Hegemony Phase(غلبے کی جدوجہد کا مرحلہ، ۱۹۲۰ء۔۱۹۶۰ء) اس عہد میں غلبے اور تسلط کی جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔جدیدیت کے باہم کش مکش رکھنے والے نظریات کی اٹھان، اقوامِ متحدہ کا قیام اور قومی خودمختاری کے نظریات کا فروغ۔

ہ۔ -The Uncertainty Phase (غیر یقینی مرحلہ ۱۹۶۰ء۔۱۹۹۰ء کے آغاز تک (جب مصنف نے یہ ساخت پیش کی۔) چاند تک انسان کی رسائی سے عالمگیریت کے نئے آفاق کا ظہور، سرد جنگ کا خاتمہ، مشرقی بلاک کا انہدام اور یک قطبی دنیا کا ظہور، نت نئے نظریات کا سیلاب اور عالمگیر معاشرے کے قیام کا تصور۔بعض مغربی مصنفین نے ان میں مزید مراحل کا اضافہ بھی کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:www.glopp.ch/A3/en/multimedia/robertson.pdf

Marfat.com

وجہ یہ ہے کہ پہلے مغربی استعماری قوتوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنے اقتصادی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے عالم اسلام میں اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی ابتدا میں ایک تجارتی ادارہ تھا جو مغرب سے اپنے معاشی مقاصد کے حصول کے لئے آیا تھا۔ بلادِ شرقیہ کی سیاست میں اس نے اسی وقت دخل اندازی کی جب اسے اپنے اقتصادی اور تجارتی مقاصد کو پورا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہاں تک آج کی بات ہے تو مغربی استعماری قوتیں ایک نئے استعماری منصوبے کے ساتھ سامنے آئی ہیں جو اپنے جلو میں جدید ثقافتی، اجتماعی، عسکری اور تہذیبی مصلحتوں کو لئے ہوئے ہے۔

قدیم عالم گیریت، مغربی استعمار کی قدیم شکل پر مبنی تھی، لیکن جدید عالم گیریت زندگی کے تمام میدانوں میں مکمل اور بے قید امریکی غلبے اور تسلط سے عبارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جدید عالم گیریت تمام عالم کو ''امریکانے'' کا نام ہے۔ عالم اسلام کے اندر اگر غیر مسلم اقلیات کا کوئی مسئلہ ہو تو تمام مغربی ادارے (بہ شمول امریکی ادارے، مغربی مصنفین اور مغربی صحافت) تنوع اور تعددیت (Pluralism) (۱) پر زور دیتے ہیں۔ لیکن عالم گیریت اور تعددیت کے تمام دعوے ان کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب مسئلہ کسی ایسے اسلامی وطن کی قومی پالیسی کی صورت حال سے متعلق ہو، جو شریعتِ اسلامی سے وابستگی کی ضرورت پر زور دینا چاہتا ہو اور اس وابستگی میں دوام پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس وقت مغرب تنوع اور تعدد کے تمام مفاہیم کو فراموش کر دیتا ہے جب مسئلہ عالم اسلام، اس کے ثقافتی حقوق اور تہذیبی مقام کا آتا ہے۔ سیاست اور معیارات کا یہ دوہرا پن اور ثنویت (Dichotomy) عالم اسلام اور مغرب کے تعلق کے حوالے سے بہت سی مشکلات اور کشیدگیاں جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔

۱۔ تعددیت (Pluralism) ایک جدید اصطلاح ہے، جس کا اطلاق کونیات، مذہب، سیاست، اقتصاد، ثقافت وغیرہ کے میدانوں میں مختلف معانی پر ہوتا ہے۔ عمرانیات کی رو سے اس سے مراد وہ فریم ورک ہے جس میں مختلف لوگ ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ باہم تعاون بجالاتے ہیں۔

Marfat.com

خلاصہ یہ ہے کہ عالم گیریت اصل میں نیو ورلڈ آرڈر ہی کا ایک نیا نام ہے، جس کی صدا سوویت یونین کے سقوط، اشتراکیت کے زوال اور خلیج کی پہلی جنگ کے معرکہ کارزار میں اترنے سے پہلے زعمائے مغرب (جن میں سرفہرست جارج ڈبلیو بش کا نام ہے) نے بلند کی تھی۔ یہ بات معلوم ہے کہ خلیج کی پہلی جنگ ایک سوچے سمجھے منصوبے کو نافذ کرنے کا آغاز تھا، تاکہ امتِ مسلمہ کے اجتماعی، ثقافتی اور تہذیبی تانے بانے کو تبدیل کر دیا جائے۔ اسی لئے صاحبِ بصیرت اہل دانش کو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عالم گیریت اسی طے شدہ منصوبے ہی کی ایک توسیع ہے۔ چناں چہ معروف اسلامی مفکر ڈاکٹر محمد عمارہ عالم گیریت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ امریکی قیادت میں مغربی اکھاڑ پچھاڑ کا نام ہے، تاکہ ساری دنیا کو غالب تہذیب کے سانچے میں ڈھالا جاسکے۔(۱) اس طرح عالم گیریت ایک زبردست کارروائی کا نام ہے جس کو زعمائے مغرب بجالا رہے ہیں، تاکہ مختلف ممالک اور معاشروں کے نظام ہائے اجتماعی میں بنیادی اور جوہری نوعیت کی تبدیلیاں لائی جاسکیں۔ جن کا طریقہ یہ ہے کہ ان اصول وضوابط کو بدل دیا جائے جو لوگوں کے باہمی تعلقات، نظم اجتماعی، اور معاشرے کی فکری، تہذیبوں اور ثقافتی اساس سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لئے بعض انصاف پسند مغربی مصنفین عالم گیریت کو استعمار کی ایک نئی قسم قرار دیتے ہیں۔

تعجب، بالائے تعجب یہ ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود عالم اسلام کے بعض اہل قلم یہ رائے رکھتے ہیں کہ عالم گیریت ایک ایسے جدید عالمی نظام کو لانے کا سبب بنے گی، جس کی بنیاد عدل پر ہوگی اور اس میں عدل ومساوات کی حکم رانی ہوگی۔ اس میں ہر ملک ومعاشرے کو آزادانہ مقابلے میں آگے بڑھنے کے مواقع دست یاب ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ ہر باخبر انسان پر یہ بات مخفی نہیں ہے، تلخ حقیقت یہ ہے کہ عالم گیریت کسی مساوات وعدل گستری یا کسی اخلاقی مقصد کو پورا کرنے کے لئے نہیں آئی ہے۔ نہ یہ

۱۔ محمد عمارہ معروف مسلم مفکر ہیں جو قاہرہ کی مجمع البحوث الاسلامیۃ سے وابستہ ہیں۔ آپ امت کی وحدت کی ضرورت پر زور دینے والے داعی ہیں۔ عالمگیریت کے حوالے سے آپ نے خطورة العولمة علی الھویة الثقافیة نامی کتاب تحریر کی ہے۔

Marfat.com

انسانیت کی نجات یا غریب معاشروں کو ان کے اقتصادی فقر یا مادی اور علمی پستی سے نکالنے کے لئے آئی ہے۔ اس کا مقصد ظلم واستحصال اور عدمِ مساوات کو ختم کرنا بھی نہیں ہے۔ اس کا مطمح نظر یہ بھی نہیں ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو اقتصادی ترقی کے سلسلے میں اپنے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے راہ ہموار کرے، اور نہ اس کا ظہور اس لئے ہوا ہے کہ غریب مسلم ممالک کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کیا جائے، تاکہ وہ مادی ترقی اور اقتصادی پیش رفت کے میدان میں آگے بڑھ سکیں، بل کہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ عالم گیریت ان تمام توقعات اور امیدوں سے بالکل مختلف کچھ اور ہی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے رونما ہوئی ہے۔

الم ناک حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور استعمار کا طرز یہ ہے کہ وہ مشرقی دنیا میں عموماً اور عالمِ اسلام میں خصوصاً رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے پرفریب نعروں اور جاذبِ نظر باتوں کو کام میں لاتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مزاحمت کو کم کیا جا سکے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ پرفریب نعرے اور جاذب نظر باتیں اکثر اوقات كلمة حق أريد بها الباطل (بات تو درست مگر اس کا مقصود غلط) کا مصداق ہوتی ہیں۔ چناں چہ آزادی، آزادانہ مقابلے، مساوات، قانون کی بالادستی، انسانی حقوق کا احترام، ملکوں کی خودمختاری کی حفاظت، معاشروں کی ثقافتوں کی حفاظت کے دعوے اور اس طرح کے دیگر نعرے جو عالمی منبروں پر بلند کئے جاتے ہیں وہ (کم از کم عالمِ اسلام کی حد تک) کسی عملی فائدے یا حقیقی ثمر کے حامل نہیں ہیں۔ ہم لوگ جنہوں نے استعمار کی ایک طویل شبِ تاریک کی فتنہ سامانیوں کا سامنا کیا اور اب فلسطین، عراق، افغانستان، بوسنیا ہرزگوینا، قبرص، کشمیر، جنوبی فلپائن، صومالیہ، جنوبی سوڈان اور دیگر ممالک میں ہمیں اس سے پالا پڑا ہے، ہم سے زیادہ کون ان نعروں کا حقیقت آشنا ہوگا جنہیں ہم دو صدیوں سے زائد کے عرصے سے مغربی مصنفین کی زبانوں سے سنتے اور ان کی تحریروں میں پڑھتے آئے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض مغربی مصنفین (جنہوں نے گزشتہ صدی

Marfat.com

کے آخر میں تاریخ کے خاتمے سے خبر دار کیا ہے) عالم گیریت کو تاریخ کے اختتام سے پہلے کا آخری مرحلہ شمار کرتے ہیں، جس میں تہذیب انسانی اپنی پختگی اور ارتقا کے اعتبار سے اپنے آخری اور مکمل طور پر اختتامی نقطے پر پہنچ جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم گیریت ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل بالادستی کا نام ہے اور عالم گیریت کے بڑے ہدف یہی دو ہیں۔ یہ رائے صرف مغرب کے بعض علمائے عمرانیات ہی کی نہیں ہے جو معاملات کو صرف فکری اور نظری پہلو ہی سے دیکھتے ہیں، بل کہ یہ مغرب کے تمام سیاسی قائدین، اصحاب قلم، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور الیکشن بورڈز کے ممبران کی ایک عمومی سوچ ہے۔ امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن نے اس بات کی صراحت کی تھی کہ امریکا کا اس بات پر یقین ہے کہ اس کا نظام اقدار پوری نوعِ انسانیت کے لئے صحیح اور درست ہے اور ہم اس بات کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کو اپنے طرز پر ڈھالیں۔

یہ بات ہمیں ایک اور بات کی یاد دلاتی ہے جس کو اہلِ مغرب نے اہلِ مشرق کی ذہن سازی کے لئے اختیار کیا ہے، اور اس کا نام ہے ''گوروں کی ذمے داری'' (White Man's Burden) (۱)، اور یہ بات معلوم ہے کہ ''گوروں کی ذمے داری''

۱۔ ''گوروں کی ذمے داری'' (White Man's Burden) ایک قدیم نظریہ ہے جس کی رو سے سفید فام باشندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سیاہ فام باشندوں پر حکومت کریں۔ اس کے نتیجے میں بدترین نوآبادیاتی نظام وجود پذیر ہوا جس کے استحصالِ اقوام کے قصے معروف ہیں۔ برطانوی شاعر رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) (1865-1936) کی ایک نظم (۱۸۸۹ء) اسی نام سے ہے جس میں اس ملوکانہ تصور کی تائید کی گئی ہے کہ برتر کو فروتر پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ اس شہرۂ آفاق نظم کے پہلے بند کے دو شعر یہ ہیں:

Take up the White Man's burden
Send forth the best ye breed
Go bind your sons to exile
To serve your captives' need;

آ کر گورے انسان کا بوجھ اٹھا۔ اپنے بہترین جوانوں کو اس کی نذر کر۔ اپنے بیٹوں کو پردیس روانہ کر۔ تا کہ وہ تیرے اسیروں کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

Marfat.com

استعمار کی بدترین شکل میں ظاہر ہوئی، جس نے عالم اسلام کے اطراف واکناف میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہادیا، ہزاروں علمی مراکز کو تہ وبالا کیا، بہت سی تہذیبوں اور ثقافتی مظاہر کو مٹا ڈالا اور اس کے نتیجے میں لاکھوں کتابیں، مخطوطات اور آثارِ قدیمہ چوری ہوگئے جو آج ہم کو مغرب کے کتب خانوں اور یورپ کے عجائب گھروں کی زینت نظر آتے ہیں:

کہاں وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اہل یورپ کی اس ''مقدس'' ذمے داری نے ماضی میں یہ کارنامے سرانجام دیئے، اور پتا نہیں کہ مستقبل میں یہ مقدس ذمے داری عالم اسلام کے حق میں کیا گل کھلاتی ہے۔

یہ بات بھی ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ مغرب کے متعدد مصنفین جنہوں نے عالم گیریت کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے اور وہ اس کو ایک مثبت اور دل کش صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی ان منفی پہلوؤں کی صراحتاً وضاحت کرتے ہیں۔ عالم گیریت کے بارے میں غیر معمولی شہرت پانے والے کتابوں کے ایک آسٹریلوی مصنف میلکم واٹرس (Malcolm Waters) ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''عالم گیریت'' معاشی نشاۃ ثانیہ کے طور طریقوں سے بڑا جوہری قسم کا تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں بھی اس کی جڑیں گہری ہیں۔(۱) ایک اور مغربی مصنف کہتا ہے: عالم گیریت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام عالم، مغرب بن جائے اور تمام امور میں اس کے سانچے میں ڈھل جائے، بل کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم سرمایہ داری کے امکانات اور مغربی اقدار کو ایک تفوق اور برتری مل جائے۔ میلکم واٹرس اپنی اس

۱۔ میلکم واٹرس (Malcolm Waters) کی اس کتاب کا نام Globalization ہے، جس میں اس نے قاری کو عالمگیریت کے حوالے سے مکمل تعارفی مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب کا ایک باب اس تصور کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے جو ان سوالات کی روشنی میں مرتب کیا گیا جو کتاب کا پہلا ایڈیشن سامنے آنے کے بعد اٹھائے گئے۔

Marfat.com

کتاب میں صراحت کرتا ہے کہ جدیدیت کی سوچ، عالم گیریت کی سوچ کا پیش خیمہ ہے، اور دونوں میں باہمی تعلق ہے۔ دونوں کا مقصد مغربی ثقافت کا پھیلاؤ، اس کے اقدار کی ترویج اور ایک سرمایہ دارانہ معاشرے کا قیام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم گیریت، کرۂ ارض پر یورپی ثقافت کی توسیع کا بہ راہ راست منطقی نتیجہ ہے۔ جس کا طریق کار دنیا کے ملکوں میں مغربی نوآبادیات کا قیام، بلادِ شرقیہ پر بہ راہ راست استعماری تسلط، مشرقی معاشروں پر مغربی طرز ہائے زندگی کی تنفیذ اور یورپی عادات کی نقالی کو رواج دینا ہے۔ اگر چہ عالم گیریت کے علم برداروں کی دل چسپی انسانی زندگی کے ثقافتی اور تہذیبی پہلو سے بھی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عالم گیریت کا اصل اور بنیادی منصوبہ اقتصادی اور معاشی ہے۔ مغرب کے عموماً اور ریاست ہائے متحدہ کے خصوصاً اقتصادی اور تجارتی مقاصد، نظام عالم گیریت میں مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

بریٹن ووڈز سسٹم (Bretton Woods system)(۱) بھی، جس کا قیام

۱۔ بریٹن ووڈز (Bretton Woods) امریکی ریاست نیوہمپشائر (New Hampshire) کا ایک علاقہ ہے جو اپنے تین تفریحی مقامات کے لیے مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے قریب ۱۹۴۴ءمیں بریٹن ووڈز کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کے نتیجے میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک وجود میں آئے۔ اس کانفرنس میں ۴۴ ممالک نے شرکت کی تھی۔ اس معاہدے کے مطابق ۳۵ امریکی ڈالر ایک اونس سونے کے برابر طے پائے تھے اور امریکہ ۳۵ ڈالر کے عوض اتنا سونا دینے کا پابند تھا۔ دنیا کی دیگر کرنسیوں کی قیمت امریکی ڈالر کے حساب سے طے ہوتی تھی۔ اس معاہدے میں بڑی چالاکی سے سونے چاندی کی بہ جائے ڈالر کو کرنسی کا معیار مقرر کیا گیا یعنی سونے کی بجائے معیار سونا کی آڑ میں ''معیار ڈالر'' لایا گیا۔ دوسرے ممالک اس معاہدے کے بعد اپنی کرنسی کو امریکی ڈالر سے ایک مقررہ نسبت پر رکھنے پر مجبور ہو گئے، چاہے اس کے لئے انہیں ڈالر خریدنے پڑیں یا بیچنے۔ اس معاہدے سے امریکہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں آ گیا۔ (گزشتہ سے پیوستہ) ۱۹۷۱ء میں ویتنام کی جنگ کی وجہ سے امریکی معیشت سخت دباؤ کا شکار تھی اور افراطِ زر تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ)

Marfat.com

مغرب کی بڑی اقتصادی قوتوں کے ہاتھوں بیسویں صدی کے وسط میں عمل میں آیا، ان قوتوں کے تجارتی مصالح اور عالمی اقتصادی نظام میں ان کی مرکزی قیادت کی حفاظت کی

اپریل ۱۹۷۱ء میں جرمنی نے امریکی دباو میں آ کر پانچ ارب ڈالر خریدے، تاکہ امریکی ڈالر کو سہارا مل سکے۔ (اس وقت امریکہ کے پاس صرف دس ارب ڈالر کا سونا تھا)۔ مئی ۱۹۷۱ئمیں جرمنی نے بریٹن ووڈ معاہدے سے ناطہ توڑ لیا، کیوں کہ وہ گرتے ہوئے امریکی ڈالر کی وجہ سے اپنے جرمن مارک کی قیمت مزید نہیں گرانا چاہتا تھا۔ اس کے صرف تین مہینوں بعد جرمنی کی معیشت میں بہتری آ گئی اور ڈالر کے مقابلے میں مارک کی قیمت ۷:۵ فیصد بڑھ گئی۔ امریکی ڈالر کی گرتی ہوئی قیمت دیکھتے ہوئے دوسرے ممالک نے امریکہ سے سونے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ سویزرلینڈ نے جولائی ۱۹۷۱ء میں پانچ کروڑ ڈالر کا سونا امریکہ سے وصول کیا۔ امریکہ نے سفارتی دباو ڈال کر دوسرے ممالک کو سونا طلب کرنے سے روکنا چاہا مگر فرانس نے جارحانہ انداز اپناتے ہوئے 19.1 کروڑ ڈالر امریکہ سے سونے میں تبدیل کروائے۔ اس طرح امریکہ اور فرانس کے تعلقات خراب ہو گئے جو آج تک بہتر نہ ہو سکے۔

۱۲ اگست ۱۹۷۱ء کو برطانیہ نے بھی ۷۵ کروڑ ڈالر کے سونے کا مطالبہ کر دیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق امریکہ اپنے پاس موجود سونے سے تین گنا زیادہ ڈالر چھاپ چکا تھا۔ حقیقی اعداد و شمار اس سے بھی زیادہ رہے ہوں گے۔

۱۵ اگست ۱۹۷۱ء کو امریکہ اپنے بریٹن ووڈز کے وعدے سے یک طرفہ مکر گیا، جسے نکسن دھچکا (Nixon shock) کہتے ہیں، کیوں کہ وہ کاغذی ڈالر چھاپ چھاپ کر اس کے بدلے عربوں سے اتنا تیل خرید چکا تھا کہ عرب اگر ڈالر کے بدلے سونے کا مطالبہ کر دیتے تو امریکہ اپنا پورا سونا دے کر بھی یہ قرض نہ چکا سکتا تھا۔ ۱۹۷۱ئکے اس امریکی اعلان سے عربوں کے اربوں ڈالر کاغذی ردی میں تبدیل ہو گئے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ ایک کا نقصان کسی دوسرے کا فائدہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والے اس نقصان کا سارہ فائدہ امریکہ کو ہوا۔ بریٹن ووڈز کا معاہدہ ٹوٹنے کے بعد ہر ملک کو اپنی مرضی کے مطابق کاغذی کرنسی چھاپنے کا اختیار مل گیا۔ اس طرح ۱۹۷۱ئکے بعد دھاتی کرنسی یا زرِ کثیف کا دور ختم ہو گیا اور زرِ فرمان (Fiat Currency) نے مستقل جگہ بنا لی۔ (ملاحظہ کیجیے: زر کاغذ (http://ur.wikipedia.org/wiki/

Marfat.com

خاطر عمل میں آیا تھا۔ یہ نظام کئی دہائیوں تک اس کے کار پردازوں کے اہداف و مقاصد کو پورا کرتا رہا، لیکن سوویت یونین کے انہدام اور عالمی معاشی منظرنامے پر چین اور جاپان کے ظہور کے بعد یہ نظام کم زور پڑ گیا۔ یہ صورت حال اس نظام (Bretton Woods System) کے سقوط کا سبب بنی۔ جس کے نتیجے میں عالم گیریت کا ظہور ہوا جس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل بالادستی اور داخلی اور خارجی طور پر اس کا کلی نفاذ ہے۔

اس غلبے اور بالادستی کے عمومی اور ہمہ جہت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ علمائے مغرب اور علومِ اجتماعی وانسانی کے ماہرین نے (جو عالم گیریت کی فکر کی روشنی میں اپنی تدوین اور تشکیل جدید کے نئے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں) علوم اجتماعی اور انسانی پر نظر ثانی کرنے کی غیر معمولی علمی کاوشیں کی ہیں۔ ایک مغربی مصنف کہتا ہے کہ نوے کی دہائی سے، عالم گیریت تمام اجتماعی اور انسانی مطالعات کے لئے ایک بنیادی فریم ورک بن چکا ہے۔

اس بات میں شک نہیں کہ اشتراکی نظام کا سقوط، سوویت یونین کا انہدام، یک قطبی دنیا کا ظہور، دو قطبی دنیا کا خاتمہ اور عالمی مالی نظام (جس کا ترجمان Bretton Woods System تھا) کا ختم ہونا عالم گیریت کی پختگی کے اہم اسباب میں سے ہیں۔ لیکن ان اسباب کے ساتھ بعض دیگر اسباب بھی ہیں جو اس نظریئے کے استحکام اور نئے عالمی نظام کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ ان اسباب کی حیثیت بھی ان اہم عوامل کی ہے جو عالم گیریت کے نظام کے لئے عملی ساز وسامان مہیا کرتے ہیں۔ ان اسباب کا تعلق ذرائع مواصلات، ٹیکنالوجی اور معلومات کے دائرے کی وسعت کے ساتھ ہے۔ یہ برق رفتار میڈیا ٹیکنالوجی وہ اہم ترین عنصر ہے جس کو ہم ثقافتی سامراج (Cultural Impirialism) کہہ سکتے ہیں اور بعض مغربی مصنفین نے اس کو برقی فرماں روائی کا نام دیا ہے، جس نے انسان کو جان جوکھوں میں ڈالنے والا حیوان بنا دیا ہے، جو ہرنئی اور لذیذ چیز پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

Marfat.com

دیگر تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کی ضرورت

یہ صورت حال (جو بہ ظاہر بدشگونی کی دعوت ہی دیتی ہے) اس مطلوبہ مکالمے کا تقاضا کرتی ہے، نہ صرف دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں کے ساتھ بل کہ عالم اسلام میں پائے جانے والے مختلف مذہبی گروہوں اور جماعتوں کے مابین بھی۔ اور بعض اسلامی ممالک کے فرقوں اور جماعتوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کے پیش نظر یہ ثانی الذکر مکالمہ اس وقت عالمِ اسلام کے فکری رہ نماؤں کی ایک ناگریز ذمے داری بن چکا ہے۔

مکالمہ شروع ہی سے اسلامی ثقافت کی ایک اہم خصوصیت اور تہذیبِ اسلامی کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔ چناں چہ قرآن کریم میں ہم کو دینی مکالمے اور مکالمے کی دعوت کے حوالے سے بڑے خوب صورت نمونے ملتے ہیں۔

پھر نبی کریم ﷺ نے اہل کتاب اور دیگر لوگوں سے متعدد مکالمے کیے۔ کبار مجتہدین نے اس سلسلے میں آپ علیہ السلام کے طرز کو اپناتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کا طریقِ کار اپنایا، جس میں مجتہد استاد اور فقہا شاگردوں کے درمیان فقہی بحث مباحثے ہوتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ اور امام شافعیؒ ان لوگوں میں سرِفہرست تھے، جنہوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ مکالمے کے طرز کو اختیار کیا، جیسا کہ امام شیبانی کی کتابیں اور امام شافعیؒ کی کتابُ الاُمّ اس بات کی شاہد ہے۔ اسلامی تہذیب کے اس مکالماتی مزاج کے آثار اور برکات ہی کا نتیجہ ہے کہ بیرونی، شہرستانی، ابنِ حزم اور اس طرح کی دیگر عبقری شخصیات کے ہاتھوں علمِ تقابل ادیان کا ظہور ہوا۔

وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہونے والے فکری رجحانات سے اسلام کا معاملہ مختلف ہے، اور اگر مسلمان دینی علم وبصیرت کے حامل ہوں تو یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اس کی انفرادیت اور تشخص دوسری ثقافتوں کے سانچے میں پگھل کر رہ جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ عالم گیریت اور انسانیت اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور اسلام کے لئے ممکن نہیں کہ

Marfat.com

اسے کسی عالمی یا انسان عنصر سے اپنے تشخص اور استقلال کے بارے میں کوئی خدشہ ہو۔ اسلام ماضی میں اٹھنے والے فکری رجحانات سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ جو آج بھی بہ کثرت ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم کو نوجوانوں اور سادہ لوح عوام الناس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متاثر ہو جائیں۔

مکالمہ عالم گیریت کی ایک اہم تہذیب خصوصیت ہونی چاہئے اور اس بات میں شروع ہی سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم ایک مضبوط اور ثمر بار مکالمے کے لئے علمی اصول وضع کریں۔ ایک کم زور اور طاقت ور کے درمیان کوئی مکالمہ تب ہی مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ عدل وانصاف اور مشترکہ بنیادوں پر ہو۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ہمارا ہدف، معاشروں، تہذیبوں اور ادیان کے پیروکاروں کے درمیان مکالمہ ہے، نہ کہ ادیان کے درمیان، کیوں کہ حق اور باطل کے درمیان مکالمے کا کوئی معنی نہیں اور ہم ایسے ہر مکالمے کو ٹھوکر مارتے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان مساوی معاملہ کرے، لہٰذا ہمیں کوئی بھی ایسا مکالمہ قابلِ قبول نہیں جو کفر وایمان، وحی وطغیان اور حق وبطلان کے درمیان برابری کرے۔

جدیدیت کا بحران

ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ مغربی جدیدیت، جس نے دنیا کو قریب سے بعید تک اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، ان اہم مسائل اور قضایا میں سے ہے جن کا سامنا امت مسلمہ کو ہے۔ یہ بات ناگزیر ہے کہ یہ مسائل امت کے داخلی فکری رجحانات کے درمیان اور عالم اسلام اور دیگر تہذیبوں کے حاملین کے درمیان ہونے والے مکالموں کا اہم ترین موضوع ہونے چاہئیں۔

اپنے آغاز اور مظاہر کے لحاظ سے اس جدیدیت کا ظہور کچھ اس طرح ہوا ہے کہ گویا یہی مغربی تہذیب کی سب سے بڑی دین ہے۔ اس لئے امت کے بہت سے افراد اس کو من وعن قبول کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ غیر معمولی مادی

Marfat.com

منفعت کا باعث ہوگی اور اس سے ان اقوام کی معاشی سطح بلند ہوگی جو اس جدیدیت کے زیرِ سایہ ہوں گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس پر یوں ٹوٹ رہے ہیں جیسے پیاسا پانی پر ٹوٹتا ہے۔ لیکن جب ہم جدیدیت پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلامی ممالک کی غیر یقینی صورتِ حال اور خلل (جو بسا اوقات امن اور سلامتی کے فساد کا موجب بنتا ہے) کے اسباب میں سے ہے۔ اس جدیدیت کے بنیادی عناصر کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ فردیت

۲۔ عقل پرستی

۳۔ مادی علوم سے غیر معمولی شغف

۴۔ ٹیکنالوجی اور تجربی علوم پر نہایت توجہ

۵۔ موجود اور مادی حقائق سے دلچسپی

۶۔ مرحلہ بہ مرحلہ نظریہ تقدمِ تاریخ کا قائل ہونا

یہ تمام عناصر اور اجزا ایسے امور پر مشتمل ہیں جو اسلامی شریعت کے اصولوں، روحِ عقیدے اور پیغامِ اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتے۔ فردیت آدمی کے مادی مصالح، حاجات اور منفعتوں کو پورا کرنے کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ اپنے خالق، اپنی قوم اور زندگی و موت کے حوالے سے اس پر کیا ذمے داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ فردیت لوگوں کی عقلوں میں حرص اور بخل کی روح پیدا کرتی ہے اور انسان کے اس اجتماعی اور اخلاقی سلوک پر اثر انداز ہوتی ہے جو اسلام کو اس سے مطلوب ہے۔ یہ صورتِ حال اس مادی ذہن اور پیغامِ اسلام کے تقاضوں کے درمیان ایک مستقل کشاکش کا باعث ہے۔

مادی مصالح اور شرعی مقتضیات کے درمیان کشیدگی کے جنم دینے میں عقل پرستی کا کردار، فردیت کے مقابلے میں کچھ کم نہیں ہے۔ پھر یہ خالص عقل پرستی (جو تمام دینی مطالبات، روحانی تقاضوں اور اخلاقی ضرورتوں سے آزادی پر اصرار کرتی اور ان کے خلاف آواز اٹھاتی ہے) تعلیمی اداروں کے نصابات اور اجتماعی و انسانی علوم میں سرایت

Marfat.com

کر چکی ہے۔ ان اداروں سے نکلنے والی نسل بہت سے امور میں ان معیارات سے بہت بعید ہے جو ایک اسلامی معاشرے میں مطلوب ہوتے ہیں۔ چناں چہ ہر وہ نسل جو مغربی یا مغرب زدہ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو رہی ہے، اس خلیج کے مزید گہرا ہونے کا باعث بن رہی ہے، جو امت کے مختلف گروہوں کے درمیان موجود ہے۔ اسی طرح اس کی وجہ سے عالم اسلام کے مختلف رجحانات کے حامل لوگوں کے درمیان کشیدگی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

یہی حال مغربی جدیدیت کے دیگر عناصر کا ہے۔ ان تمام عناصر میں جو روح کار فرما ہے وہ یہی ہے کہ تمام دارومدار انسانی عقل پر ہو، جو دنیا اور کائنات کے ان تمام امور کو خالص مادی اور منفعت کوش نظر سے دیکھتی ہے جن کا تعلق انسان کے انجام اور کائنات میں اس کے کردار کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ یہ عناصر دین اور الٰہی مصادر سے دوری پر بھی مُصر ہیں۔

فقط عالم اسلام ہی جدیدیت کے لائے ہوئے اس تہذیبی بحران سے دوچار نہیں ہے جو اخلاقی، ادبی، ثقافتی اور اجتماعی تمام پہلوؤں پر سایہ فگن ہے، بل کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تہذیبی بحران اور مابعد جدیدیت (Postmodernism) کے نظریات (جو مغربی جدیدیت کی کوکھ سے برآمد ہوئے ہیں) کا سامنا تمام تہذیبیں کر رہی ہیں۔ یہی چیز امن اور انسانی آزادی بل کہ خود مغربی تہذیب کے لئے بھی خطرے سب سے بڑا سبب ہے۔

بعض معاصر مسلم مفکرین کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب کے موجودہ بحران اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو ختم کرنا اور ان کا کوئی حل تلاش کرنا ممکن ہی نہیں ہے، خاص طور پر جب کہ یہ تہذیب ایک بلند مقام پر فائز ہو چکی ہے اور دیگر تہذیبوں اور ان کی ثقافتوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر رہی ہے۔ بعض مفکرین اس صورت حال کو اختتامی نظریات سے تعبیر کر رہے ہیں۔ چناں چہ بعض دین کے خاتمے، آئیڈیالوجی کے خاتمے، (معاذ اللہ) خالق کی موت اور تاریخ کے خاتمے کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ یہ نظریات جن کے پرچارک مغرب کے بڑے مفکرین اور اہل فلسفہ ہیں، اس تکبر، ترفع اور

Marfat.com

خود پسندی کی غمازی کرتے ہیں جن میں علمائے مغرب مبتلا ہیں۔(۱)

فلاسفۂ مغرب مادیت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ہوش ربا مظاہر کے باعث پیدا

۱۔ اختتامِ تاریخ کا یہ نعرہ غالباً سب سے پہلے فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) نے ۱۹۸۹ء میں اپنے مضمون The End of History میں بلند کیا جو امریکہ کے مجلّے The National Interest میں چھپا۔ بعد میں اس نے اسی کو وسعت دے کر The End of History and the Last Man نامی کتاب میں بیان کیا۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مغرب کی لبرل جمہوریت انسان کی آخری حکومت کی علامت اور موجودہ اجتماعی اور ثقافتی ارتقا کا حتمی نشان ہے۔ فلاسفۂ مغرب کے یہ نعرے، جیسا کہ ڈاکٹر غازی ذکر کرتے ہیں، فقط مادی ذہن اور حضرتِ انسان کے وہبی کمالات سے صرفِ نظر کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح کا تصور کبھی کارل مارکس نے پیش کیا تھا کہ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کرے گی تو یہ مخالف تاریخ (Antagonistic History) کا اختتام اور ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔ لیکن اشتراکیت آج محض ایک نظریئے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اور انسانیت کے لئے وہ کسی خطرے کی علامت نہیں ہے۔ فوکویاما کتاب کے آغاز ہی میں کہتا ہے:

The twentieth century, it is safe to say,has made all of us deep historical pessimists.into deep historical pessimist. As individuals, we can of course be optimistic concerning our personal prospects for health and happiness. By long-standing tradition, Americans as a people are said to be continually hopeful about the future. But when we come to larger questions, such as whether there has been or will be progress in history, the verdict is decidedly different.(The End of History and the Last Man,p.3, The Free Press,New York,1992)

’’بیسویں صدی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہم سب کو تاریخ کا نہایت مایوس انسان بنا دیا ہے۔ اگرچہ افراد کی حیثیت سے ہم صحت و مسرت کے معاملے میں بہت مسرور و شاداں ہیں۔ اپنی طویل تاریخی روایت میں امریکی لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں بہت پر امید ہیں، لیکن معاملہ اس وقت یقیناً مایوس کن ہو جاتا ہے جب ہم نسبتاً بڑے سوالات پر غور کرتے ہیں۔ جیسے یہ سوال کہ آیا تاریخ کا مزید ارتقا ممکن ہے یا نہیں۔‘‘

Marfat.com

ہونے والے جس غرور، تکبر اور خود پسندی میں مبتلا ہیں، اصل میں وہی اس بات کا سبب ہیں کہ وہ وقتاً فوقتاً خاتمۂ تاریخ، انتہائے تہذیب اور انسانی ترقی کے اختتام کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اس طرح کے دعوے اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ مفکرین ان غیر معمولی امکانات کے ادراک سے قاصر ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کائنات میں اپنے خلیفہ کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں۔ یہی وہ خلیفہ ہے جس کو فرشتوں کی شکل میں جلوہ گر کائنات کی تمام قوتوں کی سرتاج قوت نے سجدہ کیا۔ اس میں یہ اشارہ مضمر تھا کہ انسان کو اپنے رب کی طرف سے اوجِ کمال عطا کیا گیا ہے اور اس کو پیامِ الٰہی کے تحمل اور بنی نوع انسان میں اس کی دعوت کا ذمے دار بنایا گیا ہے، تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو کر رہ جائے۔

اس طرح کے دعوے کوئی پہلے یا آخری نہیں ہیں۔ مشہور برطانوی مفکر و مورخ آرنلڈ ٹائن بی (Arnold J.Toynbee) (۱) نے تقریباً اسی برس قبل، بیسویں صدی کے آغاز میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلامی تہذیب ان تہذیبوں میں سے ہے جو مغربی تہذیب کی طرف سے تسلط و بربادی کے زیرِ قدم عالمِ نزع میں گرفتار ہے۔ یہ دعویٰ اس نے اس وقت کیا تھا جب تاجِ برطانیہ اپنے اوجِ شباب پر تھا، اسلامی ممالک کی غالب اکثریت اس وقت مغربی استعمار کے زیرِ تسلط تھی، اس لئے برطانوی مورخ نے (تاریخ کے سبق کو فراموش کر کے اور اقوام کی سعادت و شقاوت اور تہذیبوں کے قیام اور سقوط کے اسباب

۱۔ آرنلڈ جوزف ٹائن بی Arnold Joseph Toynbee (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۵ء) لندن میں پیدا ہوئے، آکسفوڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء لندن یونیورسٹی میں بازنطینی اور جدید یونانی زبانوں، ادبیات اور تاریخ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۴ء میں لندن سکول آف اکنامکس میں بین الاقوامی تاریخ کے محقق مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں دفتر خارجہ میں محکمہ تحقیق کے ناظم بنائے گئے۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور تاریخی موضوعات پر لیکچر دیے۔ ادب، تاریخ، اور زبانوں میں متعدد اعزازات حاصل کیے۔ مشہور تصنیف A Study of History ہے، جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Arnold_J._Toynbee

Marfat.com

کو نظر انداز کرتے ہوئے) یہ گمان کرلیا کہ یہ صورت حال برقرار رہے گی جس طرح وہ بیسویں صدی کے آغاز میں تھی، چناں چہ اس نے یہ دعویٰ کرلیا اور اپنے مزعومہ دعووں اور خواہشات پر علم و تحقیق کا لبادہ اوڑھ لیا۔ لیکن جلد ہی یہ پردہ اٹھ گیا اور برطانوی استعمار کا دائرہ سکڑ گیا اور ایک بار پھر اپنے اس جزیرے میں سمٹ کر رہ گیا، جس پر اب بلند اقبالی کے سورج کا طلوع ہونا ممکن نہ رہا تھا اور اللہ کا کرنا ایسے ہوا کہ ٹائن بی زندہ رہا اور اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے دعووں کے جھوٹا ہونے کا مشاہدہ کیا۔

عالمِ اسلام اور مغرب کے درمیان یہ بحران اسّی کی دہائی کے اختتام سے غیر معمولی تیزی کے ساتھ سخت تر ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مغرب کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سوویت یونین افغان مجاہدین کے سامنے کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، جنھوں نے اپنے تمام محدود وسائل، معروف افغانی عزیمت اور ایمانی طاقت کے ذریعے اپنے ملک پر روسی حملے کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

شاید مغرب نے عالم اسلام کی مخفی قوتوں کا اور اللہ کی راہ میں جہاد و شہادت کے نظریے میں چھپی طاقت کا ادراک کرلیا تھا، اس لئے اس نے اسلام کے پھیلاؤ کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں، جس کے بارے میں یہ امکان تھا کہ فتح افغانستان کے بعد اب وہ پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

دوسری طرف اہلِ مغرب کے غرور و تکبر کو یہ بات پسند نہ آئی کہ وہ اشتراکی نظام کے انہدام اور سوویت یونین کے سقوط کو افغانیوں کی عزیمت اور مجاہدین کی صورت میں جلوہ گر اسلامی طاقت کی فتح یابی کی طرف منسوب کرے، اور سچی بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے انخلا کے بعد کے سالوں میں افغانستان کی جہادی قیادتوں نے بھی اپنے بارے میں حسنِ ظن کا کوئی اچھا موقع فراہم نہ کیا۔ چناں چہ اشتراکی نظام کے سقوط کے دس سالوں کے دوران ان کے مابین جاری رہنے والی طویل خون آشام لڑائیوں نے جہادی قیادتوں کی شہرت کو خصوصاً اور اسلامی قیادت کی صلاحیت کو عموماً نقصان ہی پہنچایا۔ چناں چہ ساری دنیا نے یہ بات باور کرلی کہ اشتراکی نظام کا سقوط اور سوویت یونین کا

Marfat.com

انہدام مغربی طاقتوں اور تہذیب کی فتح مندی سے عبارت ہے۔

اہل مغرب نے اس فتح یابی کو اپنی ان ظاہری اور مخفی کوششوں اور سرگرمیوں کے لئے وجہِ جواز بنالیا، جنہیں وہ ساری دنیا بہ شمول عالمِ اسلام میں اپنے نظام کی ترویج کے لئے بہ روئے کار لا رہے ہیں۔ بہت سے اہل مغرب اس بات کو بھول جاتے ہیں (یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں) کہ اشتراکی نظام کا سقوط فقط ایک مغربی نظام کا سقوط ہی ہے اور اس کا انہدام اصل میں ایک مغربی استعماری سلطنت کا انہدام ہے۔ اس لئے کہ اشتراکیت مکمل طور پر ایک مغربی نظام اور اہل یورپ کا نتیجہ فکر تھا۔ اس کا فلسفہ وضع کرنے میں مشرق کا کوئی دخل نہ تھا اور نہ اس کی بنیادوں اور اصولوں کی تجدید میں مشرقی فکر کا کوئی کردار تھا۔ اشتراکی نظام کا ایک مغربی نظام ہونا اور سوویت یونین کا روسی استعمار (جو مکمل طور پر بہت سے ممالک اسلامیہ پر مسلط رہا ہے) کا تسلسل ہونا معاصر عالمی تاریخ کی ایک ناقابل انکار معلوم حقیقت ہے۔

اشتراکیت اپنے متعدد خصائص اور تصورات میں مغرب کی آزاد جمہوریت کے فلسفے کے ساتھ اشتراک رکھتی ہے۔ چناں چہ مغربی جمہوریت اور یورپی اشتراکیت کے دونوں نظام مکمل طور پر سیکولر ہیں، جنہیں اس بات پر مکمل اصرار ہے کہ دین کا ریاست وحکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور معاشرے سے دین اور اخلاق کی تعلیمات کو جدا کر دینا چاہئے۔ یہ دونوں نظام، اقتصادی بھاگ دوڑ میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے کسی کردار کو قبول نہیں کرتے۔ چناں چہ ان دونوں کی تان فقط مادی منافع پر آ کر ہی ٹوٹتی ہے۔ دونوں کی بنیاد مغربی ہے اور لادینیت ان کا جزوِ اعظم۔

اشتراکیت کا ضعف ابھی واضح نہیں ہوا تھا اور اس نظام کی شکست وریخت سے دوچار ہو کر افغانستان سے اس کی قوت کا انخلا نہیں ہوا تھا کہ مغربی قوتیں ایک بار پھر سے متحد ہونا شروع ہوگئیں۔ ایک دوسرے ہدف کی تکمیل کے لئے مغرب کی اجتماعی قوتوں کا رخ پھیرنے کی تیاریوں کا آغاز ہوگیا اور اسلام کو مغرب کا دشمن قرار دینے کی باتیں اور نعرے کھل کر سامنے آنے لگے۔

Marfat.com

یورپ کی وزارتی کونسل کے چیئرمین (جو NATO کی جانب سے بات کر رہا تھا) نے اس بات کو بہ بانگِ دہل کہا کہ اسلام اشترا کی دشمن کا قائم مقام بن چکا ہے اور وہ مغرب کا نمبر ایک دشمن ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ NATO (۱) (جس کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھوں میں ہے) مغرب کے سب سے بڑے عسکری وسائل میں سے ہے، جس کو اشتراکیت کے مقابلے کے لئے وجود بخشا گیا تھا۔

یوں لگتا ہے گویا یہ اعلان عالمِ اسلام پر مسلط کی جانے والی جنگ کے اعلان کے قائم مقام ہے۔ چناں چہ مغربی صحافت اور میڈیا (یہاں تک کہ یونیورسٹیوں سے شائع ہونے والے مجلات بھی) نے عالمِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔ مغرب کے متعدد معروف مجلات نے عالمِ اسلام کے بارے میں خصوصی نمبر نکالے ہیں، جن کا مقصد اسی غرض کے لئے زمین ہموار کرنا اور ذہنوں کو تیار کرنا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات جو نوے کی دہائی اور اکیسویں صدی کے آغاز میں سیاست و معیشت کے میدانوں میں رونما ہوئے، اسی طویل روایت کے تواتر کا ایک حصہ تھے۔

سابق امریکی صدر نکسن (جس کا شمار چوٹی کے مفکرین میں ہوتا ہے اور جس کی تحریریں اسٹریٹیجک کتابوں میں اہم ترین سمجھی جاتی ہیں) بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ وہی باتیں کہتا ہے جو سموئیل ہن ٹنگ ٹن نے دوٹوک انداز میں کہہ دی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ نکسن کے انداز میں بڑی لطافت اور سفارت کاری کا امتزاج شامل ہے۔ صدر نکسن

۱۔ شمالی اوقیانوسی معاہدے کی تنظیم The North Atlantic Treaty Organisation (نیٹو) جسے شمالی اوقیانوسی اتحاد، اوقیانوسی اتحاد یا مغربی اتحاد بھی کہا جاتا ہے، ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جو ۱۴ اپریل ۱۹۴۹ء کو امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں ایک معاہدے کے تحت عمل میں لائی گئی۔ اس کا صدر دفتر بیلجیئم کے دارالحکومت برسلز میں واقع ہے۔ اس کے بانی ارکان میں امریکہ، بیلجیئم، نیدرلینڈ، لکسمبرگ، فرانس، برطانیہ، کینیڈا، پرتگال، اٹلی، ناروے، ڈنمارک اور آئس لینڈ شامل ہیں۔ تین سال بعد ۱۸ فروری ۱۹۵۲ء کو یونان اور ترکی نے بھی نیٹو میں شمولیت اختیار کر لی۔
http://ur.wikipedia.org/wiki/

Marfat.com

اپنی کتاب Seize the Moment (۱) میں کہتا ہے کہ سب سے پہلا دشمن اسلام ہے، جس کو وہ اسلامی بنیاد پرستی کا نام دیتا ہے۔ پھر وہ اسلامی بنیاد پرستی کی تشریح اور تعریف یوں کرتا ہے کہ اس سے مراد وہ نظریہ ہے جو سابقہ اسلامی تہذیب کی بازیافت اور اسلامی شریعت کے نفاذ کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ اسلام دین اور سلطنت کا نام ہے۔ یہ نظریہ مسلمانوں کے ماضی کو ان کے مستقبل کے لئے رہ نمائی کا منبع قرار دیتا ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی سے جنگ کے ہدف کو پورا کرنے کے لئے صدر نکسن کے بہ قول ایک نئے کنفیڈریشن کی ضرورت ہے، جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ، یورپ اور روس پر مشتمل ہو، تاکہ یہ نیا معاہدہ، نئے اسلامی انقلاب کا مقابلہ کر سکے، وہ عالمِ اسلام پر کمال اتاترک کے طرز کے سیکولرازم کی بالادستی قائم کر سکے۔ جس نے ایک الگ تھلگ مغربی نوعیت کا ایک لادینی نمونہ پیش کیا تھا اور سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں کو مغرب سے مربوط کرنے کی مساعی سرانجام دی تھیں۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بل کہ عالمی صحافت زعمائے مغرب اور امریکی وزرا کے ایسے بیانات نشر کر رہی ہے جو مسلمانوں اور اسلام کی محترم شخصیات کے خلاف سب وشتم سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان بیانات میں یہ لوگ عالم اسلام کے مستقبل کے بارے میں اپنی تمام نیتوں سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ چناں چہ امریکہ کے ایک صدارتی امیدوار کا کہنا ہے کہ افغانستان اور عراق پر حملہ اقدار اور روایات کی تنفیذ کا مغربی حملہ ہے، اس کا مقصد فقط سیاسی

ا۔ ڈاکٹر غازیؒ نے مضمون میں کتاب کا نام الفرصۃ السانحۃ ذکر کیا ہے جو انگریزی کتاب Seize the Moment کا احمد صدقی مراد کے قلم سے عربی ترجمہ ہے، جسے دار الہلال المصریۃ نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں امریکی نقطۂ نظر سے مابعد اشتراکیت دور کو (یا دوسرے لفظوں میں امریکی خوابوں اور ارادوں کو) دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب میں بنیادی خطاب اہل امریکہ کو ہے، تاکہ وہ اپنے آنے والے دور کی تصویر دیکھ سکیں، اور بیسویں صدی کو امریکہ کی صدی بنانے کے لئے تیاری کریں۔ اسی مناسبت سے کتاب کا نام Seize the Moment (سنہری موقع) ہے۔ کتاب کے تنقیدی مطالعے کے لئے دیکھئے: الاسلام وامریکا: حوار أم مواجہۃ، ڈاکٹر محمد مورو، الروضہ۔ مصر

Marfat.com

بالادستی نہیں۔عرب دنیا اور اسلامی ممالک کے بارے میں اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ امریکا اِن پر اُن اقدار، اصولوں اور سیاسی تدابیر کو مسلط کرے جو اس کے نزدیک ناگزیر ہیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ امریکا نے اپنی خودمختاری کے وقت جو نعرے بلند کئے تھے وہ فقط امریکی حدود ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بل کہ ان کا تعلق دیگر ممالک سے بھی ہے۔

یورپی قیادتوں کا معاملہ بھی ان تصریحات کے سلسلے میں ان کے امریکی دوستوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ چناں چہ انگلینڈ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر (Margaret Thatcher) (۱) افغانستان کے واقعات کے بعد مغرب اور عالمِ اسلام کے درمیان قائم ہونے والے معرکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ اقدار اور مصالح کے معرکے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ مسلمان، مغربی اقدار کے تارک ہیں اور ان کے مصالح مغرب کے مصالح سے متعارض ہیں۔ وہ مزید کہتی ہے کہ مسلمان امریکہ و مغرب دشمنی کی آئیڈلوجی پر عمل پیرا ہیں۔ ان کی مثال ماضی میں بالشویک تحریک (۲) کی ہے۔ وہ ایک متنوع

۱۔مارگریٹ تھیچر (Margaret Hilda Thatcher)۔برطانوی کی تاریخ کی واحد خاتون وزیرِ اعظم جنھوں نے لارڈ سالسبری کے بعد سب سے طویل دورِ حکومت پایا۔آپ برطانیہ کی کسی اہم سیاسی جماعت کی قیادت کرنے والی پہلی اور ملکی تاریخ کی واحد خاتون تھیں، جنھوں نے ریاست کے چار اہم مناصب پر خدمات سرانجام دیں۔http://en.wikipedia.org/wiki/Margaret_Thatche

۲۔بالشویک (Bolshevik) بہ معنی اکثریت۔بالشویک پارٹی روس کی انقلابی پارٹی ہے، ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کا سہرا اسی تنظیم کے سر جاتا ہے۔اس کا بانی سوویت روس کا بانی، ولادیمیر ایلیچ لینن تھا۔بالشویک پارٹی روس کی مارکسسٹ رشین سوشل ڈیموکریٹ لیبر پارٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔۱۹۰۳ء کی دوسری انٹرنیشنل کانگریس کے موقع پر روسی منشویکوں سے اختلاف پر روسی کمیونسٹوں کا یہ دھڑا ایک الگ پارٹی کی صورت میں ابھرا، جو بعد میں روسی انقلاب کی واحد نمائندہ تنظیم ثابت ہوئی، اسے کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین بھی کہا جاتا ہے۔بالشویک پارٹی کی طاقت کا دور ۱۹۱۷ء کے اکتوبر انقلاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔http://en.wikipedia.org/wiki/Bolshevik

ڈاکٹر غازی کی مراد غالباً تھیچر کی کتاب Statecraft: Strategies for a Changing World ہے۔

Marfat.com

پہلو حکمتِ عملی وضع کرنے کی دعوت دیتی ہے، تاکہ مغرب کے لئے مسلمانوں کی شکست یقینی بن جائے جس طرح اس نے اشتراکیت اور بالشویک تحریک کو شکست فاش دینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ ہیں اہل مغرب کے وہ مخفی عزائم جن کو وہ چھپاتے نہیں، اور یہ ہیں ان کے اہداف و مقاصد جن کا تعلق عالمِ اسلام کے مستقبل کے ساتھ ہے۔ فوکویاما اور ہن ٹنگ ٹن کے شائع کردہ تحقیق اور علمی مقالات اصل میں انہیں نظریات کی علمی زبان میں صدائے بازگشت ہے، جن کو مغرب کے اہلِ سیاست و صحافت سفارت کاری اور صحافت کی زبان میں ادا کرتے ہیں۔

اسی پس منظر میں وہ مشہور و معروف مقالہ سامنے آیا جس کو ہن ٹنگ ٹن نے ۱۹۹۳ء میں امریکن جرنل Foreign Affairs (Summer 1993) میں شائع کروایا تھا۔ اس مجلّے نے بحث و تمحیص اور گفت و شنید کا وہ عظیم در وا کیا جن کی نظیر (مدیرانِ مجلّہ کے مطابق) ۱۹۴۰ء سے لے کر مجلّے کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ تمام براعظموں اور مختلف ممالک کے اہل علم و دانش نے اس مقالے کے مندرجات کی تردید و تنقید کی۔

مصنف کے مطابق یہ مقالہ اصل میں ایک سوال ہے جو دنیا کے علمی حلقوں کے سامنے رکھا گیا ہے۔ مولف کا دعویٰ ہے کہ اس مقالے کی اشاعت کے تین سال بعد جو کتاب اسی موضوع پر شائع ہوئی وہ اصل میں اسی سوال کا ایک مفصل علمی اور تحقیقی جواب ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں، اور اس سے پہلے اپنے مقالے میں جن اہم مسائل کو اٹھایا ہے وہ مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہیں۔

☆ تہذیب اور تہذیبوں کا تصور، کیا ایک عالمی تہذیب کا ظہور ممکن ہے؟

☆ قوت اور ثقافت کے درمیان تعلق

☆ تہذیبوں کے مابین قوت کے توازن میں تغیر

☆ دینی ماحول میں علاقائی بنیادوں پر ثقافتوں کی تجدید پر توجہ مرکوز کرنے کا مظہر

☆ مغربی تہذیب کے بارے میں عالم گیریت کے رجحانات کی پیدا کردہ کش مکش کی اہمیت

Marfat.com

☆ اسلامی عسکریت پسندی اور مسلمانوں کی شخصیت اور انفرادیت پر مسلمانوں کے اصرار کا مسئلہ

☆ اہل چین کا چینیوں کی شناخت پر اصرار کا مسئلہ

☆ چینی بیداری اور نشاۃِ ثانیہ، اہلِ مغرب کا ردِ عمل اور جواب کیا ہے؟

☆ مغرب کا مستقبل اور تہذیبوں کا جہاں

☆ مصنف نے عالمِ اسلام کے مستقبل سے تعلق رکھنے والا ایک اور سوال بھی اٹھایا ہے، جس سے مسلمانوں کی اکثریت بے خبر ہے، اور وہ سوال بعض علاقوں میں بسنے والوں کی تعداد کے بڑھنے اور عالمی قوت کے توازن پر اس کے نتیجے میں مرتب ہونے والے نتائج کے بارے میں ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ مقالہ اس کش مکش کے خطرات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا اور نہ اس کے نتائج وعواقب سے کوئی تعرض کرتا ہے، کیوں کہ تہذیبوں کی کش مکش اور ان کا تصادم ساری انسانیت پر نہایت برے اور دور رس منفی نتائج کا باعث بنتا ہے۔ لیکن مصنف نے اس پہلو کی طرف اپنی کتاب کی تمہید اور کتاب کے آخری جملے میں صرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا ہے، چناں چہ وہ کہتا ہے:

> یہ کش مکش عالمی امن کے لئے خطرے کے شدید ترین عوامل میں سے ہے اور عالمی جنگ سے بچاؤ کی سب سے بڑی اور بہتر یہ چیز اس بات کی ضمانت ہے کہ، تہذیبوں پر مبنی ایک عالمی نظام تشکیل دیا جائے۔(۱)

یہ ہے وہ فکری صورتِ حال اور نفسیاتی پسِ منظر جس میں ہم نے تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا مطالعہ کرنا ہے۔ مغربی تہذیب کے ساتھ مکالمے کے مسئلے میں عالمِ اسلام دو جماعتوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ ایک گروہ خصوصاً وہ ہے جو مکالمے کے سودمند ہونے کے بارے میں سوئے ظن اور مکمل مایوسی کا شکار ہے، جس کے اسباب واضح ہیں۔ اس گروہ کا

۱۔ تہذیبوں کا تصادم، اردو ترجمہ، محمد احسن بٹ، ص: ۴۸۰

Marfat.com

خیال یہ ہے کہ مغربی قوتوں کی طرف سے عالمِ اسلام پر بڑھتا ہوا سیاسی دباؤ، معاشی انحطاط (جس کا سامنا عالم اسلام کے بہت سے ممالک کر رہے ہیں) اور اپنے اقتصادی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مغرب کی طرف سے عالم گیریت کی تنفیذ کی کوششیں یہ سب کچھ اس مکالمے کے مثبت نتائج کے ظہور کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔ پھر مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری (بہ شمول اس کی غیر معمولی عسکری قوت کے) فریقین کے لئے مکالمے کے میدان میں داخل ہونے کے لئے مساوی سرزمین مہیا نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ عالمِ اسلامی کی فکری قیادتوں کے ایک بڑے حصے کا مغرب کے سامنے فکری طور پر سرِتسلیم خم کر لینا اور مسلمان قائدین کی ایک بڑی تعداد کا مغرب کے آگے سیاسی جھکاؤ کسی مثبت ہدف کے حصول کے لئے کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیتا۔ پھر یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب کہ تمام اہلِ مغرب اپنے تمام دست یاب وسائل کے ذریعے عالمِ اسلام پر مغربی اقدار کی تنفیذ کو اہم قرار دینے میں یک زبان ہو چکے ہیں۔

فوکویاما یہ بات کہتے ہوئے مغربی عقلیت کی ترجمانی کر رہا ہے کہ جس جدیدیت کی نمائندگی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور ترقی یافتہ جمہوریتیں کر رہی ہیں، وہ عالمی سیاست میں غالب ترین قوت کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ اور مغرب کی اساسیات کے نمائندہ ادارے ساری دنیا میں بڑھتے رہیں گے۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ واحد مرکزی تہذیب ہے جو جدیدیت کی راہ میں بنیادی مشکلات کھڑی کر سکتی ہے۔

عالم اسلام کے لئے سیکولرازم کی بنیادوں کے ناقابلِ قبول ہونے کے حوالے سے فوکویاما اپنے غضب کا اظہار یوں کرتا ہے:

> اسلامی بنیاد پرست تحریکوں کے لئے فقط مغربی سیاسات ہی ناقابلِ قبول نہیں بل کہ ان کے ہاں جدیدیت کا اصل الاصول یعنی خود سیکولرازم ہی ناقابل قبول ہے۔(۱)

۱۔ The End of History and the Last Man, p.217

Marfat.com

اس لئے مسئلہ سادہ لفظوں میں صرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کا یا فلسطین اور عراق میں امریکہ کی سیاست خارجہ کا نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی رائے کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے کہ یہ اسلام کے اس بنیادی اور اصولی عقیدے کے خلاف کش مکش ہے جو مغربی جدیدیت اور خاص طور پر سیکولرازم کی بنیاد (سیکولرازم آف اسٹیٹ) کے راستے کی چٹان ہے۔ یہ بات اشتراکیت کے چیلنج کے مقابلے میں زیادہ بڑا چیلنج ہے۔

لیکن ان تمام اسباب اور عوامل کے برعکس، جو مکالمے کے غیر مفید ہونے کے مؤید اور نومیدی اور مایوسی کی طرف لے جانے والے ہیں، یہاں ایک اور طبقہ بھی ہے جو مکالمے کا بڑا پر جوش حامی ہے۔ وہ اس کے بارے میں بڑا پر امید ہے اور اس طبقے کو مکالمے کے اندر عالمِ اسلام کے لئے بڑی خیر اور ساری انسانیت کے لئے امن اور سلامتی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا منفی پہلوؤں کے باوجود عالمِ مغرب و مشرق اسلام کی دعوت اور پیغامِ محمدی ﷺ کے آبِ زُلال کا پیاسا ہے، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہ شمول مغربی دنیا کے، اسلام بڑی تیزی کے ساتھ زمین کے مشرق و مغرب میں پھیلتا جا رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اسلام مغربی ممالک میں تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ یہ بعض ممالک کا ایک قابل اعتراف مذہب بن گیا۔ پھر یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو یا تو مغربی ممالک کے اندر پیدا ہوئے اور زبان، جنس، طرزِ زندگی میں ان ہی لوگوں کی طرح ہو کر ان کے طور طریقوں کے سانچے میں ڈھل گئے اور اصل باشندوں کی تصویر بن گئے یا پھر وہ ان ممالک کے وہ نو مسلم اصل باشندے ہیں جن کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ان لوگوں کی یہ غیر معمولی تعداد ایک ایسی قوت کی ترجمان ہے، جس سے حکومتوں اور اربابِ حل و عقد کے لئے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

مشرقی اور مغربی ممالک میں مسلمانوں کی یہ بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان ممالک اور خود مغرب کے مستقبل کی سلامتی اور حفاظت کے لئے ایک جامع اور مسلسل مکالمہ ہوتے رہنا چاہئے۔ مسلمانوں کی تعداد ریاست ہائے متحدہ میں دس لاکھ،

Marfat.com

فرانس میں سات لاکھ، روس میں دس لاکھ اور جرمنی و برطانیہ میں چار لاکھ سے زائد ہے۔
یہ تعداد اس کے علاوہ ہے جو چین اور ہندوستان میں کئی کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

موجودہ کشیدہ صورت حال، جس کو تیز کرنے اور باقی رکھنے کی دعوت مشرق ومغرب کے بعض جوشیلے لوگ دے رہے ہیں، پوری نوعِ انسانیت کے لئے انتہائی برے نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اس لئے ان تمام علاقوں میں امن وسلامتی کا قیام صرف ان ممالک کی تہذیبوں کے مابین ایک جان دار اور ہمہ پہلو مکالمے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

اسلامی ممالک اقوام متحدہ کے اراکین کا ایک تہائی ہیں اور انسانیت کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی قراردادوں کا غالب حصہ اقوام متحدہ (جس کی ایک تہائی نمائندگی عالم اسلام کے پاس ہے۔) کی جنرل اسمبلی سے جاری ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا اسلامی اساسات اور قرآنی تعلیمات پر التزام کرنے پر اصرار اور ان کا خلافتِ اسلامیہ کے احیا کا جذبہ، جس میں اسلامی شریعت اور قرآنی تعلیمات کو منطبق کیا جاسکے، بعض مغربی مفکرین کے نزدیک (جیسا کہ ہم نے اس طرف اشارہ کیا) مسلمانوں کے تہذیبوں کے ساتھ تعلق کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن ان اسلامی جذبوں اور تمناؤں کا ان مفکرین کے نزدیک محلِ اعتراض اور تردد ہونا مناسب معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ ان میں متعدد امور ایسے ہیں جو اپنے جوہر اور حقیقت کے لحاظ سے اس تصور سے مختلف نہیں ہیں جو امریکی خودمختاری کے اعلان میں موجود ہے، جس کے مطابق نیچرل لا کا منبع خالق کائنات ہے اور انسان کے بنیادی حقوق خالق کائنات ہی کی طرف سے آئے ہیں اور ان سے انحراف جائز نہیں۔

دینی غیرت اور جوش (جس کو اہل مغرب بنیاد پرستی کا نام دیتے ہیں) اصل میں اسی مصدر کی طرف رجوع کرنے اور اسی فکر پر اصرار کرنے کا نام ہے۔ جس چیز کو بنیاد پرستی کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں اسی قرآنی قانون کی طرف لوٹنے کی ایک جمہوری کوشش ہے، جس کا مصدر خالق کائنات ہے اور ان حقوق، احکامات، فرائض اور واجبات کا ضامن ہے جو خالق کائنات نے صادر کئے ہیں۔

Marfat.com

جہاں تک مسلمانوں کے اپنے اقدار اور روایات کے قیام کے بارے میں دینی جذبے کے متعلق بعض مغربی مصنفین کی جھنجلاہٹ کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک عمومی تہذیبی مکالمے سے مانع نہیں ہونی چاہئے، کیوں کہ امریکی اقدار، سیاست اور مغربی ممالک پر اس کی سرپرستی اور تفوق کے بارے میں بعض مغربی مصنفین کے ہاں بھی اظہارِ نفرت پایا جاتا ہے۔ چناں چہ ایک فرانسیسی مصنف کہتا ہے کہ امریکی تہذیب، فرانسیسی تہذیب کے لئے خطرے کا موجب بن رہی ہے۔ امریکہ کی غلبے کی سیاست کے بارے میں جرمنی اور فرانس کے تحفظات معروف ہیں۔ جب ان اختلافات اور تحفظات کے باوجود اپنے مشترکہ مفادات کے بارے میں عالمِ مغرب مشترکہ پالیسی طے کرسکتا ہے تو ہمارے لئے بھی مغرب کے ساتھ خصوصاً اور دیگر تہذیبوں کے ساتھ عموماً مکالمے کے میدان میں داخل ہونے کے لئے کوئی مانع نہیں ہونا چاہئے۔

عالمِ اسلام، اقوام اور عالم کے مستقبل کے بارے میں قراردادوں کے سلسلے میں کسی ڈکٹیٹرشپ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ عالم اسلام نے نہ ماضی میں یہ پالیسی اپنائی اور نہ مستقبل ہی میں ایسا کرے گا۔ کیوں کہ جن اصولوں اور بنیادوں پر یہ پالیسی (مداخلت اور مطلق العنان کی پالیسی) وضع ہوتی ہے وہ اسلامی شریعت کے احکام کے ساتھ متصادم ہیں، جو صراحتاً یہ بات کہتی ہے:

لست علیهم بمصیطر (۱)

تو ان پر حاکم نہیں ہے۔

ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ امت مسلمہ سے باہر کے لوگوں اور ان کے دین کے معاملے کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، اس لئے عالم اسلام اپنے دین کی تعلیمات کے پیشِ نظر یہ بات نہیں چاہتا کہ لوگوں کو اپنی ثقافت اور نظریات کے مطابق زندگی کے دھارے سے دور کردے، لیکن اسلامی دنیا اس بات کی اجازت بھی کسی کو ہرگز نہیں دے سکتی کہ وہ اس کو اس کے طرزِ زندگی سے دور کرے۔ اگر کوئی اس طرح کی کوشش کرے گا اور اس پر اصرار

۱۔ الغاشیہ:۲۲

Marfat.com

کرے گا تو یہ اصرار زمین میں فتنے اور بہت بڑے فساد کا باعث بنے گا۔ امتِ مسلمہ بس اتنی سی بات کا اشتیاق رکھتی ہے کہ وہ انسانیت کے لئے ایک تہذیبی مستقبل استوار کرنے میں حصہ لے۔ ایک ایسا مستقبل جو اخلاق وعدالت کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہو، جس پر ایمانی سائبان تنا ہوا ہو اور جس پر روحانیت کے شمیم آرا بادل سایہ فگن ہوں۔ امتِ مسلمہ چاہتی ہے کہ انسانیت کے تہذیبی مستقبل کی تعمیر میں اس کا یہ حصہ فعال اور قائدانہ نوعیت کا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف اس کے تشخص کی حفاظت ہو، بل کہ دوسروں کے تشخص کا پورا احترام ہو، کیوں کہ اسلامی شریعت تشخص وانفرادیت کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے، جو انسانیت کے درمیان تعاون کا وسیلہ ہے۔

یہ بات تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان ایک مسلسل مکالمے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے لئے تقلیدی اور روایتی نوعیت کے مکالموں میں کسی قسم کا تساہل یا مداہنت ممکن نہیں ہے۔ عقائد اور دینی اساسیات سے تعلق رکھنے والے مناقشے کبھی قابل ذکر نتیجے یا فائدے کے حامل نہیں ہوتے، اس لئے تہذیبی مکالمے کی ضرورت پر زور دینا ضروری ہے، تاکہ انسانیت کے لئے ایک بہترین تہذیبی مستقبل کی تشکیل ہو سکے۔

مکالمے کی بنیادیں

شریعت کا مطمحِ نظر جو بھی اہداف اور مقاصد ہیں ان کا اصل الاصول عدل ہے، بل کہ تمام خدائی شریعتیں اور سماوی پیغامات، اپنے متبعین کے درمیان حقیقی اور کامل عدل قائم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۱)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعدِ عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

۱۔ الحدید: ۲۵

Marfat.com

اس میں شک نہیں کہ قیامِ عدل کا ہدف وہ اہم ترین چیز ہوسکتی ہے، جس پر آج کے اس دور میں اقوام اور معاشروں کا اجتماع ممکن ہے، جب کہ ہر طرف ظلم کا دور دورہ ہے اور مضبوط کی طرف سے کم زور کے استحصال کے نت نئے طریقے آزمائے جارہے ہیں۔ کم زور اقوام اور غریب ممالک کو اتنی بڑی کسی مصیبت کا سامنا بھی نہیں، جتنا کہ ظلم وجوار، استحصال اور ان سے جنم لینے والے آلام ومصائب (غربت، بے روزگاری، امراض ووبائیں اور پس ماندگی وغیرہ) کا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہم کو جن متواتر سیاسی، اقتصادی اور ماحولیاتی مشکلات کا سامنا ہے اور جن بہت سے مسائل سے ترقی پذیر ممالک دوچار ہیں، ان کا سبب وسائل ودولت کی تقسیم میں عدل کے توازن کا بگڑنا اور اقتصادی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات میں انصاف کے معیارات کو نظر انداز کرنا ہے۔

اس لئے سب سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مشرقی اور جنوبی اقوام کے درمیان مکالمہ ہو جو اُنہیں مشکلات سے دوچار ہیں اور ان کی زبانوں پر وہی شکوے شکایات ہیں جن کا رونا مسلم ممالک رو رہے ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ مغربی دنیا کے ساتھ مکالمے میں مظلوموں اور پسے ہوئے لوگوں کا موقف اگر ایک نہیں تو کم از کم قریب قریب تو جائے۔ پھر مغربی دنیا میں نقادوں دانش وروں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو وقتاً فوقتاً اس مغربی استیلا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہتا ہے، جس کی نمائندگی ایک خودغرض بلاک کر رہا ہے، جس کے عناصرِ ترکیبی بعض مغربی ممالک کے رہ نما اور مختلف قوموں اور بین الاقوامی ملٹی نیشنل یہودی کمپنیوں کے مالکان ہیں۔ اس طرح کے معتدل عناصر (جن کا وجود مشرق ومغرب میں کم یاب نہیں ہے) کے ساتھ اتحاد وتعاون کے بارے میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مکالمے کے اہداف کی تکمیل کے سلسلے میں ایک خیر کا پہلو ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مغربی معاشروں کی ایک غالب اکثریت کو اسلام کے خلاف دشمنی کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے یہ بات مناسب بل کہ جائز نہیں

Marfat.com

ہے کہ ہم تمام اہل مغرب کو دشمنوں اور معاندین کی صف میں کھڑا کر دیں۔ اور یہ درست بھی کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ امتِ دعوت ہیں اور ان سب کے بارے میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ امتِ اجابت کے بھائی اور افراد بن جائیں۔ رہی وہ دشمنی اور حسد جو کبھی کبھی مغربی رہ نماؤں کے ایک گروہ کی پالیسیوں اور سفارت کاری میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کی نمائندگی اغراض وخواہشات کے بعض افراد کی نہایت محدود اقلیت کر رہی ہے، اور پھر ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اس خود غرض اقلیت کے تراشے ہوئے مکر وفریب اور پروپیگنڈے سے متاثر ہے۔

ماحول کی حفاظت ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسانیت کے مستقبل اور اس کی تہذیب کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مسئلہ تمام بڑی تہذیبوں کے نزدیک مشترک موضوعات میں سے ہوسکتا ہے۔ ماحولیاتی حفاظت کے لئے مشترکہ اساسیات پر عالم گیر اتفاق ممکن ہے، کیوں کہ شریعت اسلامی میں ایسے احکام اور عمومی قواعد وارد ہوئے ہیں جو ماحولیاتی مشکلات اور ماحولیاتی آلودگی کے مسئلے سے تعرض کرتے ہیں۔ دشمنانِ اسلام نے شریعتِ اسلامی کے بارے میں جو متعدد فضول خرافات، خود غرضانہ ڈھکوسلے اور فاسد پروپیگنڈے پھیلا رکھے ہیں، ان کا ازالہ ماحولیاتی مسائل اور آلودگی (جو تہذیبی آلودگی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتی ہے) کے متوازن اور قابل عمل اسلامی حل پیش کر کے کیا جاسکتا ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیبی مظہر، جس کا مشاہدہ قرونِ وسطیٰ نے صقلیہ، اندلس، جنوب اٹلی اور مشرقی یورپ میں کیا تھا، ایک بار پھر بہت سے میدانوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یہ مظہر تہذیبی تعاون اور علوم طب، فلسفے، فکر اور تجربی علوم کے میدان سے متعلقہ ثقافت، معرفت اور علوم کے لین دین سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس کا اعتراف مشرق ومغرب کے متعدد مصنفین بھی کرتے ہیں۔ اس مظہر کے جلوہ گر ہونے اور اس تہذیبی مکالمے کے ثمر بار ہونے کے لئے، اخلاق، اجتماعی اور روحانی اقدار اور صحیح عقائد کا میدان بھی منتخب ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی دنیا میں، تربیت وتزکیۂ نفس سے تعلق رکھنے والی اسلامی کتب کے ذخیرے پر سابقہ صدیوں کے مقابلے میں غیر معمولی توجہ دی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال سے بعض منحرف گروہوں، خود غرض جماعتوں اور باطنی فکر کے حاملین نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ وہ باطنی ادب کو پھیلا رہے ہیں اور اس منحرف فکر کی طرف دعوت بھی دے رہے ہیں۔ اس لئے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس خلا کو متوازن اسلامی تربیتی ادب سے پر کریں۔

مشرق اور مغرب میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی تہذیب (جو دینی اساسات اور شرعی اصول پر مبنی ہے) اور سیکولر تہذیب کے درمیان مکالمہ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا اور تمام حالات میں منطبق بھی نہیں ہوسکتا، کیوں کہ تمام بڑی تہذیبیں دینی اساسات پر قائم ہیں، اور دینی عقائد ہرامت میں تہذیبی تعمیر کا ایک اہم رکن رہے ہیں اور حال اور مستقبل میں بھی تہذیبوں (بہ شمول معاصر مغربی تہذیب کے) کے اجزائے ترکیبی شمار ہوں گے۔ اس لئے مغربی تہذیب کے سیکولر مظاہر کے باوجود، مسیحیت اور یورپی قوموں کے دینی عقائد مغربی تہذیب کے اہم عناصر ہیں۔ اس لئے بہت سے مغربی مصنفین اپنی تہذیب کو مسیحی تہذیب کہتے ہیں۔ مسیحی عقائد کی تاثیر اور اس کی تعلیمات فقط تہذیبی مظاہر تک محدود نہیں بل کہ ان کا اثر بہت سے امور میں پایا جاتا ہے۔ چناں چہ مغربی فلسفے نے بہت کچھ اثر ان تحریروں سے قبول کیا ہے جو مسیحی متقدمین نے تحریر کی ہیں۔ مغرب کے رجالِ قانون نے دینِ مسیحی کی باقیات میں سے بہت کچھ لیا ہے۔ مغرب کے بین الاقوامی قانون کے بارے میں جس پر عالمِ مغرب کو بڑا ناز ہے، یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ وہ مسیحی تعلیمات سے ماخوذ ہے، اور مسیحی آداب اور تعلیمات طویل صدیوں تک اس قانون کے اہم ترین عناصر اور احکام رہے ہیں، یہاں تک کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں مغرب کے انٹرنیشنل لا کے بارے میں تحریر کرنے والے کئی مصنفین نے دینِ مسیحیت اور اس کے اخلاق کو انٹرنیشنل لا کے مصادر میں شمار کیا ہے۔ یہ سب کچھ اسلامی تہذیب (جو نہ کبھی اپنے دینی اصولوں اور شرعی تعلیمات سے منحرف ہوئی اور نہ ہوگی) اور اس تہذیب

Marfat.com

کے درمیان مکالمے کے سود مند ہونے کے لئے ایک نیک فال ہوگا، جس کا سرچشمہ دینِ مسیحی کی تعلیمات ہیں اور جو دنیوی معاملات میں دینی تعلیمات اور دین کے ذکر سے چیں بہ جبیں ہونے لگتی ہے، حال آں کہ ان ہی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی حکومتوں اور ممالک میں شدید دینی تعصب بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

امن میں خلل انداز ہونے والے عوامل

یہ ہے وہ فکری اور تہذیبی صورت حال جس میں ہم اس وقت جی رہے ہیں، ہمارے سامنے ایسے بہت سے اسباب ہیں جو متعدد اسلامی ممالک میں عالمی سلامتی اور داخلی امن کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی مصنفین کا خیال ہے، اور وہ عالمِ اسلام کے متعلقہ حکام کو قائل کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں کہ عالمی فوجی اور اقتصادی قوتوں کے درمیان توازن ہی عالمی امن کا ضامن ہوسکتا ہے۔ جب یہ عالمی نظام خلل پذیر ہوگا تو عالمی توازن میں خلل پیدا ہوگا۔ جب مغربی مصنفین عسکری اور عالمی قوتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وہ بڑے مغربی ممالک ہوتے ہیں جو اپنے فنی اور ٹیکنالوجی کے تفوق، مادی پیش رفت اور فوجی قوت کے ذریعے دنیا کے وسائل اور دولت پر چھائے ہوئے ہیں۔

بہت سے مغربی مصنفین اور ان کے مشرقی متبعین اقتصادی بگاڑ کو عالمی امن کے فساد کا اہم ترین سبب گردانتے ہیں، چناں چہ اقتصادی ارتقا سے ان کی دل چسپی مغربی طرز کی ہے اور وہ اقتصادی سرگرمیوں، پیداوار، مصنوعات اور نچلے ڈھانچے کے لئے مغربی طور طریقوں کو اپنانے کی صدا بلند کرتے ہیں۔

اقتصادی سرگرمی کی اہمیت اور اس کے تیز کرنے کی ضرورت کے باوجود مغربی طرز پر اقتصادی پہلو پر توجہ مرکوز کرنا دوسرے بڑے اسباب اور عوامل سے صرف نظر کرنے کا موجب ہے، جو عالمی سلامتی میں خلل اندازی اور عالمِ اسلام پر ذلت اور غلامی مسلط کرنے کے سلسلے میں زیادہ اہمیت کے حامل اور اثر رکھنے والے ہیں۔ عالمی امن میں خلل

Marfat.com

اندازی کا باعث بننے والے اہم ترین اسباب کا خلاصہ ان نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

ا۔ سائنس پر اجارہ داری قائم کرنا (جس کو ترقی یافتہ ممالک نے اپنی تعلیمی اور تربیتی سیاست کا ایک اہم اصول بنایا ہے) علم ومعرفت کی ذخیرہ اندوزی اور انسانیت کو علم ومعرفت کے چشموں پر آنے سے روکنا سب سے بڑے تہذیبی جرائم میں سے ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک تہذیبیں باہم دگر استفادہ کرتی رہی ہیں اور تہذیبی لین دین، انسانی تعامل کی اہم ترین خصوصیت رہا ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے اپنے علوم ومعارف سے استفادہ کرنے میں اہل مشرق ومغرب پر کوئی قدغن عائد نہیں کی۔ لیکن موجودہ مغربی تہذیب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو دنیا پر اپنے غلبے اور تسلط کا ذریعہ بنا کر عالم اسلام پر اس کی شناسائی کے بہت سے دروازے بند کر رکھے ہیں، کیوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اہل مغرب کے ہاں استحصالِ اقوام کا وسیلہ اور تجارتی سامان ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ تجربی علوم کے نوے فیصد ماہرین کی دل چسپی ان میدانوں کے ساتھ ہے جو مغربی ممالک کے دنیا پر غلبے کی حفاظت، اس غلبے کو مزید پختہ کرنے اور بڑے پیمانے پر ہلاکت خیز اسلحے کی تیاری کے ضامن بن سکیں۔

۲۔ دنیا کے وسائل اور کرۂ ارض کی دولت کو معدودے چند انسانوں کے پاس ذخیرہ کرنا اور انسانیت کی غالب اکثریت کو ان ثروتوں اور وسائل سے محروم رکھنا بھی ان اہم ترین اسباب میں سے ہے جو امنِ عالم میں خلل اندازی کا باعث ہیں، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے چوراسی فیصد سے زائد وسائل اور دولت انسانوں کے ایک مختصر سے گروہ کے تصرف اور قبضے میں ہیں، جس کی نسبت انیس فیصد سے زیادہ نہیں۔ رہی باقی ماندہ دولت اور وسائل، جو سولہ فیصد ہیں،، تو وہ اکیاسی فیصد انسانیت کے قبضے میں ہیں۔ یہ مختصر سا حصہ جو انسانیت کی غالب اکثریت کے ہاتھوں میں ہے، وہ بھی بڑی غیر معمولی تیزی کے ساتھ مغربی ممالک کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ منتقل ہو رہا ہے۔ جس کے راستے عالمی بنکاری نظام، عالمی ملٹی نیشنل کمپنیاں اور عالم گیریت کے جدید طور طریقے

Marfat.com

ہیں۔ یہ سب ذرائع ترقی پذیر دنیا میں دولت اور وسائل کی کمی اور مغرب میں ان کے اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں غذائی ذرائع کی کمی کوئی اتفاقی حادثہ یا انتظامی صورت حال کی خرابی نہیں ہے، بل کہ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

۳۔ عالمی قوتوں کے اہداف کی تکمیل کے لئے، عالمی، علاقائی اور ملکی وسائل کا استحصال بھی امن کی خرابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس کے مظاہر ہم ساری دنیا (بہ شمول اسلامی دنیا) میں دیکھ رہے ہیں۔

۴۔ عیسائی مصنفین، مستشرقین اور ان کے متبعین کے ہاتھوں عالم اسلام میں قوم پرستی کے نعروں کا ظہور اور پھر استعمار کی طرف سے اسلامی ممالک میں انتشار پھیلانے کے لئے ان نعروں کا استعمال، بہت سے ممالک میں مسلسل جنگوں اور امن کی بربادی کے قدیم اسباب میں سے ہے، یہ نعرے مغربی ثقافت و تعلیم کا بہ راہِ راست نتیجہ ہیں اور اسلامی ملکوں کے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ہیں، اور یہ سب کچھ مغربی ممالک کی مکمل تائید اور ادبی و مادی امداد و تعاون کی بہ دولت ہوا ہے۔

۵۔ طاقت ور ممالک (جن میں سر فہرست امریکہ ہے) کی طرف سے عالمی تنظیموں کا استحصال خصوصاً آخری دہائیوں میں جنگوں کا ایک بہت بڑا محرک ہے۔

یوں لگتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انجمن اقوام (League of Nations) کی تاسیس اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ (United Nations) کے قیام کا بنیادی مقصد ان کے فاتحین کے ہاتھوں یہ تھا کہ ان کے مصالح کی حفاظت ممکن ہو سکے۔ نیز ان کے ذریعے ان کا اثر رسوخ دائمی بن سکے، جیسا کہ اقوام متحدہ کے نظام سے پتا چلتا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے لیگ آف نیشنز کے قیام کے وقت یہ پھبتی چست کی تھی:

چیست جمعیتِ اقوام؟ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

لیگ آف نیشنز کیا ہے؟ تھوڑے سے کفن چوروں کی ایک جماعت،
جنہوں نے تقسیمِ قبور کی خاطر ایک انجمن وضع کر ڈالی ہے۔

Marfat.com

اقبال کے اس تبصرے کی تائید عالمِ اسلام سے تعلق رکھنے والے مسائل میں اقوامِ متحدہ اور اس سے پہلے انجمنِ اقوام کی کارکردگی سے ہوتی ہے۔ چناں چہ ان دونوں کا کردار اس سلسلے میں بس ایک نگران وکیل کا رہا ہے، جب کہ دوسرے مسائل میں ان کا کردار ایک فعال شریک کار کا رہا ہے۔

چناں چہ یورپ کے دل میں نسلی صفائے (Ethnic Cleansing) کی کوششیں یورپی قوتوں اور اقوامِ متحدہ کے سامنے رہی ہیں، جن میں سے ہر ایک اعلیٰ اصولوں، بلند بانگ نعروں اور کئی سالوں تک جاری رہنے والے دل فریب دعووں کی دہائی دیتا رہتا ہے۔ یہ کارروائیاں (جن میں کتنی انسانی جانیں کھیت گئیں اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سرزمین یورپ میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔) یورپی قیادتوں کے اس صفائے پر اطمینان اور خوشی کا پتا دیتی ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو امنِ عالم، حقوقِ انسانی، انسان کی عزت وکرامت اور تہذیبی مکالمے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

۶۔ عالمِ اسلام پر مغربی تہذیب کو مسلط کرنا، یہ بات امنِ عالم کے بگاڑ کے اہم ترین اسباب میں سے ہے۔

۷۔ اسلامی ممالک کے بعض پڑوسی ممالک کی طرف سے بڑھتی ہوئی اسلحہ سازی امنِ عالم کی خرابی کے اہم اسباب میں سے ہے۔ مثلاً مغربی دنیا کے کسی ادنیٰ اعتراض یا تحفظ اور عالمی اداروں کی کسی مداخلت کے بغیر اور اس کے مقابلے میں پاکستان، عراق اور ایران کے معاملے میں ایک بالکل متضاد طرزِ عمل کو اختیار کرنا عالمی امن کے بگاڑ کی ایک مستقل وجہ ہے۔

۸۔ مغربی ممالک کی طرف سے دنیا کے ملکوں پر غلبے اور تسلط کی کوششیں بھی ایک اہم سبب ہے۔

۹۔ اس غلبے کو جاری رکھنے کے لئے دباؤ بڑھانے کے وسائل کا ظاہری اور مخفی استعمال۔

Marfat.com

۱۰۔غاصب صہیونی نظام اور عالمی استعمار کے درمیان تعاون۔

ان اسباب کا حل

یقیناً یہ تمام اسباب امن وسلامتی میں بگاڑ ڈالنے کا سبب ہیں، اس لئے امن عالم کے لئے ان کے حل کی ضرورت ہے۔اوران کے حل کے لئے دو مختلف حکمت عملیوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے، تاکہ جنگ کے اسباب اور عالمی امن کے بگاڑ کے محرکات پر قابو پایا جاسکے۔اوپر کی سطح سے تعمیر کی حکمت عملی، جوملکوں اور حکومتوں کا کام ہے۔اس حکمتِ عملی کا حاصل یہ ہے کہ ملکی سطح پر پالیسیاں اور حکومتی قراردادیں بنائی جائیں اوران کوملکی سطح پر نافذ کیا جائے۔اس حکمت عملی کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کے اسباب کو دور کیا جائے، ظلم کے حالات کوختم کیا جائے اور اندرون وبیرون ملک میں عدمِ مساوات کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ دولت کی مساوی تقسیم، داخلی امن کی ضمانت، عدل وانصاف کے استقلال، قانون کی سیاست، ملکی دستور اور امن عالم کے لئے کام کرنے کے ذریعے ممکن ہے۔

نیچے کی سطح سے تعمیر کی حکمت عملی جو ایسے اقدامات پر مشتمل ہے جن کا آغاز معاشرے، افراد اور معاشرے میں کام کرنے والی جماعتوں سے ہوتا ہے۔اس حکمتِ عملی کے تحت ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا، جن کا سامنا ہم ابھی کر رہے ہیں۔تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مکالموں کا مسئلہ اسی حکمتِ عملی کا ایک اہم جز ہے۔

عالمی تہذیبی مکالمے کے حوالے سے مکالمے کو یقینی بنانے کا پہلا اقدام یہ ہے کہ تہذیبوں کے تعدد، ثقافتی تنوع کی واقعیت اور تہذیبی تعدد کو تسلیم کیا جائے۔اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ایک تہذیب کے ماننے والے، دوسری تہذیبوں کے متبعین پر اپنی اقدار کو مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں۔

یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ اقوامِ متحدہ اور اس کے مختلف ادارے، مغربی تہذیب کے متبعین کے ایک گروہ کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ چکے ہیں۔ یہ لوگ ساری

Marfat.com

دنیا پر اپنی اقدار، روایات اور ثقافتی مظاہر کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، اس مقصد کے لئے وہ اقوامِ متحدہ اور اس سے متعلقہ اداروں کو استعمال کر رہے ہیں جیسا کہ قاہرہ اور بیجنگ میں ہونے والی کانفرنسوں سے بالکل واضح ہے۔

ہمارے نزدیک یہ کوششیں استعمار اور عیسائیت کے پھیلاؤ کی ایک نئی قسم ہے۔ عالمِ اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی، کائناتی دریافتوں، اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے میدانوں میں اہلِ مغرب کے تجربات سے استفادے سے منع نہیں کرتا، لیکن اس استفادے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغربی جدیدیت کو من وعن قبول کر لیا جائے۔ کیوں کہ یہ جدیدیت مثبت اور منفی دونوں طرح کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے درمیان تمیز کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدیدیت کا مغربیت (Westernization) سے گہرا تعلق ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول، معاشرے، ثقافت، تہذیب اور تعلیم کو مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ لہٰذا مغرب زدگی، جدیدیت میں داخل اور اس کے لئے ناگریز عنصر ہے۔ مغربیت کی جڑیں، عیسائی سازی میں پیوست ہیں، اور عیسائیت کی تبلیغ ہی استعمار کا پہلا قدم ہے۔ مغربی استعمار بہت سے مشرقی اور جنوبی ممالک میں مسیحی تبلیغ کے نام سے داخل ہوا، اور اسی چیز نے پھر تجارت وصنعت کے بارے میں استعمار کے داخلے کا راستہ ہموار کیا۔ ایک ملک میں جب استعمار کی تجارت وصنعت اپنی جڑیں مضبوط کر لیتی تھی تو وہاں سے پھر اس کی جڑیں دیگر ممالک میں پھیلتی تھیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تہذیبی تنوع اور سب کے لئے آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر کو تسلیم کیا جائے۔ آرا کا اختلاف اور نقطہ ہائے نظر کا تنوع، افکار اور تہذیبوں کی تاریخ کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے، اور تہذیبوں کے مکالمے اور باہمی تبادلۂ خیالات میں اس کا وجود ناگزیر ہے۔ تہذیبی تبادلے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ایک حکیمانہ قرارداد کے بعد وجود پذیر ہو، جو کہ استفادہ کرنے والی جانب سے آزاد ہو اور اس میں غیر جانب داری کا عنصر شامل ہو۔ کسی خاص قوم کے تجربات کو ساری انسانیت پر تھوپنا اور ایک تہذیب کے ساتھ خاص طرز ہائے زندگی کی تنفیذ کا نام تہذیبی تبادلہ نہیں ہے، بل کہ

Marfat.com

اس کو ایک طرح کے عقلی استعمار اور فکری غلام سازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس مکالمے کے لئے علما، مشائخ، جامعات کے فضلا اور ثقافت وصحافت سے متعلقہ افراد کی ایسی قائدانہ ٹیم کی تیاری کی بھی ضرورت ہے، جو حکمت اور دانش مندی سے بہرہ مند ہو اور ہماری تہذیب وثقافت کی گہرائیوں کی شناور ہو۔ رہے ممالک اسلامیہ کے وہ لوگ جن کی عقلیں شکست خوردہ اور لہجے معذرت خواہانہ ہیں، اور وہ اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں، وہ ایک آزاد تہذیبی مکالمے میں اسلام کے دفاع کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے فکری اور تہذیبی استعمار کو اسلامی ممالک میں پنجے گاڑنے کا راستہ فراہم کیا ہے۔ اس طرح اسلام کی محدود اور کم زور معرفت رکھنے والے لوگوں کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ مغربی تہذیبی کے ساتھ وہ کسی نتیجہ خیز اور عمیق مکالمے میں حصہ لے سکیں۔

Marfat.com

مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج

اور علما کی ذمے داریاں

۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تدریس، ضرورت اور اہمیت'' کے زیرِ عنوان منعقد ہونے والی فکری نشست سے خطاب

Marfat.com

مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج

اور علما کی ذمے داریاں

اس وقت دنیائے اسلام جس دور سے گزر رہی ہے، یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل دور ہے۔ امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں، شاید ماضی میں اتنی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئیں۔ یوں تو ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی پوری تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے آغاز سے لے کر، جب آپ دار ارقم میں قیام فرماتھے، آج تک کوئی صدی، اور صدی کا کوئی حصہ یا کوئی عشرہ ایسا نہیں گزرا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکل بل کہ امہات المشاکل میں ایک بڑا بنیادی فرق پایا جاتا ہے جس کو اس گفت گو میں سامنے رکھنا چاہیے۔ ماضی قریب یا ماضی بعید میں دنیائے اسلام کو جو مشکلات اور پریشانیاں ہوتی تھیں، وہ عموماً زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا، پیچھے ہٹنا پڑا، پس پائی اختیار کرنا پڑی۔ یہ ایک عسکری شکست یا عسکری ہزیمت کا معاملہ تھا۔ یا کہیں مسلمانوں کی کوئی حکومت کم زور ہوئی، غیر ملکی قوتیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پس ماندگی کا شکار ہوئے، یہ سیاسی میدان میں کم زوری تھی۔ اس طرح کی کم زوریاں جو عموماً سیاسی، مالی، عسکری یا مادی ہوتی تھیں، تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہیں، لیکن ان سب مشکلات سے مسلمان عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ان میں سے کسی مشکل نے مسلمانوں کو

Marfat.com

ذہنی یا اعصابی شکست سے دوچار نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا خاندان، مسلمانوں کی تعلیم، مسلمانوں کا نظام تربیت اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal fabric) تھی، وہ اکثر و بیشتر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی۔ تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیائے اسلام پر اس سے برا وقت کوئی نہیں آیا، اور یقیناً وہ بہت برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں بل کہ منگولیا کی حدود سے لے کر مصر کے حدود تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے وسط تک، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت و تاراج کی آماج گاہ تھا۔ انھوں نے ہزاروں علمائے کرام کو شہید کیا اور بڑے بڑے جید ترین اکابر اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے۔ خواجہ فریدالدین عطار، جن کے بارے میں مولانا رومؒ نے فرمایا:

عطار روح بود وسنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی وعطار آمدیم

اس درجے کے انسان کہ جن کی پیروی پر مولانا روم جیسے آدمی نے فخر کا اظہار کیا ہے، ایسے اونچے اونچے لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے۔ کتب خانے انھوں نے جلا دیے، شہر برباد کر دیے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ

اذا قیل لك ان التتار انهزموا فلا تصدق
اگر تمھیں یہ خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی ہے تو اس پر یقین نہ کرو۔

گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی اور یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی۔ لیکن اس ساری تباہی اور بربادی کے باوجود تاتاریوں کی شکست و ریخت کا دار و مدار سارا کا سارا مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی کم زوری پر تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے منتشر اور غیر متحد دیکھا تو اس سے فائدہ اٹھایا۔ عسکری اعتبار سے کم زور پا کر نقصان پہنچایا۔ اس سے زیادہ تاتاری کچھ نہ کر سکے۔ ان کے پاس کوئی دین نہیں تھا،

Marfat.com

کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی فکری یا تہذیبی ایجنڈا نہیں تھا، اس لئے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، تربیت اور خاندانی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور ان میں سے کوئی چیز متاثر نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کو سنبھالا دیا۔ مسلمان عوام نے اہل دل اور اہل درد مصلحین کا ساتھ دیا اور بہت جلد وہ تاتاریوں کی شکست کے نتائج اور ثمرات بد سے نکلنے میں کام یاب ہو گئے۔ یہی کیفیت بقیہ بہت سے معاملات کی بھی رہی۔

آج جو صورت حال درپیش ہے، اور آج سے نہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن، ہر آنے والی رات بل کہ اب تو آنے والا ہر لمحہ خطرے کی یا پریشانی کی ایک نئی جہت لے کر آتا ہے۔ آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو۔ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ ہو، گھر کے اندر ماں اور بچوں کے درمیان کے امور ہوں، میاں بیوی کے تعلقات کا سوال ہو، گھر کی خواتین کے رویئے کا معاملہ ہو، تعلیم وتربیت کا معاملہ ہو، یا مساجد کے جاری اندر سرگرمیوں اور معمولات کا سوال ہو، ان میں سے ہر چیز آج بہ راہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے۔ تاتاریوں نے شاید کبھی یہ نہیں پوچھا ہوگا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جا رہا ہے، مسلمانوں کی نصاب کی کتابوں میں کیا لکھا جا رہا ہے، یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے کبھی یہ چیز زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح انگریز جب شروع میں یہاں آئے تو انھوں نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ جہاں جہاں گئے، وہاں مسیحی پادریوں کی حوصلہ افزائی کی، مغربی تعلیم کے اداروں کی سرپرستی کی، مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانے والوں کو طرح طرح سے نوازا، لیکن اس حد سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی داخلی زندگی، مذہبی امور اور مذہبی تعلیم میں بہ راہ راست مداخلت اور زبردستی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے ڈیڑھ دو سو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت بڑی حد تک (by and large) مغربی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے لوگ ہزاروں نہیں، بل کہ لاکھوں کروڑوں تھے جن کی زندگی کا ایک لمحہ یا

Marfat.com

ایک گوشہ بھی انگریزی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔

میرے خاندان کے ایک بزرگ تھے، حافظ محمد اسماعیل جو بڑے عالم اور محدث تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے والد تھے اور رشتے میں میرے والد کے پھوپھا تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہندوستان میں پہلے شاید ٹماٹر نہیں ہوتا تھا، بعد میں جب یہاں ٹماٹر آیا تو یہ لفظ شاید انگریزی کے tomato کی اردو شکل تھی۔ حافظ اسماعیل صاحب ٹماٹر کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تھا تو اس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے اس کا نام لال بینگن رکھا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن گھر میں انھوں نے پوچھا کہ سالن میں کیا ڈالا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ٹماٹر ڈالا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے کہ نصرانیت میرے گھر میں گھس آئی، اس کو لال بینگن کیوں نہیں کہتے؟

بہ ظاہر یہ بات آج ہمیں لطیفہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی شدت کے ساتھ مغربی اثرات میں رکاوٹ پیدا نہ کرتے تو مغربی اثرات آج سے سو سال پہلے اسی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے جس طرح آج ہر جگہ گھستے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ایک دو نہیں، ہزاروں ہیں اور سیکڑوں، لاکھوں، بل کہ کروڑوں انسان ایسے ہیں جنھوں نے مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی روکا۔ یقیناً بعض باتیں مغرب میں مثبت بھی تھیں جن کے بہت سے ثمرات سے مسلمان محروم رہے، لیکن آج یہ بات کہنا اور تبصرہ کرنا تو بڑا آسان ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں چیز پر پابندی لگا دی تھی اور فلاں شخص نے مغربی اثرات کے ثمرات سے مسلمانوں کو محروم رکھا، لیکن آج سے دو ڈیڑھ سو سال پہلے کے ماحول میں جو انسان خود کو طوفان کے سامنے کھڑا محسوس کرتا ہے، طوفان اس کو امنڈتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اپنا گھر اور وطن تباہ ہوتا اس کو نظر آ رہا ہے، اور اس طوفان کے نتائج و عواقب اس کے سامنے

Marfat.com

ہیں، وہ حالات کا جائزہ لے کر فوری طور پر ایک فیصلہ کر لے اور اس فیصلے کے نتیجے میں بعض منفی اور بیشتر مثبت چیزیں سامنے آئیں تو آج ہم یہ طے کرنے میں حق بہ جانب نہیں ہیں کہ فیصلہ کرنے والے کو کیا فیصلہ کرنا چاہئے تھا۔ ویسے بھی لو (اے کاش) سے حضور نے منع فرمایا ہے۔ ماضی میں جس نے کوئی فیصلہ کیا، اس نے اس کی ذمے داری بھی لی۔ بعض لوگوں نے ایک فیصلہ کیا تو بعض نے دوسرا۔ دونوں کے ثمرات ونتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نتائج پر تو بات کر سکتے ہیں، لیکن ماضی کو مستقبل کی طرف سے مشورہ دینا کہ ان کو کیا کرنا چاہئے تھا، یہ ایک غیر ضروری مشورہ ہے جس کا کوئی نتیجہ مستقبل میں نکلنے والا نہیں۔ البتہ ہم ماضی کے اس تجربے سے مستقبل کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ آج ہمیں کر لینا چاہئے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ جن حضرات نے ڈیڑھ سو سال پہلے امت مسلمہ کو مغرب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ سب اپنا اپنا کام کر کے دنیا سے جا چکے۔ انھوں نے جو جذبہ پیدا کیا، جس رویئے کو جنم دیا، وہ جذبہ اور رویہ آج کم زور پڑ گیا ہے اور آج مغرب کے تہذیبی، ثقافتی، فکری حتیٰ کہ مذہبی اثرات کے لئے مسلمانوں کے ہر گھر کے دروازے اور ہر کمرے کی کھڑکیاں اس طرح کھلی ہیں کہ اس میں مغرب کے کسی اچھے یا برے اثرات یا نتائج کو داخل ہونے سے روکنا آسان نہیں رہا۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات کا یہ خیال ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو ہمیں اپنے اندر آنے کا موقع دینا چاہئے اور اس کے منفی اثرات کا راستہ روکنا چاہئے۔ اگرچہ یہ رائے رکھنے والوں میں اس پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ مغرب کے کون سے اثرات وثمرات مثبت ہیں اور کون سے منفی، لیکن اصولی طور پر یہ ایک درست رویہ ہے اور ہر صاحب بصیرت مسلمان اس سے اتفاق کرے گا۔ یہ خذ ما صفا ودع ما کدر کا اسلامی اصول ہے، جس سے مسلمانوں نے ہمیشہ اتفاق کیا اور جو مسلمانوں کی فکری اور علمی تاریخ کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ کیا مغرب کا ایجنڈا ابھی یہی ہے کہ ہم خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کریں۔ جو چیز ہمارے لئے قابل قبول ہو، وہ

Marfat.com

ہمارے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیں اور جو چیز ہمارے لئے قابل قبول نہ ہو، اس کو واپس اپنی الماری میں رکھ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اس انتخاب واختیار کے رویئے سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ اپنا پورا ایجنڈا یہاں لانا چاہتا ہے اور انھوں نے ہم سے زیادہ اس مسئلے پر غور کیا ہے کہ ان کی تہذیب کا جو پورا پیکج ہے، اس کی کون سی چیزیں اس پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ تحقیقات کی گئی ہیں، کتابیں لکھی گئی ہیں اور صرف عام سطح پر نہیں بل کہ بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اس پر غور وخوض ہوا ہے۔ حتیٰ کہ خالص سیاسی قائدین بھی ان فکری اور تہذیبی مسائل پر سوچتے اور اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ نے سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کی کتاب Seize the Moment پڑھی ہو تو آپ کو یاد ہوگا کہ اس میں اس نے پوری تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کا نفوذ کس حد تک ہے اور کس طرح ہونا چاہئے۔ یہ بات نہ صرف نکسن نے لکھی ہے، بل کہ ان کے صف اول کے تمام دانش ور، مفکرین اور مدبرین یہ بات لکھ رہے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے مجھے جرمنی میں ایک اجتماع میں جانے کا موقع ملا، جس میں مختلف ممالک کے دانش ور اور مفکرین مدعو کیے گئے تھے، جن میں واحد مسلمان شریک غالباً میں تھا۔ میرے علاوہ باقی لوگ مغربی یورپ اور خاص طور پر وسطی یورپ سے بلائے گئے تھے۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: Is Islam a threat to Western Europe? (کیا اسلام مغربی یورپ کے لئے ایک خطرہ ہے؟) جرمنی کے ایک علمی اور تحقیقی ادارے نے مجھے بلایا تھا کہ میں بھی اس موضوع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ یہ کوئی ایک ہفتے کی نشست تھی جس میں انھوں نے چودہ آدمیوں کو اپنے خیالات وافکار کو تفصیل سے پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایک دن میں دو آدمیوں کی گفت گو ہوتی تھی جس میں ہر شخص تفصیل سے اپنے خیالات حاضرین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ان خیالات پر بھرپور بحث وتمحیص اور تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اس میں ایک دن مجھے بھی گفت گو کرنے کا موقع ملا، جس میں یہ سوال سامنے آیا کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کے

Marfat.com

حوالے سے کیا رویہ رہا ہے؟ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ عالم اسلام میں جب سے مغربی اثرات آئے ہیں، جس کو کم وبیش دوسو سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں دنیائے اسلام نے تین رویئے اختیار کئے ہیں۔ ان میں سے دو رویئے تو بہ تدریج کم زور ہو رہے ہیں یا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کم زور ہو رہے ہیں، اور تیسرا رویہ بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پچھلے پچاس، سو سالوں میں نسبتاً زیادہ قوت پیدا ہوئی ہے۔

ایک رویہ جو سمٹ رہا ہے اور سمٹتے سمٹتے یقیناً ختم ہونے کے قریب ہے، وہ ہے جس کی مثال میں نے لال بینگن اور ٹماٹر کے حوالے سے دی۔ اب شاید دنیائے اسلام میں اس طرح کی مزاحمت کرنے والے لوگ موجود نہیں، بل کہ اس طرح کی مزاحمت کی افادیت کے قائل بھی میں سمجھتا ہوں کہ نہیں رہے۔ اگر ہیں تو بہت تھوڑے لوگ ہیں جن کا کوئی قابل ذکر اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ یہ وہ رویہ تھا جو ابتدا میں بہت مضبوط تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ختم یا بہت کم زور ہوتا گیا۔

دوسرا رویہ جو شروع میں بہت قوت سے سامنے آتا محسوس ہوتا تھا، مسلمانوں کی اکثریت نے اس سے بھی زیادہ اتفاق نہیں کیا اور یہ رویہ بھی، جس کی نمائندگی انیس ویں صدی کے اواخر میں ایک طبقے نے بہت زور وشور سے کی، کم زور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ وہ مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کا رویہ ہے۔ اس رویئے کے علم بردار حضرات نے یہ سمجھا کہ مسلمان اگر مغرب کے ساتھ سو فیصد ہم آہنگی کر لیں تو شاید ان کے تمام مسائل حل اور تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس رویئے کے ترجمان انیس ویں صدی کے اواخر اور بیس ویں صدی کے آغاز میں دانش وروں میں بھی، سیاسی رہ نماؤں میں بھی اور عام سطح پر بھی کثرت سے پائے جاتے تھے، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ رویہ بھی کم زور ہو رہا ہے۔

تیسرا رویہ جو آغاز میں بہت کم زور اور تقریباً برائے نام تھا، اب دنیائے اسلام میں اس نے اپنی جگہ بنا لی ہے اور مسلمان مفکرین اور دانش وروں کی ایک بڑی تعداد اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہی خذ ما صفا ودع ما کدر کا رویہ ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مسلمانوں کو پورا پورا استفادہ کرنا

Marfat.com

چاہیے۔ مغرب کی سائنس، مغرب کی ٹیکنالوجی، مغرب کی سہولتیں، یہ سب چیزیں مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہیں۔ ان کو سیکھنا چاہیے اور ان کو اپنانا چاہیے، البتہ اہل مغرب کے تہذیب وثقافت کے جو منفی پہلو ہیں، مثلاً اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات ونظریات، یا سیکولرازم اور لا مذہبیت، یا مرد وزن کی آزادی کا تصور جو ان کے ہاں ہے، یہ سب باتیں خلاف اسلام ہیں، یہ چیزیں دنیائے اسلام کو قبول نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ رویہ پہلے بہت محدود تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور آج دنیائے اسلام کی ایک بڑی تعداد اس رویئے پر کاربند محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء میں مذکورہ اجتماع میں جب میں نے ایک سوال کے جواب میں مذکورہ تجزیہ تفصیل سے بیان کیا تو اس کے جواب میں اجتماع کے شرکا نے، جن میں فرانسیسی نمائندے بھی شامل تھے، جرمن اور آسٹریا کے لوگ بھی شامل تھے، تقریباً بالاتفاق مجھے controvert کیا اور کہا ٹھیک ہے، آپ اس رویئے کو درست سمجھتے ہوں گے لیکن مغرب ان شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور اپنی تہذیب وتمدن سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پہلی مرتبہ یہ پہلو میرے سامنے آیا۔ اس سے پہلے میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں کبھی یہ سوال نہیں آیا تھا کہ آیا مغرب بھی اس بات پر تیار ہے یا نہیں کہ آپ کی شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور تہذیب سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دے۔ کم از کم اس اجتماع کے شرکا کا جواب بالاتفاق یہی تھا کہ مغرب آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گا۔ مغرب کی رائے میں یہ ایک پورا پیکج ہے جس کو آپ کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا اور اس میں وہ آپ کو اخذ وانتخاب (pick and choose) کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ یہ دانش ور اور مفکرین شاید اپنے ہاں کی جمہور یا اکثریت کی رائے کی ترجمانی نہیں کر رہے، اور مغربی تہذیب میں جو فیصلہ کن قوتیں ہیں، ان کی زبان نہیں بول رہے۔ اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ جس طرح ہر شخص اپنی تہذیب کے بارے میں ایک عصبیت کا رویہ رکھتا ہے، یہ حضرات بھی اپنی تہذیب کے بارے میں شدید عصبیت اور حمیت رکھتے

Marfat.com

ہیں اور اس عصبیت کی وجہ سے یہ بات ان کو پسند نہیں آئی کہ ہم ان کی تہذیب کے بعض پہلوؤں کو کم زور، غیر اخلاقی اور منفی قرار دے کر مسترد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک کم زور اور غریب فقیر آدمی کسی دولت مند شخص سے، جس کا وہ ممنون احسان بھی رہتا ہے اور اس کے خاندان کے بہت سے افراد اس کے زلہ ربا بھی ہوں، یہ کہے کہ آپ کی کوٹھی یا محل میں فلاں فلاں چیزیں مجھے غلط اور بے محل معلوم ہوتی ہیں اور میں انھیں مسترد کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ منفی تبصرہ، وہ بھی ایک محتاج کی زبان سے ایک دولت مند مربی کو اچھا نہیں لگے گا اور وہ اس کو بے وقوف سمجھے گا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ شاید وہ طرح کی اس نفسیاتی کیفیت میں میری بات کی تردید کر رہے ہیں، لیکن پچھلے بارہ پندرہ سالوں میں مغرب کے بہت سے لوگوں سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور اب مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ان کی طے شدہ پالیسی ہے جو انھوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ دنیائے اسلام اپنے آپ کو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے اور مکمل طور پر مغربی ایجنڈے کو اختیار کرے تو مشرق و مغرب میں پر امن بقائے باہمی ممکن ہے، اور اگر دنیائے اسلام اس شرط کے ساتھ بقائے باہمی کے لئے تیار نہ ہو تو مغربی تہذیب کے فوائد یا مثبت اثرات سے مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر متمتع ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ بات جو ۱۹۹۴، ۱۹۹۵ء سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی، اب وقت کے ساتھ ساتھ روز روشن کی طرح یوں واضح ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پوری دنیائے مغرب کا ایک طے شدہ فیصلہ ہے کہ دنیائے اسلام پر مغرب کے ایجنڈے کو سو فی صد نافذ کیا جائے اور عالم گیریت کے نئے نظریات اور تصورات سے کام لے کر اہل مشرق کو بالعموم اور دنیائے اسلام کو بالخصوص مغرب کا تابع مہمل اور نقل مطابق اصل بنایا جائے۔

مغرب کا ایجنڈا ایک ہمہ گیر ایجنڈا ہے اور اس میں سیاست و معیشت، تجارت و مالیات اور تعلیم و ثقافت سے لے کر فرد اور خاندان تک ہر چیز شامل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو بہت سے کام ہو رہے ہیں، وہ محض اتفاق سے یا مسلمانوں کی کم

Marfat.com

زوری کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں میں کمزوریاں بھی ہیں اور ان کی دینی حمیت میں کمی بھی آئی ہے، ان کے آپس کے اختلافات اور شخصی اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ نے ان کے لئے ان گنت مسائل پیدا کئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ بالادست قوتیں بھی ہیں جو طے شدہ پروگرام کے تحت آگے بڑھ رہی ہیں اور دنیائے اسلام کو ایک خاص رخ پر چلانا چاہتی ہیں۔ اب مسلمان کس حد تک اس میں ساتھ جانے کو تیار ہیں، اس کے بارے میں مختلف طبقوں کے ردعمل مختلف اور رویے متفاوت ہیں۔ حکم رانوں کے مفادات یہاں عامۃ الناس کے احساسات اور تصورات سے متعارض ہیں۔ مسلمان دانش جو سمجھتے ہیں کہ مغرب کی مثبت چیزوں سے اتفاق کریں اور منفی چیزوں کو مسترد کر دیں، وہ کس حد تک اس میں کام یاب ہوں گے، اور مستقبل کیا خبر لائے گا، یہ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے، لیکن اس رویے کی کام یابی کا سارا دار و مدار مسلمانوں کے فہم صحیح پر، مسلمانوں کی بصیرت اور ان کے عزم و ارادے پر ہے، اور اس فہم صحیح کے لئے جو چیز سب سے پہلے درکار ہے، وہ خود دنیائے اسلام میں اسلامی تہذیب، اسلامی علوم وفنون اور معارف اسلامی سے گہری اور ماہرانہ واقفیت ہے۔ جب تک شریعت اور شریعت کے پیغام اور تعلیم میں یہ گہری بصیرت اور ماہرانہ واقفیت پیدا نہیں ہوگی، اس وقت تک کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں ہو سکتی جس پر آگے چل کر عمارت کھڑی کی جا سکے۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی اساس قرآن مجید تھا۔ قرآن مجید وہ جڑ فراہم کرتا تھا جس سے علوم وفنون کا سدابہار گلستان پیدا ہوا، جس نے ایک ہزار سال تک دنیا کو علم وتحقیق کے ثمرات سے بہرہ مند کیا۔ یہی وہ درخت تھا جس کے برگ وبار اور ثمرات مسلمانوں کے بقیہ علوم وفنون کی صورت میں سامنے آئے۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے قاضی ابوبکر بن العربی نے، جو ایک مشہور مفسر اور مالکی فقیہ ہیں، لکھا تھا کہ مسلمانوں کے جملہ علوم وفنون کی تعداد سات سو ہے۔ ان سات سو علوم وفنون کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سنت سے ہے اور یہ سب کے سب سنت کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں، اور سنت رسول قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی حیثیت اس

Marfat.com

بنیاد اور جڑ کی ہے جس پر مسلمانوں کی ساری تعلیمی، فکری اور تہذیبی سرگرمی کا دارو مدار ہے۔ یہی بات ایک جگہ قبل ازیں امام شافعی نے فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ مسلمانوں کے تمام اقوال ونظریات سنت رسول کی شرح ہیں اور سنت رسول قرآن مجید کی شرح ہے۔ یہ کیفیت کم وبیش گیارہ، بارہ سو سال قائم رہی اور ایک منفرد تعلیمی روایت نے اس کیفیت کو برقرار رکھا۔ ایسے نظام تعلیم نے جس کی اساس قرآن مجید، سنت رسول اور ان دونوں سے پیدا ہونے والے علوم وفنون پر تھی، امت مسلمہ کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ امت مسلمہ میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، دنیائے اسلام میں بڑی بڑی تہذیبیں سامنے آئیں، اور یورپ کے کم وبیش آدھے حصے پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلمانوں کی فوجیں آسٹریا کے حدود تک پہنچیں اور ویانا کا محاصرہ کیا۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمانوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اسپین میں آج بھی مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت کے آثار موجود ہیں۔ جہاں بانی کے اس پورے سلسلے میں اسلامی علوم وفنون اور وحدت پر مبنی نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کیے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔

یہ تاثر کہ دینی اور دنیوی علوم جدا جدا اور الگ الگ بہنے والی مختلف نہریں ہیں، اسلامی تاثر نہیں، بل کہ یہ مغرب کا تحفہ اور مغربی سیکولرازم کے باقیات سیئات واثرات بد میں سے ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں اور میں بغیر کسی تردد کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جب تک مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے یہ دو نظام الگ الگ برقرار رہیں گے، دنیائے اسلام میں سیکولرازم کو فروغ ملتا رہے گا۔ جو علمائے کرام دینی اور دنیاوی تعلیم کو الگ الگ رکھنے پر مصر ہیں، وہ اپنے اس رویئے سے سیکولرازم کو فروغ دے رہے ہیں، وہ سیکولرازم جس کو مغرب کا سب سے بڑا فکری اور نظریاتی فتنہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیکولرازم کیا ہے؟ سیکولرازم یہ ہے کہ دنیا کے معاملات دین اور مذہبی کی راہ نمائی سے آزاد رہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہوں۔ جو چیز مذہبی ہے، وہ مذہبی دائرے میں رہے اور جو غیر مذہبی ہے، وہ غیر مذہبی دائرے میں رہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی ہم آہنگی اور

Marfat.com

اتفاق پیدا نہ ہو۔ یہ دونوں ایک نہر یا ایک دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی آپس میں نہیں ملتے اور ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہتے ہیں۔ زندگی کو دو متوازی (بل کہ متحارب) نظاموں اور دو متوازی حصوں میں تقسیم کرنے ہی کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ یہی لا مذہبیت اور لا دینیت ہے۔ لا دینیت کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

انگریز کے زمانے میں جب مسلم معاشرے کی اصل کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی تو اس وقت مسلمانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کے لئے ایک خالص دینی نظام تعلیم کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی اور امت مسلمہ میں مذہب کی باقیات کو بچانے کا واحد طریقہ کار یہی تھا کہ مذہبی تعلیم کے نام پر جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ کیا جائے اور جس حد تک مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، رکھا جائے۔ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام موجود رہے ہوں۔ چناں چہ مغلیہ دور میں جس نظام تعلیم اور جن درس گاہوں نے، جس نصاب تعلیم اور جس تعلیمی روایت نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کا یہ تعارفی جملہ میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں

The greatest religious genius produced by Muslim India.

سب سے بڑا مذہبی عبقری جو مسلم ہندوستان نے پیدا کیا۔

وہ شیخ احمد سرہندی تھے اسی نظام میں نواب سعد اللہ خان بھی تیار ہوا تھا جو مجدد صاحب کی طرح اس نظام کی پیداوار تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا، وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما جیسی بڑی بڑی ریاستوں کے بیشتر حصے پر مشتمل تھی۔ اس وسیع سلطنت کے نظام کو اس نے شاہ جہان کے زمانے میں کام یابی سے چلایا تھا۔ پھر استاد احمد معمار جس نے تاج محل بنایا، یہ بھی اسی نظام کی پیداوار تھا۔ یہ تینوں ایک ہی نظام تعلیم کے ثمرات تھے اور ایک

Marfat.com

ہی نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب دیکھئے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کامیاب ترین ادوار میں قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مذہبی عبقری ہے، جس کی فکری گہرائی اور روحانی عظمت کو بیان کرنا بھی دشوار ہے، اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد یہ ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ یہی اسلام کا آئیڈیل اور یہی اسلام کا معیار ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہم اس پر از سرنو غور کرتے اور یہ طے کرتے کہ آزاد مسلم مملکت پاکستان میں تعلیمی ضروریات کیا ہوں گی، پاکستانی معاشرے کو دینی راہ نمائی فراہم کرنے کے لئے کس انداز کے اہل علم درکار ہوں گے، پاکستان کی اسلامی خطوط پر تعمیر نو کے لئے کیسے ماہرین کی ضرورت ہوگی، لیکن غور وفکر کا یہ کام نہ حکومتوں نے کیا اور نہ ہی اہل علم نے اس پر ابھی تک کوئی توجہ دی ہے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جس پر ملک وملت کی آئندہ تعمیر کا دارومدار ہے۔ اس پر جتنی جلدی غور کر کے اس کو حتمی طور پر طے کر لیا جائے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام پوری امت مسلمہ کی تاریخ کے ایک مرحلے کی تشکیل نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے اور میں اس کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا ہوں جتنی اہمیت دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تھی۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا اور اسے ہرگز غیر اہم نہیں سمجھتا۔ برصغیر اور پورے جنوبی ایشیا میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں مسلمانوں کی پوری مذہبی تاریخ دارالعلوم دیوبند اور اس کے موسسین کی مرہون منت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وقتی اور دفاعی حکمت عملی تھی۔ اب ضرورت دائمی اور اقدامی حکمت عملی کی ہے۔ یہ کام جس کا آغاز آج مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ہم خیال اہل علم نے کیا ہے یا کر رہے ہیں، اگر یہ نتیجہ خیز ثابت ہو تو اس کے اثرات

Marfat.com

دیو بند کے اثرات سے کہیں زیادہ دیرپا اور دوررس ہوں گے، اس لئے کہ یہ اس روایت کا احیا کرنے کے مترادف ہے جو اصل اسلامی روایت ہے۔ دار العلوم دیو بند کی کاوش یا مہم ایک بدلی ہوئی صورت حال میں دفاعی اور وقتی کوشش تھی۔ وہ آئیڈیل صورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آئیڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دست یاب تھے، نہ حکومتی سرپرستی دست یاب تھی، اور نہ وہاں کے فارغ شدہ حضرات کے لئے قیادت کے مناصب موجود تھے، نہ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے راہ نمائی لینے کے لئے تیار تھا۔ ان کی راہ نمائی مسجد اور مدرسے کے خاص دائرے تک محدود تھی۔ اس کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا، وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے کیا اور بہت دردمندی اور اخلاص و قربانی کے جذبے سے کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا اور آج جتنا دین موجود ہے، وہ اکثر و بیشتر ان ہی کی کاوش کی وجہ سے موجود ہے۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دین موجود ہے، اس کو زندگی کے روزمرہ معاملات سے Relate کیا جائے اور اس کو دوبارہ معاشرے میں فعال قائدانہ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اہل دین کے پاس دینی علوم کا تخصص بھی موجود ہو اور جس دنیا اور جس معاشرے میں انھیں قیادت فراہم کرنی ہے، اس کے بارے میں بھی قائدانہ اور ناقدانہ واقفیت انھیں حاصل ہو۔

جب میں یہ بات عرض کرتا ہوں تو بعض علمائے کرام یہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے انھوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میں دینی تخصصات کو غیر اہم سمجھتا ہوں اور ان کی جگہ دوسرے دنیاوی تخصصات کو فروغ دینا چاہتا ہوں۔ ان حضرات کے خیال میں گویا میں اس بات کا داعی ہوں کہ دینی مدارس کو میڈیکل کالجز میں تبدیل کر دیا جائے یا مغربی تعلیم اور فنی تخصصات کے ادارے بنا دیا جائے۔ ایک بڑے محترم اور بزرگ عالم نے مجھ سے غصے سے پوچھا کہ کیا انجینئرنگ کالج میں مولوی تیار ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر دینی مدارس میں انجینئر کیوں تیار ہوں؟ لیکن یہ ایک خلط مبحث ہے۔ نہ یہ مقصد ہے اور نہ یہ اعتراض درست ہے۔ اس لئے کہ نہ انجینئر تیار کرنا مقصد ہے اور نہ میڈیکل ڈاکٹر تیار کرنا، بل کہ علمائے کرام ہی تیار کرنا مقصد ہے، لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد یا کم از کم ملا محب اللہ

Marfat.com

بہاری، میر زاہد ہروی اور نواب سعد اللہ کی طرح کے علما۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کا ایک محاورہ اور ایک زبان ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت تو ایسے سرچشمے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کا محاورہ ہر دور کے لئے ہے اور ہر دور کے لئے رہے گا۔ ان کے محاورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ ہمیشہ وہی رہے گا، اور ان کو ہمیشہ ان ہی کے محاورے اور ان ہی کی اصطلاح میں سمجھا جائے گا، لیکن فقہائے کرام، شارحین حدیث اور مفسرین نے شریعت کے نصوص کو اپنے اپنے زمانے سے Relate کیا اور اپنے زمانے کے محاورے میں اس کی تعلیم کو مرتب کیا ہے۔ یہ محاورہ حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ ماضی میں بھی بدلتا رہا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔ اس کی چھوٹی سی مثال میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ وہ علمائے کرام جن کے پاس ٹھوس دینی علوم موجود ہیں، ان کے پاس گویا بجلی کا پاور ہاؤس اور اس میں قوت کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے سے استفادے کے لئے ضروری ہے کہ استفادہ کرنے والوں اور پاور ہاؤس کے درمیان کنکشن ممکن بھی ہو اور موجود بھی۔ دونوں ایک ہی وولٹیج پر کام کرتے ہوں۔ اب یہ پاور ہاؤس تو دائمی ہے، وولٹیج اس آلے کے بدلنے سے بدلتا رہے گا جس کو بجلی سے چلانا مقصود ہے۔ یہی حال علمائے کرام کے وولٹیج یا محاورے کا ہے۔ چوں کہ ان کا محاورہ آج کے محاورے سے مختلف ہے، اس لئے دور جدید کا آدمی ان کے علم سے استفادہ نہیں کرتا۔

آج سے کم و بیش ۲۵ سال پہلے وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی۔ جسٹس صلاح الدین مرحوم اس کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ بہت نفیس انسان تھے۔ میرے مشورے سے انھوں نے بعض علمائے کرام کو وفاقی شرعی عدالت کا مشیر مقرر کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جن حضرات کو آپ نے مشیر مقرر کیا ہے، جن کی تعداد ۳۰، ۳۵ کے قریب تھی، ان سب کو آپ کھانے کی دعوت دیں۔ چناں چہ انھوں نے پورے پاکستان سے ان جید علمائے کرام کو کھانے کی دعوت دی۔ ایک بزرگ جو بہت ٹھوس عالم تھے، انتہائی گہرا علم رکھتے تھے، وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ چیف جسٹس صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت!

Marfat.com

Islamic State کی Minimum requirement کیا ہے؟ بالکل یہی الفاظ تھے، یعنی کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ اس کا وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔ شاید سمجھے نہ ہوں۔ جسٹس صاحب نے دوبارہ اردو میں پوچھا کہ اسلامی ریاست کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ تو اس پر بھی وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔ میں تھوڑے فاصلے پر تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ صف اول کے عالم ہیں، اگر یہی چیف جسٹس کے اس سوال کا جواب نہ دے سکے تو ہوسکتا ہے کہ علما کے بارے میں ایک منفی تاثر جسٹس صاحب کے دل میں بیٹھ جائے۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ شاید چیف جسٹس صاحب یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ دارالاسلام کی تعریف کیا ہے؟ اب انھوں نے فوراً جواب دیا اور بڑے مدلل انداز میں جواب دے کر چیف جسٹس کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس وقت یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ علمائے کرام کے پاس علم تو ہے، لیکن اس کو آج کل کے انسانوں کے لئے دست یاب کرنے کے لئے جس محاورے کی ضرورت ہے، وہ محاورہ کم یاب ہے۔

محاورہ ہر زمانے کا مختلف ہوتا ہے اور ہر زمانے کے علوم سے متاثر ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں میں منطق اور یونانی علوم وعقلیات کا رواج نہیں تھا، آپ اس زمانے کی اصول فقہ کی کتابیں دیکھیں کہ ان کا انداز کیا تھا؟ امام شافعی کی کتاب الرسالہ پڑھیں۔ اس کے بعد آپ خود شافعی فقیہ امام غزالی کی المستصفی پڑھیں۔ دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسرار حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ اسرار حدیث پر معالم السنۃ میں امام خطابیؒ نے بھی لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں معالم السنۃ سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ آپ ان دونوں کتابوں کو پڑھیں تو دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ شاہ ولی اللہ کا محاورہ سارے کا سارا یونانی فلسفے اور عقلیات پر مبنی ہے اور یونانی فلسفہ جیسا کہ برصغیر میں پڑھایا جاتا تھا، میبذی اور شرح ہدایۃ الحکمۃ اور فلسفے کے بارے میں جو جو کتابیں اس وقت رائج تھیں، ان سب کے اثرات اور مصطلحات شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہیں۔ غور فرمایئے

Marfat.com

کہ علم حدیث کی بات ہو رہی ہے اور شاہ صاحب علم اسرار حدیث پر گفت گو فرما رہے ہیں، لیکن منطق اور فلسفے کے محاورے میں۔ جو بات خطابی نے کی ہے، وہی بات شاہ صاحب کہہ رہے ہیں اور اسی کو آگے بڑھا رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے اسلوب اور ایک نئے لہجے اور انداز بیان میں۔ اگر خطابی شاہ صاحب کے زمانے میں زندہ ہوتے تو شاہ صاحب کے بہت سے مباحث کا شاید ایک لفظ نہ سمجھتے اور ان کو شاید یہ پتہ نہ چلتا کہ شاہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں، جیسا کہ چیف جسٹس صاحب کی بات وہ بزرگ عالم نہیں سمجھ پائے۔

اگر آپ کے پاس ریڈیو سیٹ تو ہو، لیکن ریڈیو اسٹیشن سے جس فریکونسی پر پیغام نشر ہو رہا ہے، آپ کا ریڈیو سیٹ اس فریکونسی پر کام نہ کرتا ہو تو آپ کے لئے وہ ریڈیو سیٹ بھی بے کار ہے۔ جب تک آپ اپنے ریڈیو سیٹ کو مطلوبہ فریکونسی پر نہیں لائیں گے، آپ ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ علمائے کرام کے پاس جو علم دین کا پاور ہاؤس ہے، اور ایک عام آدمی جو دین کی راہ نمائی چاہتا ہے اور جس کو آپ راہ نمائی دینا چاہتے ہیں، ان دونوں کی فریکونسی ایک ہو۔ اس فریکونسی کو موافق بنانے کے لئے ایک تو تخصص ضروری ہے جس پر میں ابھی مزید بات کروں گا، اور دوسرا دور جدید کا محاورہ درکار ہے۔ یہ خلط مبحث اور غلط فہمی ہے کہ علما کو انجینئر یا ڈاکٹر بنانا مقصود ہے۔ نہیں، بل کہ مقصود یہ ہے کہ وہ علوم وفنون جنھوں نے آج کل کی تہذیب کی تشکیل کر رکھی ہے اور جن کی بنیاد پر آج ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے، حتیٰ کہ پاکستان، سعودی عرب اور ایران میں بھی چل رہا ہے، ان علوم وفنون سے علما بھی مناسب طور پر واقف اور مانوس ہوں۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم وفنون کی ایک الگ تقسیم کی تھی۔ کچھ علوم مقاصد یا علوم حقیقی ہیں اور کچھ علوم وسائل یا علوم آلیہ ہیں۔ اسی طرح کچھ علوم ہیں، کچھ صنائع ہیں اور کچھ فنون ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اختیار کردہ تقسیم تھی۔ آج عملاً یہ تقسیم موجود نہیں ہے۔ آج تعلیم کا نظام عملاً اس تقسیم پر نہیں چل رہا۔ آج دنیا میں ایک نئے انداز سے علوم کی مختلف تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک اہم تقسیم علوم عمرانی (Social

Marfat.com

(sciences) اور علوم انسانی (Humanities) کی ہے۔ سوشل سائنسز میں وہ ان علوم وفنون کو شامل کرتے ہیں جو انسانی معاشرے کی تشکیل اور معاشرتی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور کسی حد تک قانون شامل ہیں۔ یہ عمرانی علوم ہیں جن سے اجتماعی رویوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ انسانیات یعنی Humanities وہ علوم ہیں جو انسان کے مطالعے پر مبنی ہیں، یعنی فرد کے خیالات، فرد کے افکار، فرد کی نفسیات، فرد کے احساسات وجذبات، یہ سب کے سب ہیومینٹیز کہلاتے ہیں۔ اس میں فلسفہ، نفسیات اور بشریات شامل ہیں۔

علوم وافکار کے میدانوں میں یہ میدان ہیں جن سے دورِ جدید میں تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ آج ہمارا ایک پڑھا لکھا انسان، چاہے وہ پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا مصر کا یا کسی بھی اسلامی ملک کا، جب وہ بات کرتا ہے تو اسلامی علوم اور تصورات کے تناظر (perspective) میں بات نہیں کرتا۔ وہ اسلامی اصطلاحات یا فقہی سیاق وسباق یا فقہی محاورے میں بات نہیں کرتا، بل کہ وہ مغربی سوشل سائنسز کے محاورے میں بات کرتا ہے۔ عمرانی علوم اور انسانی علوم کے علاوہ مختلف قسم کے طبعی علوم بھی ہیں جن کی حیثیت وسائل اور آلات کی ہے، جن سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ ان کا دینی علوم سے بہ راہ راست کوئی تعلق یا تصادم نہیں۔ بالواسطہ طور پر اگرچہ ان وسائل کا غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس غلط استعمال کے نتائج بھی منفی ہو سکتے ہیں، لیکن رویوں کی تشکیل میں ان علوم آلیہ کا بہ راہ راست حصہ بہت کم ہے۔ رویوں اور نظریوں کی تشکیل میں اصل کردار عمرانی اور انسانی علوم ہی کا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ علمائے کرام بہ قدرِ ضرورت سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح کی واقفیت رکھتے ہوں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یعنی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں مسلمان اہلِ علم کو یونانی عقلیات، فلسفے اور منطق سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اگر آپ اس دور یعنی تیسری چوتھی صدی کے مباحث پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ

Marfat.com

جب یونانی منطق اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں تو مسلمانوں میں اسی طرح کے تین رویے پائے جاتے تھے جو آج مغربی تہذیب کے بارے میں نظر آتے ہیں۔ علمائے کرام، محدثین اور مفسرین کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ تھا جو ان سب چیزوں کو فضول، بے کار بلکہ ناپاک اور یہ عمل کرنے والوں کو قابلِ گردن زدنی سمجھتا تھا، جو یونانی منطق اور فلسفے سے اعتنار کھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج یا اس کی حدود پر سمجھتا تھا۔ یہ بحثیں تک دینی حلقوں میں موجود تھیں کہ منطق کی کتابوں سے استنجا جائز ہے یا نہیں۔ یہ جزئیات آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، یعنی یہاں تک ناپسندیدگی اور نفرت کی کیفیت تھی۔ یہ شعر آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ

واعجبا لمنطق الیونان

کم فیہ من افک ومن بھتان

مخبط لجید الاذھان

ایک لمبی نظم ہے، پتہ نہیں کس بزرگ کی ہے۔ آغاز میں عقلیات اور منطق کے بارے میں یہ کیفیت تھی۔ اس کے بعد یہ رویہ محدود ہوتا گیا، جیسا وہ ٹماٹر والا رویہ محدود ہو گیا۔ پھر یہ کیفیت آئی کہ خالص اسلامی علوم میں منطق وفلسفہ شامل ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' علم اسرار حدیث پر بہترین کتاب ہے۔ میری محدود دانست اور ناچیز رائے میں اس سے بہتر اسلامی علوم کی نمائندہ کتاب برصغیر میں نہیں لکھی گئی اور میں شاہ صاحب کو برصغیر میں مسلمانوں کا امیر المومنین فی الحدیث سمجھتا ہوں۔ لیکن جب تک آپ منطق اور فلسفے کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں، ان ہی یونانیوں کی منطق جو بت پرست اور مشرک تھے، بدکار تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی کچھ اونچے لوگ نہ تھے، تو آپ علم کلام اور اصول فقہ کی بہت سی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ یونانی بت پرستوں کی کتابوں کو سمجھے اور ان کے افکار کو جانے بغیر آپ علم اسرار حدیث پر اسلامی لٹریچر کی بہترین کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاہ ولی اللہ تو خیر بعد کے ہیں۔ امام غزالی جیسے حجۃ الاسلام کی کتاب المستصفیٰ، جو اصول فقہ جیسے خالص اسلامی علم پر ہے، اگر

Marfat.com

آپ منطق میں اچھی بصیرت نہیں رکھتے تو آپ اس کتاب کو نہیں سمجھ سکتے، بل کہ اس کتاب میں منطق اتنی گھسی ہوئی ہے کہ اگر المستصفی کو ہی سمجھ کر پڑھ لیں تو منطق بھی آپ کو بہ خوبی آ جائے گی۔ انھوں نے منطق کو اس کتاب میں اتنا سمو دیا ہے کہ منطق اور اصول فقہ کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ امام شاطبی کی کتاب الموافقات آپ نے پڑھی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ حکمت تشریع پر انسانی تاریخ کی بہترین کتاب ہے۔ انسانی تاریخ میں اصول قانون کے اس پہلو پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ لیکن جب تک آپ منطق و فلسفہ نہ جانتے ہوں، اس کتاب کے مضامین کو بھی نہیں سمجھ سکتے، حال آں کہ وہ ایسے علاقے، شمالی افریقہ اور اسپین وغیرہ میں لکھی گئی، جہاں منطق و فلسفے کا رواج ایران اور دیگر مشرقی ممالک کے مقابلے میں نسبتاً کم تھا۔ لیکن اس کے باوجود ساری کتاب کی اٹھان، اس کا استدلال، اس کی ترتیب، اس کا اسلوب اس دور کے عقلیات کے معیارات کے مطابق خالص عقلی ہے۔

یہ ایک ایسی تہذیب یا ایک ایسے علاقے کی نمائندہ تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ تھا جس سے مسلمانوں کو کوئی سیاسی، عسکری یا تہذیبی خطرہ درپیش نہیں تھا، نہ سیاسی طور پر ان کی مسلمانوں کے ساتھ کوئی کش مکش تھی، نہ عسکری طور پر وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے، نہ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اگر مسلمان ان کے نقطہ نظر کا مطالعہ نہ کریں تو وہ اسے زبردستی دنیائے اسلام پر مسلط کر دیں۔ مسلمانوں نے تو خود ہی اپنے علمی ذوق کی وجہ سے ان کے علوم وفنون کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اگر یونانیوں کے علوم وفنون کو جو نہ مسلمانوں پر حاکم تھے، نہ بالادست تھے، نہ ان کے پاس اقتدار تھا، نہ وہ مسلمانوں کے لئے خطرہ تھے، مسلمانوں نے محض علمی دل چسپی کی خاطر اختیار کیا اور ان سے استفادہ کیا تو وہ علوم وافکار جو ایک بالادست طاقت نے آپ پر مسلط کر دیے ہیں اور جن کے تصورات اور اسلوب استدلال کے مضر اثرات مسلمانوں کے گھروں اور دماغوں بل کہ اب دلوں میں داخل ہو رہے ہیں، انھیں سیکھنا اور ان سے واقفیت پیدا کرنا کیوں کر مسلمانوں کی ذمے داری نہیں ہے؟ آج اس کی ضرورت اس

Marfat.com

سے کئی ہزار گنا بل کہ کئی لاکھ گنا زیادہ ہے جتنی ضرورت یونانی علوم وفنون کے مطالعے کی تھی۔

یہ کہنا درست ہے کہ یونانی منطق اور فلسفے سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگوں نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جو اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔آپ فارابی کی کوئی کتاب پڑھیں، مثلاً اس کی کتاب ہے آراء اھل المدینة الفاضلة جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سیاسی فکر کی پہلی کتاب ہے۔اس میں بہت سے خیالات وافکار ایسے ہیں جو اسلامی تعلیم وعقائد سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑی اہم اور غیر معمولی کتاب ہے کہ اس نے یونانی علوم وفنون پڑھے اور ارسطو کی Politica یعنی سیاسیات کا ترجمہ اس نے پڑھا، شاید افلاطون کی Republic کا بھی ترجمہ دیکھا ہو، لیکن بہ ظاہر اس کے شواہد کم ہیں۔سیاسیات پر وہ ارسطو کے نقطہ نظر سے متاثر ہوا۔اس کے بعد اس نے یہ کتاب لکھی اور کوشش کی کہ ارسطو کے ان خیالات کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے بیان کرے۔میرے خیال میں یہ Islamization of Knowledge کی پہلی کوشش تھی۔یہ داعیہ اس کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ وہ یونانیوں کے خیالات کو اسلام کے مطابق بنائے؟ اس کے دل میں کوئی اسلامی حمیت تھی اور کوئی اسلامی جذبہ تھا تو اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا۔فارابی کی دینی حمیت اور اسلامی جذبے نے اس کو ارسطو کے خیالات کو جوں کا توں مسلمانوں میں پیش کرنے سے باز رکھا۔اس حد تک اس کا اسلامی فہم اور دینی حمیت قابل ستائش ہے۔اس دینی حمیت اور اسلامی جذبے کے مطابق اس نے ایک ایسی چیز کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر لوگوں کی راہ نما بنی۔اس رجحان کی دوسرے بہت سے مفکرین اسلام نے پیروی کی۔یوں جلد ہی انھوں نے اسلام کی سیاسی فکر کو ایک نئی جہت دے دی اور اس کے دستوری تصورات کو اس طرح مرتب کر دیا کہ وہ نقل کے معیار کے ساتھ ساتھ عقل کے معیار پر بھی پورا اترے۔اسی وجہ سے میں ابن سینا اور فارابی کا بڑا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، اس کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

Marfat.com

آج بھی اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ حضرات جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں یا ارادہ اور خواہش رکھتے ہوں کہ آگے چل کر امت مسلمہ کی فکری قیادت کی ذمے داری انجام دیں، ان کو بہ قدر ضرورت مغربی علوم سے ناقدانہ اور قائدانہ واقفیت ہونی چاہئے۔ ان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مثلاً وہ اصول قانون کے اسی طرح ماہر ہوں جس طرح کوئی ماہر مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی فقیہ مغربی اصول قانون کا بھی ماہر ہونا چاہتا ہے تو ضرور ہو جائے، لیکن فقہی معاملات و مسائل کو دور جدید کے محاورے میں بیان کرنے کے لئے اتنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اس غرض کے لئے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اصول قانون، جیسا کہ مغرب میں ہے، اس کے اساسی مسلمات، اصول موضوعہ، اس کے بنیادی عقائد، اس کے بنیادی concerns and issues جس سے وہ بحث کرتا ہے، وہ کیا ہیں، کیوں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جو بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ ہیں، وہ گرفت میں آجائیں۔ اس کے بعد ان پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ایک صاحب علم فقیہ یہ دیکھے کہ اس میں کیا چیز علمی حیثیت سے کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط عقلی بنیادوں پر قائم ہے، اور کیا چیز یا کیا اسلوب استدلال ہے جس سے کام لے کر اصول فقہ کے تصورات ومبادی کو بہتر انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام ایک ناقدانہ انداز کا متقاضی ہے۔

آپ دیکھیں کہ اصول فقہ کو جس طرح امام شافعی نے مرتب فرمایا تھا اور جس طرح امام سرخسیؒ نے اس پر اصول السرخسی لکھی تھی جو فقہ حنفی میں اصول فقہ کی پہلی جامع کتاب ہے، اس انداز کی کتابیں بعد میں شاذ و نادر ہی لکھی گئیں۔ امام رازی اور امام غزالی کی کتابیں اس انداز کی نہیں ہیں۔ ان میں منطق اور فلسفہ بہت بھرپور انداز میں شامل ہو گیا ہے۔ ان حضرات کے ہاں اصول فقہ کے مباحث میں فلسفہ، کلام، منطق، عقلیات، لسانیات اور لغویات سب شامل ہیں۔ امام غزالی نے اصول فقہ کے ہر مسئلے کو منطق کے دلائل سے اس طرح ثابت کر کے دکھایا کہ یونانی فلسفے و منطق کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر امام غزالی کے استدلال سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ اس طرح انھوں نے اصول فقہ کو یونانی منطق کے ماہرین کے فہم کے قریب کر کے ان کے لئے قابل قبول بنا دیا۔ منطقیوں

Marfat.com

سے متاثر لوگ اصول فقہ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اصول فقہ کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا کہ یہ فن عقل ونقل دونوں کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ یہی کام آج ہمیں کرنا پڑے گا۔ جب تک آپ غزالی اور رازی کی اس سنت کو زندہ نہیں کریں گے، بات آگے نہیں بڑھے گی۔

آج قانون دان ماہرین کا جو قابل احترام طبقہ ہمارا اور آپ کا نظام چلا رہا ہے، یہ اصول فقہ اور فقہ کی گہرائیوں اور نزاکتوں سے واقف نہیں ہے۔ یہ انگریزی قانون اور اصول قانون سے واقف ہے۔ اینگلو سیکسن لا، اس کے تصورات واستدلالات اور عقائد، سب ان حضرات کے رگ وپے اور گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یا تو آپ انھیں مجبور کریں کہ وہ اپنا سب کام چھوڑ کر فقہ اور اصول فقہ پڑھیں اور ضروری مہارت فراہم کریں تو یہ عملاً ممکن نہیں ہوگا۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ اپنی ملازمت، تدریس، نوکری یا حالیہ مشاغل ومصروفیات کو چھوڑ کر پانچ سال یا دس سال انگریزی قانون یا اصول قانون پڑھنے پر لگائیں تو آپ اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے، آپ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے مشاغل بھی اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر قدیم محاورے میں لکھے ہوئے اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں۔ اس مہارت کو حاصل کرنے کے لئے ایک وکیل کو اپنی وکالت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک وکیل اپنی وکالت کیوں چھوڑے؟ اگر چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور وہ کیوں پانچ سال اصول فقہ یا فقہ پڑھنے پر لگائے؟ پانچ سال میں بھی اتنی واقفیت پیدا نہیں ہوگی جتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے مطالبے کرنے سے، جلوس نکالنے سے، بینر لگانے سے کوئی جج یا وکیل خود بہ خود فقہ کا ماہر نہیں ہو جائے گا۔ وہ فقہ کا ماہر تب بنے گا جب وہ اسلامی علوم اور فقہ کو براہ راست بنیادی مآخذ سے پڑھے گا، اور وہ تب پڑھے گا جب آپ اسے پڑھانا چاہیں گے، اور جب پڑھانا چاہیں گے تو اس کے لئے اس کے ذہنی پس منظر اور اس کے مزاج کے مطابق آپ کو تیاری کرنی پڑے گی۔ اس مقصد کے لئے طویل عمل درکار ہے۔ اس عمل میں شارٹ کٹ کوئی نہیں ہے۔ یہ نہ ممکن ہے اور نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہوگا کہ آج کوئی

Marfat.com

اسلامی تحریک یا دینی جماعت دھرنا دے دے اور کل اس کے نتیجے میں جتنے جج صاحبان اور وکلا ہیں، جن کی تعداد بالترتیب پانچ ہزار اور ستر اسی ہزار کے قریب ہے، سب کے سب فقہا ہو جائیں۔ دھرنوں اور مطالبوں سے کوئی غیر فقیہ، فقیہ نہیں بن سکتا۔ محض فتوے جاری کرنے سے کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہوسکتا۔ موجودہ صورت سو سال بھی جاری رہی، جب بھی صورت حال یہی رہے گی جو آج ہے۔ اس کے لئے بہت طویل اور مسلسل کام کرنا پڑے گا۔ یہ صورت حال جو آج ہمیں درپیش ہے، یہ دو ایک سالوں میں نہیں، دو سو سال میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ دو صدیوں کی کم زوری اور بے عملی کا نتیجہ ہے۔ دو سو سال کے ان ثمرات بد کو دور کرنے کے لئے کم از کم دو سو نہیں تو پچاس سال تو کام کرنا پڑے گا۔ پچاس سال کم از کم تبدیلی کے لئے درکار ہیں، اس وقت سے جب تبدیلی کے لئے کام شروع ہوگا۔ اگر پچاس سال پہلے شروع ہو چکا ہوتا تو آج تبدیلی آ چکی ہوتی۔ چناں چہ نہ صرف اصول فقہ کو بل کہ دوسرے متعدد اسلامی علوم کو اس انداز سے مرتب کرنا پڑے گا کہ وہ ایک زندہ اور موثر فکری قوت بن سکیں۔ دور جدید کا انسان جو قانون تو جانتا ہے اور مغربی اصول قانون سے مانوس ہے، وہ فقہی تصورات کو سمجھ سکے اور ان تصورات کو اپنے فہم کے قریب لا سکے۔ مسلمان علما اور فقہا کو عمرانی اور انسانی علوم میں اتنی واقفیت لازماً پیدا کرنی ہوگی کہ ان کے اسلوب استدلال کے ذریعے سے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیم کو پیش کر سکیں، جس طرح امام غزالی نے منطق سے کام لے کر اصول فقہ کے اصولوں کو پیش کیا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ معاشرے میں موجود ہوں۔

اس تبدیلی کو یقینی بنانے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ان دو صورتوں یا شکلوں کے علاوہ تیسری کوئی شکل قابل عمل معلوم نہیں ہوتی۔

ایک شکل تو یہ ہے کہ جو لوگ اصول قانون کے ماہر ہوں، انھیں اصول فقہ کا ماہر بھی بنا دیا جائے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جو اصول فقہ کا ماہر ہو، اسے بہ قدر ضرورت اصول قانون کا ماہر بنا دیا جائے۔ دوسری صورت زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے۔ میں نے یہ ایک مثال

Marfat.com

صرف اصول قانون کی دی ہے۔ یہ مثال علم سیاسیات، سوشیالوجی اور دیگر علوم پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ ان علوم وفنون سے ایک گہری ناقدانہ واقفیت درکار ہے، لیکن اس ناقدانہ واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی علوم میں گہرا اور ماہرانہ تخصص حاصل ہو چکا ہو، ورنہ مغربی علوم وفنون کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہ ہوگا کہ وہاں کیا چیز درست ہے اور کیا غلط ہے، ان کے عقائد اور اصول موضوعہ میں سے کون سا اصول اور کون سا عقیدہ ٹھیک ہے، اسلام کے مطابق ہے اور کون سا عقیدہ غلط اور اسلام کے خلاف ہے۔ کم زور اسلامی بنیاد رکھنے والوں کو اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ ایک کچا علم رکھنے والا ان کی گم راہیوں سے بھی متاثر ہو جائے گا جیسا کہ آج تک ہوتا رہا ہے۔ علمائے کرام جو متامل ہیں، شاید اسی وجہ سے ہیں کہ ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ ادھ کچرا علم رکھنے والوں نے مغربی علوم وفنون اپنائے اور اسلام کی وہ وہ تعبیریں کیں جو اسلام کی روایت کے مطابق نہیں تھیں۔ ان تعبیرات میں انھوں نے اسلام کی علمی روایت کے تسلسل کو محفوظ نہیں رکھا تھا۔ اس لئے جب تک خود دینی علم اور اسلامی روایت میں پختگی نہ ہو، اس وقت تک ناقدانہ تصور نہیں پیدا ہوسکتا۔ دینی تخصصات میں گہرائی اور پختگی پیدا کرنے کے لئے بھی ابھی تک ہمارے ہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔

آج جو دینی تعلیم ہم دے رہے ہیں، اس کے مقاصد کیا ہیں؟ وہ ہمارے سامنے ہونے چاہئیں۔ میں ذرا بے تکلف بات کروں گا۔ آپ برا نہ مانئے گا۔ میرا تعلق آپ ہی کے طبقے سے ہے۔ اس لئے دو ایک تلخ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

اس لئے گفت گو میں تھوڑی سی تلخ نوائی کا عنصر آنے کی اجازت دیجیے۔ جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا، اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ کیا درپیش تھا؟ اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ انگریز نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں کے مذہبی اور دینی ادارے سب ختم کر دیئے گئے تھے، اوقاف ایک ایک کر کے ضبط کر لئے گئے تھے،

Marfat.com

تعلیمی ادارے سب بند کر دیئے گئے تھے۔ علمائے کرام جو سارے نظام کو چلا رہے تھے، ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا۔ عدالتوں کا نظام کسی نہ کسی حد تک شریعت کے مطابق تھا، اس کو ختم کر کے انگریزی عدالتیں قائم کر دی گئیں، انگریزی قانون شریعت کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ فارسی جو نظام حکومت کی زبان تھی، اس کو ختم کر کے انگریزی جاری کر دی گئی۔ جہاں جہاں مسلمان کارندے مقرر تھے، ان کی جگہ ہندو کارندوں کو مقرر کر دیا گیا۔ بڑے بڑے تمام مناصب پر انگریز آ گئے اور مسلمان منصب قیادت سے معزول ہو کر معاشرے کا ناپسندیدہ عنصر بنا دیئے گئے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی عزت کا ذریعہ تھیں، وہ مسلمانوں کی ذلت کا ذریعہ بنا دی گئیں۔ مسلمانوں کا لباس، مسلمانوں کے عہدے، مسلمانوں کے مناصب، مسلمانوں کے القاب، ہر چیز جو اونچے درجے کی تھی اور قابل عزت سمجھی جاتی تھی، اس کو انگریز نے ذلت کی علامت بنا دیا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں مخلص اہل علم ودین نے نے یہ محسوس کیا کہ وہ نصاب یا وہ نظام جو آسانی سے اس وقت اپنایا جا سکتا ہے، وہ ماضی کا درس نظامی ہے، لہٰذا اس کو اپنا لیا جائے۔

اس وقت درس نظامی برصغیر کے بیشتر علاقوں میں رائج تھا۔ درس نظامی کیا ہے؟ یہ بھی میں ذرا وضاحت اور صراحت سے عرض کر دوں۔ درس نظامی نہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ اس کو اختیار کرنا شریعت کا کوئی حکم ہے، نہ خیر القرون میں، اسلام کے سنہری دور میں اس نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ اس درس کا تذکرہ نہ قرآن میں آیا ہے نہ حدیث میں، نہ اس کا اسلام کے مستقبل یا ماضی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ چند ماہرین تعلیم اور علما کے اپنے تجربے پر مبنی ایک نصاب ہے جو اپنے زمانے میں ایک اچھی مفید چیز تھی۔ آج بھی اس میں ایک حد تک افادیت پائی جاتی ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں۔

انگریز کی حکومت جب برصغیر میں قائم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں چار پانچ قسم کے درس رائج تھے۔ ایک درس مشرقی ہندوستان، جون پور وغیرہ میں رائج تھا، جو شیراز ہند کہلاتا تھا۔ شیراز ہند اس لئے کہلاتا تھا کہ جون پور اور مشرقی علاقوں میں عقلیات اور فلسفے پر زور زیادہ تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق اور فلسفے کے ماہر ہوتے

Marfat.com

تھے۔ مسلمانوں میں عقلیات پر جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں، وہ اکثر و بیشتر جون پوریوں نے لکھیں۔ کئی اور اور اچھی کتابیں خیر آبادی سکول کی طرف سے لکھی گئیں۔ فضل حق خیر آبادی اور فضل امام خیر آبادی اس اسکول کے معروف نام ہیں۔ جون پور اور اس کے اطراف کے علما کی لکھی ہوئی کتابیں ہدیہ سعیدیہ اور شمس بازغہ وغیرہ مشہور ہیں جن سے آپ واقف ہیں۔

ایک دوسرا درس تھا جو افغانستان کے اثرات سے آیا تھا اور موجودہ صوبہ سرحد، افغانستان اور موجودہ پنجاب وغیرہ میں رائج تھا۔ اس میں صرف ونحو اور نحوی بحثوں پر زور دیا جاتا تھا۔ کافیہ اور اس کی شرحیں پڑھنے پر لوگ دس دس سال لگا دیا کرتے تھے۔ کافیہ میں نحو کے قواعد کے بارے میں کیا لکھا ہے، اس سے پڑھنے پڑھانے والوں کو زیادہ بحث نہیں ہوتی تھی، لیکن مفرد امرفوع ہے یا منصوب یا مجرور، اس پر تین تین دن بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر کافیہ کی شرح، شرح جامی پڑھائی جاتی تھی۔ پھر شرح جامی کی شرح، پھر اس کے حواشی سوال باسولی، سوال کابلی، تحریر سنبٹ وغیرہ کا مرحلہ آتا تھا۔ یوں دس دس سال اس میں لگ جاتے تھے۔ بہ ہر حال، یہ تخصص کا ایک میدان تھا۔ اساتذہ اور طلبہ کی ایک تعداد کو اس سے دل چسپی تھی۔ اس سرگرمی کی علمی افادیت کیا تھی، اس پر ہر ایک کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ جو حضرات اس سرگرمی کو پسند کرتے تھے، وہ ان کی رائے تھی جس پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا جس میں علوم حدیث پر نسبتاً زیادہ زور تھا۔ کنز العمال کے مصنف شیخ علی المتقی، عبد الوہاب المتقی، ہمارے سندھ کے علمائے کرام شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد عابد سندھی اور شیخ ابو الحسن سندھی وغیرہ حضرات اس نظام سے وابستہ تھے۔ ان حضرات کا اعتنا علوم حدیث سے زیادہ تھا۔

یہ تین بڑے بڑے اور اہم نصاب ہندوستان میں رائج تھے۔ ان کے علاوہ چند اور بھی نصابات تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ ان سے مختلف بھی رائج تھے، لیکن بڑے انداز یہی تین تھے۔ اس کی مزید تفصیل اگر آپ دیکھنا چاہیں تو مولانا مناظر احسن گیلانی

Marfat.com

کی ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' میں دیکھ لیجیے۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے، ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تو اس نے سب سے پہلے بعض ساحلی علاقوں بمبئی، مدراس اور کلکتہ وغیرہ پر قبضہ کیا۔ کلکتہ پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پولیس اور فوج رکھنا شروع کی جس کی ایک لمبی اور عبرت ناک داستان ہے۔ آج کل اس کے parallels اور اس کی مشابہتیں ہمارے ملک میں بہت واضح اور نمایاں طور پر نظر آ رہی ہیں۔ انھوں نے اچھے اور معیاری تعلیمی ادارے بنائے اور مسلمانوں کے پہلے سے قائم شدہ اداروں میں کام کرنے والوں کو بہتر تن خواہوں اور مراعات پر اپنے ہاں جگہ دی۔ یوں اہل علم کی بہت بڑی تعداد کے مفادات اپنے نظام سے وابستہ کر لیے۔ انھوں نے بہتر تنظیم سے کام لے کر یہاں کی تجارت اور صنعت پر منفی اثر ڈالا۔ پھر چوری اور ڈاکے کے بعض واقعات کو بنیاد بنا کر اپنی پولیس الگ قائم کر لی۔ پھر ایک مرحلے پر اپنی عدالتیں الگ بنائیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ آپ کے ملک میں بدامنی ہے، آپ کے ہاں راستوں میں ڈکیتیاں بہت ہوتی ہیں، اس لئے ہم اپنی جان و مال اور راستوں کو محفوظ بنانے کے لئے اپنی فوج الگ رکھیں گے۔ وقتی معاشی مفادات اور مالی فوائد کی توقع بل کہ لالچ میں ان کو فوج رکھنے کی اجازت بھی دے دی گئی اور یوں انھوں نے عام راستوں پر سپاہی رکھنے شروع کر دیئے۔ ہوتے ہوتے انھوں نے پورے بنگال پر قبضہ کر لیا اور بالآخر نواب سراج الدولہ کے خلاف فوج کشی کر کے اس کو بے دخل کر دیا گیا۔

بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگی تو انھوں نے مزید پیش قدمی کی اور چند سال کے اندر اندر انھوں نے بہار اور اڑیسہ پر بھی قبضہ کر لیا اور الٰہ آباد پہنچ گئے، جو مشرقی یوپی کا سب سے بڑا شہر تھا۔ جب تین صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ ہو چکا تو ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی ہوش آنا شروع ہوا اور یہاں کا حکم راں، غالباً شاہ عالم ثانی، نیم دلی سے ان کے مقابلے کے لئے اپنی فوج لے کر نکلا۔ اس کو ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کے نتیجے میں الٰہ آباد میں

Marfat.com

ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ دیوانی کہلاتا ہے۔ یہ معاہدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے کوئی ایک آدھ سال بعد ہوا۔ اس معاہدے میں شاہ عالم ثانی نے قابض ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کو ان تینوں صوبوں کا انتظام سپرد کر دیا، یعنی اس کو قانونی طور پر ایک جائز قبضہ تسلیم کر لیا اور کہا کہ میری طرف سے آپ ان تینوں صوبوں کا نظام چلائیں گے، لیکن اس کی یہ اور یہ شرائط ہوں گی۔ (انگریز بل کہ اہل مغرب ہمیشہ شروع میں وہ سب شرائط مان لیتے ہیں جو ان کو سوٹ کرتی ہیں۔ پیروی اور پابندی وہ کتنی کرتے ہیں، یہ ہم سب کے سامنے ہے)۔

ان شرائط میں ایک بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے معاملات شریعت حقہ محمدیہ کے مطابق ہوں گے۔ یہ معاملات مسلمان قاضی اور مفتی نبٹائیں گے اور وہی یہ طے کریں گے کہ شریعت کیا ہے اور اس کو کیسے نافذ کیا جائے۔ یہ ان شرائط میں ایک اہم اور بنیادی شرط تھی۔ جب انگریزوں نے یہ شرائط مان لیں تو اب ان پر عمل درآمد کا مرحلہ آیا۔ انگریزوں میں یہ خوبی ضرور ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ ہر کام بڑے سلیقے اور methodical طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر کام کا ایک نظام اور ایک سسٹم ہوتا ہے۔ پہلے قانون بنتا ہے، اس کے مطابق نظام چلتا ہے۔ چناں چہ ان شرائط پر عمل کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ معلوم کیا کہ مسلمانوں میں کسی کو جج مقرر کرنے کے لئے کیا کیا امور پیش نظر رکھے جاتے ہیں اور اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کوئی شخص عالم یا فقیہ ہے؟ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تین چار قسم کے نصاب رائج ہیں اور ہر نصاب کے فارغ التحصیل کو عالم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی ایسا نصاب ہونا چاہئے جو ان تینوں چاروں رائج الوقت نصابات کے خصائص کا جامع ہو۔ اب ان تینوں خصائص کا جامع نظام وہ تھا جو فرنگی محل میں رائج تھا۔

فرنگی محل ایک بہت بڑے مکان کا نام تھا، جو جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ جہانگیر اس زمانے میں بیمار ہوا۔ کئی مقامی طبیبوں، ویدوں اور دوسرے لوگوں نے اس کا علاج کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے کامیاب علاج کر

Marfat.com

کے اس کی شکایت کو دور کر دیا۔ اس پر جہانگیر نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا چاہیے؟ انگریز ہمیشہ اپنی قوم کا وفادار ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری قوم کے کچھ لوگ یہاں لکھنو میں تجارت کے لئے آئے ہیں، ان کو بعض اوقات مشکل پیش آتی ہے، اس لئے آپ ان کو تجارت کی اجازت دے دیں اور ان کو مناسب مراعات عطا کر دیں۔ اس پر جہانگیر نے فرمان جاری کر دیا اور لکھنو میں ایک بہت بڑا محل یا کوٹھی ان کو دے دی۔ انگریزوں کی وجہ سے وہ کوٹھی فرنگی محل کہلاتی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کسی حوالے سے اس کو خبر ملی کہ انگریزوں نے اس فرمان میں دی گئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے جو جہانگیر نے طے کی تھیں، اور بعض ایسے کام کئے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے وہ کوٹھی ضبط کر لی اور انگریز ساہوکاروں کو نکال کر وہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کو دے دی۔

ملا نظام الدین سہالوی اپنے وقت کے جید علما میں سے تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کے کام کی نگرانی بھی کی تھی اور فقہ میں گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے مشورے پر انھوں نے اس عمارت میں ایک دینی درس گاہ قائم کی جہاں فقہ کی تدریس پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ درس گاہ مدرسہ فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی، چناں چہ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل علما فرنگی محلی کہلانے لگے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی، عبدالوہاب فرنگی محلی، عبدالباری فرنگی محلی، یہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ یہ سب حضرات فرنگی محل کی اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فرنگی محل میں ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ جو نصاب تعلیم تھا، اس میں انھوں نے منطق، فلسفہ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصول فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی خصوصیت سے شامل کر دیں، اس لئے کہ وہ خود فقہ کے متخصص تھے، مفتی اور محتسب رہے تھے اور فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں بھی شریک رہے تھے۔

جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ فرنگی محل کا جو نصاب تعلیم ہے، اس میں فقہ کی اچھی بنیاد موجود ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات فقہ کے ماہر ہوتے ہیں تو انھوں نے یہ

Marfat.com

فیصلہ کیا کہ اسی درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو قاضی و مفتی مقرر کیا جائے گا۔ چناں چہ بڑے پیمانے پر اس درس گاہ کے فضلا کی مانگ ہونے لگی۔ چوں کہ یہ حضرات بڑی بڑی تن خواہوں پر قاضی و مفتی مقرر ہونے لگے، اس لئے درس نظامی کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو ایک اچھا دنیاوی موقع ملا، ان کی تن خواہیں اچھی تھیں، ان کے وسائل اچھے تھے، معیارات اچھے تھے، اس لئے بڑے پیمانے پر مدارس نے اسی نصاب کو اپنانا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے اس نصاب کے فارغ التحصیل حضرات بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں میں آ گئے۔ آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں بیسیوں علمائے کرام کے نام سنیں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے اور انگریزوں کے نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ صدرالصدور تھے یعنی دہلی اور اس کے قرب و جوار کے مذہبی امور کے جتنے قاضی تھے، ان کی سربراہی ان کے پاس تھی۔ آپ انھیں اس علاقے کا چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ نصاب تھا جس سے لوگ مانوس تھے اور گزشتہ کم و بیش سو برس یا ۸۰ برس سے لوگ اس نصاب کو پڑھتے پڑھاتے چلے آ رہے تھے۔ جب مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور ان کے رفقا حاجی عابد حسین وغیرہ نے دارالعلوم کے قیام کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بھی اسی نصاب کو اپنا لیا۔ اس کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ وہ بھی اسی نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان کے استاد، ان کے ساتھی، دوسرے علمائے کرام، مثلاً مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس بھی منتخب ہوئے، ان کے والد مولانا مملوک علی، سب اسی نظام کے پڑھے ہوئے تھے۔ مولانا مملوک علی ۱۸۵۷ء کے واقعے سے قبل دہلی کالج میں، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی چلاتی تھی، عربی کے پروفیسر تھے۔ شاید ان حضرات کے پاس اس نصاب کو اپنانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ دینی تعلیم بہ قدر ضرورت اس میں شامل تھی۔ اس میں عربی زبان بھی تھی،

Marfat.com

فقہ بھی تھی، اصول فقہ بھی تھی، حدیث بھی تھی، تفسیر کی ایک دو کتابیں بھی انھوں نے شامل کر دیں۔ حدیث کی کم تھی، اس لئے حدیث کی مزید کتابیں شامل کر دیں۔ اس سے پہلے تک حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ اور ایک آدھ اور کتاب ہوتی تھی۔ ان حضرات نے مزید کتابیں شامل کر دیں اور ایک نیا نصاب انھوں نے بنا دیا جس نے ہندوستان کے دینی تقاضوں کو وقتی طور پر پورا کیا۔

کیا پاکستان بننے کے بعد بھی دینی مدارس کے تقاضے یہی تھے؟ میرے خیال میں ایک آزاد اسلامی مملکت میں دینی تعلیم کے تقاضے محض یہ نہیں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اب دینی مدارس اور دینی تعلیم کے کم از کم تین قسم کے تقاضے اور مقاصد ہیں۔ ان تینوں تقاضوں یا مقاصد کی ضروریات الگ الگ ہیں۔

ایک تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مساجد ہیں، ان میں ہمیں تربیت یافتہ امام درکار ہیں۔ یہ سب سے پہلا تقاضا ہے جو مسلمانوں کی دینی زندگی کا سب سے لازمی مطالبہ ہے جسے پورا ہونا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ایک امام مسجد کو درس نظامی جوں کا توں پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہدیہ سعیدیہ اور سوال کابلی اور سوال باسولی اور تحریر سنبٹ وغیرہ نہیں پڑھے گا تو بھی وہ ایک اچھا امام ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ یہ کتابیں پڑھ لے گا تو اس کے اچھا امام بننے میں ان کتابوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اچھا امام بننے یا نہ بننے میں ان علوم وفنون کا سرے سے کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے ایک امام مسجد کو یہ کتابیں پڑھانا تحصیل حاصل ہے اور وقت کا بھی ضیاع ہے اور وسائل کا بھی۔ آپ نے ہزاروں ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا اور آگے چل کر مزید ہزاروں ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جنھوں نے آٹھ دس سال لگا کر یہ ساری چیزیں یاد کیں، پھر پچاس سال امامت کی اور پچاس سالہ امامت کے طویل دور میں کسی نے ان سے ہدایۃ الحکمۃ کا کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ان کو کبھی تحریر سنبٹ کا کوئی مسئلہ وہاں بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو مسائل لوگ پوچھتے ہیں اور جو روزانہ دین کی راہ نمائی میں درکار ہوتے ہیں، وہ عموماً امام صاحب کے علم میں نہیں ہوتے۔ جو مباحث روزانہ دینی راہ نمائی کے لئے درکار ہوتے ہیں، ان سے امام

Marfat.com

صاحب سرے سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ تو ان کو پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ شیئرز مارکیٹ میں پیسہ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ اکثر ائمہ کرام ان سوالات کا جواب نہیں دے پاتے۔ ائمہ کرام سے اکثر کو یہی پتہ نہیں ہوتا کہ شیئر کہتے کس کو ہیں۔ یہی حال بیشتر اہم مسائل کے بارے میں امام صاحب کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دینی تعلیم کا یہ نظام اچھا امام تیار نہیں کر سکتا۔ اب ایک اچھے امام کی حقیقی ضروریات کیا ہیں، اس پر غور وفکر ہونا چاہئے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک کم از کم تعلیمی معیار کے بعد، جو میٹرک ہوسکتا ہے، آپ دینی مدارس میں طلبہ کو داخلہ دیں۔ میٹرک کے بعد حفظ قرآن لازمی ہونا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ دینی مدارس میں حافظ کے علاوہ کسی کو داخلہ نہیں دینا چاہئے۔ اس وقت جامعہ ازہر کے تحت جو ادارے کام کر رہے ہیں، ان میں طلبہ کی تعداد کم وبیش پندرہ لاکھ ہے جو پاکستان کے دینی مدارس کے طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ان کی آبادی ہم سے آدھی بل کہ اس سے بھی کم ہے، لیکن وہاں جامعہ ازہر اور اس کے اداروں میں حفظ قرآن لازمی ہے۔ گویا پندرہ لاکھ حافظ طلبہ اس وقت جامعہ ازہر کے زیر انتظام اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ اگر وہ حفظ کی شرط پر عمل درآمد کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟

غرض حفظ قرآن اور میٹرک کے بعد تین چار سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہو جس میں بہ قدر ضرورت عربی زبان پڑھائی جائے۔ اتنی کہ طالب علم تفسیر اور حدیث کی کتابیں اور فقہ کی عام کتابیں پڑھ سکے۔ عربی زبان کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث پر کوئی ایک آدھ جامع کتاب مثلاً مشکوۃ کا انتخاب یا التاج الجامع للاصول، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث یا کوئی اور اچھی کتاب پڑھا دی جائے۔ اسی طرح اردو کی کوئی تفسیر، مثلاً تفسیر عثمانی یا تفسیر ماجدی اور کوئی ایک عربی کی مختصر تفسیر پڑھائی جائے۔ ایک دو فقہ کی کتابیں ہوں اور کوئی ایک آدھ کتاب جدید معاشیات اور سیاسیات پر۔ اس طرح کا ایک تین سالہ یا چار سالہ نصاب ہو جس میں تقریر کی مشق بھی ہو اور تجوید بھی اس میں شامل ہو۔ جو طالب علم یہ نصاب مکمل کر لے، وہ امام بننے کا اہل ہو اور اس کو پھر امام بننے کا موقع دینا

Marfat.com

چاہئے تاکہ وہ اپنا اور ادارے کا مزید وقت اور وسائل ضائع نہ کرے، اس لئے کہ اس کو اس سطح سے آگے کام نہیں کرنا۔

اب یہ ایک تقاضا ہے جس کے لئے آپ جب تک کوئی نظام نہیں بنائیں گے، اس وقت تک وہی کچھ ہوتا رہے گا جو آج ہو رہا ہے۔

آپ ایک اور تلخ بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور جب تک آپ حقائق کا سامنا نہیں کریں گے، مستقبل کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ آج ہمارا امام جب معاشرے میں جا کر اپنی ذمے داریاں سنبھالتا ہے تو اکثر صورتوں میں وہ ذہنی، فکری اور تہذیبی طور پر اپنے کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ سب اس معاشرے میں irrelevant ہے اور یہاں لوگ جو سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی پڑھی ہوئی از کار رفتہ یا فروعی اور غیر اہم چیزوں کو relevant بنانے کے لئے وہاں وہ مسائل پیدا کرتا ہے جن پر وہ ذرا طلاقت لسانی اور روانی سے گفت گو کر سکے اور اپنی علمیت کی دھاک بٹھا سکے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے اپنے مسائل ہیں، وہ لوگوں کے بھی مسائل بن جائیں۔ جب وہ ان کے مسائل بن جائیں گے اور وہ پوچھیں گے تو میں ان کا جواب دوں گا۔ وہ مسائل کیا ہوتے ہیں؟ وہ فرقہ وارانہ فروعی مباحث ہوتے ہیں۔ اب عامۃ الناس اور سادہ لوح مخلص نمازیوں میں جن بے چاروں کو ان لایعنی اور فروعی مباحث کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور نہ کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوتا ہے کہ حضور نور تھے یا بشر تھے، ان کے لئے امام یہ مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب التعمیل ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور صراط مستقیم کیا تقاضا کرتی ہے، اس سے امام کو بحث نہیں ہوتی۔ لوگوں کی زندگیاں کیسے تبدیل ہوں، لادینیت اور مغربیت کے منفی اثرات کو کیوں کر روکا جائے، اس سے نہ نوریوں کو بحث ہوتی ہے نہ بشریوں کو۔ اس کے برعکس ایک اس پر زور دینا شروع کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور دوسرا اس پر کہ آپ نور تھے۔ یہ نور کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے، وہ بشر کا ایک

Marfat.com

محدود مفہوم بیان کرتا ہے اور جب علم کی کمی کی وجہ سے لوگوں کا ایک گروہ ان امور کو دین کے سب سے اہم اور بنیادی مسائل مان کر امام صاحب کی قیادت کو قبول کر لے گا اور اس کام میں ان کے برپا کردہ معرکوں میں دامے، درمے، سخنے بل کہ دستے و چوبے (اور اب تو بندوقے وکلاشنکوفے) حصہ لینے کے لئے تیار ہو جائے گا تو اب امام صاحب کی نوکری پکی ہو جائے گی اور انھیں کوئی وہاں سے نہیں ہٹائے گا۔ یہ ایک افسوس ناک اور تلخ حقیقت ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔ اس کو محض تنقید کے مفہوم میں نہ لیں۔ جب تک مرض کی آپ تشخیص نہیں کریں گے، اس وقت تک اس کا علاج نہیں کرسکیں گے۔ لہٰذا ان خرابیوں کو دور کرنے کا راستہ یہی ہے کہ امام کو اس کام کے لئے تیار کریں جو شریعت نے اس کے سپرد کیا ہے۔ اس کو وہ علم دین جس کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ جب اسے معاشرے کے زندہ مسائل معلوم ہوں گے تو وہ غیر متعلق مسائل پیدا نہیں کرے گا۔

اس کے بعد تعلیم کا دوسرا درجہ ان لوگوں کے لئے ہے جو دینی علوم کے مدرس یا معلم بننا چاہتے ہیں۔ آج پاکستان کے ہر اسکول اور کالج میں ایف اے تک اسلامیات لازمی ہے۔ بہت سے لوگ بی اے میں بھی اسلامیات کے مضامین پڑھتے ہیں۔ ہر کالج اور ہر اسکول میں اسلامیات کے ٹیچر ہوتے ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سرکاری اداروں سے ایم اے کر کے آئے ہیں جن کا علم عموماً بڑا کم زور، سطحی اور ناپختہ ہوتا ہے۔ وہ اردو میں درسی کتابیں اور خلاصے پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ میں نے اسلامیات کے ایسے اساتذہ دیکھے ہیں کہ جن سے نماز پڑھانے کے لئے کہا جائے تو نماز نہیں پڑھا سکتے۔ قرآن پاک کی شاید چار سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں، اس لئے کہ قرآن پاک انھوں نے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ اردو میں چند کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ یوں ایم اے اسلامیات کی ڈگری ان کو مل جاتی ہے اور وہ اسلام کے مجتہد اور مفتی بھی بن جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسری خطرناک بات ہے جو ہو رہی ہے۔ اسلامیات کے مدرسین میں دوسرے وہ لوگ ہیں جو مدرسوں کی لائن سے آئے ہیں۔ مدرسوں میں میبذی، شرح عقائد اور خیالی

Marfat.com

قسم کی جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے، وہ نئے ماحول اور نئے اداروں میں زیادہ کام نہیں آتی۔ فقہی اور کلامی نوعیت کے اختلافی مباحث بھی اسکولوں اور کالجوں کے ماحول میں زیادہ مقبول نہیں ہوتے۔ یہاں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے ہم نے ان لوگوں کو تیار نہیں کیا۔ تدریسی ضروریات کے اس مقصد کے لئے ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہئے، جس کا مقصد یہی ہو کہ آپ کو اسکولوں اور کالجوں کے لئے اسلامیات کے معلم تیار کرنے ہیں۔ اس سطح پر عربی ادب کی چند کتابیں، تاریخ اسلام، سیرت، اسلامی معاشیات، فقہ، عقائد کے ساتھ ساتھ حدیث اور تفسیر کا بہ قدر ضرورت حصہ شامل ہونا چاہئے۔ مزید برآں تاریخ پاکستان اور جدید دنیائے اسلام سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگ درکار ہیں جو خود ان دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم کے اعلیٰ درجے کے متخصص ہوں، اونچے درجے کے مضامین اور اعلیٰ سطح کی کتابیں پڑھا سکیں اور اعلیٰ درجے کے علوم وفنون کی تدریس کر سکیں۔ ہمیں فقہا درکار ہیں، محدثین درکار ہیں، مفسرین درکار ہیں، مفتی درکار ہیں جو اپنے اپنے علوم کے متخصص ہوں۔ اس کے لئے الگ سے چار پانچ سال کی تیاری درکار ہے۔ جب تک وہ تیاری نہیں ہوگی، مطلوبہ افراد تیار نہیں ہوں گے۔

اس وقت درس نظامی میں کیا ہوتا ہے؟ درس نظامی میں اس وقت ان اسلامی علوم میں سے کسی میں تخصص کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ درس نظامی میں سب سے نظرانداز ہونے والی چیز قرآن پاک ہے، جس پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب بعض مدارس میں ترجمہ قرآن شروع ہوگیا ہے۔ اول سے آخر تک لفظی ترجمہ پڑھا دیتے ہیں جس کی نوعیت اس عوامی درس قرآن سے مختلف نہیں ہوتی جو بہت سی مسجدوں میں ہوتا ہے، جس میں بیٹھ کر لوگ ثواب کی خاطر درس سن لیتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے درس دے دیا، لوگوں نے عقیدت سے سن لیا۔ کچھ یادرہا، کچھ یاد نہیں رہا۔ اسی طرح سے مدرسوں میں جو درس ہوتا ہے، وہ اکثر لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔ اس درس میں علوم قرآن، علم تفسیر، مضامین

Marfat.com

قرآن، مشکلات قرآن جیسے مباحث کو تو جانے دیجیے، قرآن کی تعلیم، قرآن کی دی ہوئی ہدایت اور دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآن کا امتیاز، یہ مضامین بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تفسیر کے عنوان سے مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ بیضاوی کی سورۂ بقرہ ہے۔ میرے خیال میں بیضاوی کوئی اچھی تفسیر نہیں ہے۔ میں امام بیضاوی کے پورے احترام کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں۔ نہ ان کی یہ کتاب تفسیر کا اچھا نمونہ ہے، نہ کسی اور چیز کا۔ تفسیر بیضاوی انھوں نے کیوں لکھی؟ وہ اصل میں متکلم تھے اور اصول فقہ کے آدمی تھے۔ انھوں نے بہ طور متکلم یہ دیکھا کہ زمخشری کی تفسیر بہت مقبول ہو رہی ہے۔ زمخشری کے ہاں قرآن پاک کے بلاغی نکتوں کے پہلو بہ پہلو معتزلی عقائد بھی بہ کثرت آ گئے ہیں۔ اس پر انھوں نے سوچا کہ زمخشری کی تفسیر سے بلاغت کے نکتے تو لے لئے جائیں، لیکن معتزلی عقائد کو نکال کر اشعری عقائد بیان کر دیے جائیں اور اس طرح سے ایک نئی تفسیر مرتب کر دی جائے۔ اب جن جن باتوں میں انھوں نے زمخشری کی تردید کی ضرورت سمجھی، وہ ساری سورہ بقرہ میں آ گئیں، اس لئے وہ تو بڑی لمبی ہو گئی اور باقی تفسیر میں بس مختصر حواشی ہیں جنھیں کوئی پڑھتا نہیں۔ بیضاوی پر اکتفا کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملاً تفسیر قرآن تو طلبہ کو پڑھائی نہیں جاتی۔ میں نے جید علما میں سے بھی بہت سوں کو دیکھا کہ نہ علم تفسیر سے واقف ہیں، نہ علوم قرآن میں جو مسلمانوں کے کارنامے ہیں، ان سے آشنا ہیں نہ از خود ان کو قرآن مجید پر تدبر کا موقع ملا۔ اکثر لوگوں کو بڑی تفسیروں کے نام بھی پتہ نہیں ہوتے۔ آپ چاہیں تو بیضاوی کے کسی استاد سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ دس بہترین تفسیروں کے نام بتا دیں تو شاید طبری اور ایک آدھ کے علاوہ وہ کوئی قابل ذکر نام بھی نہ بتا سکیں۔ یہ اکثر صورتوں میں واقفیت کا عالم ہوتا ہے۔ بعض صورتیں بلاشبہ مستثنیٰ ہیں۔

اب اگر قرآن پاک ہمارے علوم وفنون، ہماری فکر، ہماری تہذیب اور پوری زندگی کی اساس ہے تو پھر اس کو فی الواقع تعلیم کی بھی اساس ہونا چاہئے۔ یہ بات کہ آپ نے پہلے طالب علم کو ساری چیزیں پڑھا کر اس کے ذہن کا ایک سانچہ بنایا، اس کے بعد اس سانچے کے مطابق آپ اسے قرآن پڑھا رہے ہیں، یہ میرے خیال میں قرآن مجید کی

Marfat.com

تو ہین ہے۔ قرآن اصل سانچہ ہے۔ قرآن کے سانچے سے باقی علوم کو جانچنا چاہیے۔ باقی علوم کے سانچے سے قرآن کو نہیں جانچنا چاہیے۔ کسی کو اچھا لگے یا برا لگے، میں اس کو غلط سمجھتا ہوں اور بہ بانگ دہل غلط کہتا ہوں۔ قرآن معیار ہے، قرآن اصل کسوٹی ہے، قرآن کے معیار اور کسوٹی پر فقہ اور اصول فقہ اور عقائد اور ہر چیز کو جانچنا چاہیے۔ ہم پہلے متاخرین کے مرتب کردہ عقائد اور فتاویٰ اور فروعی وذیلی مباحث پڑھا کر طالب علم کا ایک ذہن بناتے ہیں، پھر اس سے کہتے ہیں کہ اب اس ذہن سے قرآن کو پڑھو۔ جہاں قرآن پاک کے الفاظ تمہارے ذہن کا ساتھ نہ دیں، وہاں اللہ کی کتاب کے الفاظ کو توڑو اور مروڑو اور توڑ مروڑ کر اپنے گروہ کے خیالات کے مطابق ایڈجسٹ کرو۔ یہ میرے خیال میں قرآن کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ اس لئے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ علوم قرآن کی تعلیم کا ایک نیا نظام ہونا چاہیے۔ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال ایک تفصیلی گفت گو کا متقاضی ہے۔ اس پر کبھی بات ہوگی تو اس پر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ علوم قرآن میں تخصص موجودہ درس نظامی سے حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اپنی ذاتی دلچسپی یا ذوق سے پیدا کر لیں تو کر لیں، اس نظام میں اس کا بندوبست نہیں ہے۔ کوئی inherent mechanism نظام میں نہیں ہے کہ قرآن کے متخصصین پیدا ہوں۔

یہی حال علم حدیث کا ہے۔ علم حدیث کا متخصص ازخود کوئی پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ انور شاہ کشمیری کی طرح کے کسی آدمی کو پیدا کر دے تو کر دے، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر جو لوگ تیار ہوتے ہیں، ان میں کوئی حدیث اور علوم حدیث کا متخصص نہیں ہوتا۔ ان کو محض چند فقہی اور کلامی موضوعات سے متعلق وہ حدیثیں یاد ہوتی ہیں جن میں فقہائے احناف کا کوئی کلام یا فقہائے شوافع کا کوئی مستدل ہے۔ مدارس میں تین تین ماہ تک اس پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ یہاں لوگوں کے ایمان ضائع ہو رہے ہیں۔ لوگ ایمان ہی کو نہیں مان رہے کہ ایمان بھی کوئی چیز ہے۔ آپ اس کو چھوڑ کر تین مہینے اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کسی کو بحث نہیں۔آپ نے ایمان کے بارے میں کیا فرمایا، وہ کسی کا concern نہیں۔لوگوں کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اپنے کسی مقتدا یا پیشوا کے نقطہ نظر کو کسی نہ کسی تاویل یا عقلی احتمالات کے بل بوتے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت کر دیں۔اس کے بعد اگلے چھ مہینے ان احادیث پر خرچ ہو جاتے ہیں جن میں فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کی طرح کے اختلافی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جو طالب علم سب سے تیز پڑھنے والا ہوتا ہے، اس کو حکم ہوتا ہے کہ تم حدیث کی کتابوں کے صفحات پڑھو اور روزانہ چالیس صفحے پڑھو۔اس تیز خوانی میں نہ استاد کو اس سے کوئی بحث ہوتی ہے اور نہ شاگردوں کو ہی کچھ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی، جو ساری شریعتوں کا ناسخ اور ہر چیز کا معیار ہے اور جس کے بعد ہر بات کالعدم ہے، اس میں کیا بات کہی گئی ہے۔شروع کے چند اختلافی مباحث کے علاوہ مضامین حدیث اور جواہر نبوت سے طلبہ جوں کے توں ناواقف رہتے ہیں۔

یہی حال کتب حدیث کی شرحوں کا ہے۔کتب حدیث کی شروح کو دیکھ لیجیے۔جو شروع کی بحثیں ہیں، ان میں ایک باب تین جلدوں میں آیا ہے تو دوسرا باب چار جلدوں میں، جب کہ آخر میں تین تین چار چار سطروں کے حاشیے ہیں کہ کذا قال فلان یا قد سبق البحث عنہ یا انظر الکتاب الفلاں۔یہ شرحوں کی کیفیت ہے۔خلاصہ کلام یہ کہ حدیث میں بھی کوئی تخصص مدارس کے موجودہ نصاب اور طرز تدریس کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتا۔فقہ میں تخصص کی صورت حال بھی یہی ہے۔اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان اہم اسلامی تخصصات کے لئے متخصصین کی تیاری کا ایک نیا نصاب ہونا چاہئے جس میں درس نظامی کی ساری کتابیں شامل ہوں۔درس نظامی کی کسی کتاب کو میں متخصصین کے لئے غیر ضروری نہیں سمجھتا، لیکن درس نظامی کی ان کتابوں کے ساتھ مزید بہت کچھ شامل کرنا ضروری ہے، تا کہ واقعی ایسے متخصص پیدا ہوں جو اس فن یا علم کو آگے چل کر پڑھا سکیں۔تفسیر، حدیث اور فقہ میں تخصص کے نصابات تیار کرنے کی ذمے داری ایک اجتماعی ذمے داری ہے۔اس پر جب بھی کوئی سنجیدہ گفت گو ہوگی تو میں بھی اپنی گزارشات پیش کروں گا۔ان اہم اسلامی

Marfat.com

علوم کے متخصصین کی تیاری ایک فوری اور انتہائی اہمیت کا کام ہے۔ وطن عزیز میں علوم اسلامیہ کے مستقبل کو یقینی بنانے کے لئے یہ قدم ایک بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دینی تعلیم کے یہ تین درجے تو عام ہیں، جن کی ملک وملت کو ہر وقت ضرورت ہے۔ ان کے بعد ایک درجہ اور ہے جس کے لئے مزید محنت درکار ہے۔ یہ درجہ ایسے جید ماہرین ومفکرین کی تیاری اور تربیت کا درجہ ہے جو مغربی علوم وفنون کی تنقیح کا فریضہ انجام دے سکیں اور ناقدانہ جائزہ لے کر یہ بتا سکیں کہ ان میں کیا چیز کم زور ہے اور کیا چیز مضبوط ہے، کون سی بات اسلام کے مطابق ہے اور کون سی اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان ماہرین میں جو فقہ کا متخصص ہو، وہ مغربی قانون کا تنقیدی جائزہ لے۔ جو فقہ المعاملات کا متخصص ہو، وہ ان کی معاشیات کا جائزہ لے۔ جو اصول فقہ کا متخصص ہو، وہ ان کے اصول قانون کا جائزہ لے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس میں کتنا وقت لگے گا، کتنے وسائل درکار ہوں گے، آخر کار کتنے لوگ تیار ہوں گے، وہ کیا کیا کام کرسکیں گے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن جب تک یہ سارے کام نہیں ہوں گے، اس وقت تک امت مسلمہ کا مستقبل اس طرح بن نہیں سکتا جس طرح ہم بنانا چاہتے ہیں۔ ماہرین اور مستقبل کے فکری اور تہذیبی معماروں کی تیاری کا یہ کام دنیا کی بہت سی قومیں کرتی ہیں۔ مغربی اقوام میں تو اس غرض کے لئے بیسیوں ادارے بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی گوکھلے نے انیسویں صدی کے آخر میں اسی غرض کے لئے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا۔ علامہ اقبال کے ذہن میں بھی ایسے ہی ایک ادارے کا نقشہ تھا۔

آج صورت یہ ہے کہ ملک وملت کا اجتماعی نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے براہ راست واقف نہیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تو ہے اور ان میں بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں، لیکن جذباتی وابستگی کی بنیاد پر عمارت بنانے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ ریت پر بیس منزلہ عمارت بنانا چاہیں۔ جیسے وہ قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح یہ عمارت بھی لازماً گر جائے گی۔ چناں چہ جب کبھی بھی تھوڑی سی ایسی کوئی بات آتی ہے جو اس طبقے کے خیالات سے مختلف ہو تو وہ فوراً اس کی دوراز کار تاویلیں میں

Marfat.com

عافیت سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کا پیراڈائم اور intellectual framework اسلامی نہیں ہے۔ ان کے ہاں فہم اسلام کی کوئی مضبوط علمی اور فکری بنیاد نہیں ہے۔ اس لئے یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس فکری بنیاد کی فراہمی کے لئے وقت درکار ہے۔ یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہوگا۔ کسی وعظ یا مطالبے یا بینر یا دھرنے سے نہیں بنے گا۔ اس کے لئے لگ کر کام کرنا پڑے گا۔

یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں اسلامی علوم وفنون کے طلبہ سے کرنا چاہتا تھا۔ چوں کہ آپ بھی اسی میدان کے شہ سوار ہیں اور اس ضرورت کی تکمیل کی ذمے داری آپ کے کندھوں پر بھی ہے، اس لئے میری گفت گو میں تھوڑی سی تلخی آگئی جو میں نے جان بوجھ کر شامل کی ہے، تاکہ اس تلخی کا احساس آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں، اس کا تعلق کسی ذہنی عیاشی یا محض کسی عام تفریحی فکری سرگرمی سے نہیں ہے، بل کہ وہ واقعی بڑی اہم بات اور مسلمانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ میں علامہ اقبال کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ زبور عجم کا شعر ہے:

نوائے من ازاں پرسوز و بے باک وغم انگیز است
بخاشاکم شرار افتاد و باد صبح دم تیز است

میں اس لئے تلخ باتیں کر رہا ہوں کہ میرے آشیانے کو آگ لگ گئی ہے اور ہوا تیز ہے۔ آشیانے کو ابھی اور فوراً بچانے کی ضرورت ہے۔

امر واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ملی اور تہذیبی آشیانے کو آگ لگ چکی ہے اور باد صبح دم تیز ہے۔ آشیانہ جل جانے کا خطرہ ہے اور بہت جلد اس کو بچانے کی ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

جدید تہذیبی تصادم

اور اسلام

Marfat.com

جدید تہذیبی تصادم اور اسلام

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں یہ عالمی سطح پر تہذیبی تصادم کا دور ہے، دنیا کی مختلف ثقافتوں، نظریات، اصولوں اور نظاموں میں باہم کش مکش جاری ہے۔ آج نام ور مغربی مفکرین اور مؤرخین زور شور سے اس فکری کش مکش اور تہذیبی تصادم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آج نہ صرف ملکی قوانین اور پالیسیاں بل کہ تعلیم وثقافت سے لے کر آرٹ اور روزمرہ زندگی کے مظاہر تک سب اس بنیادی تصور زندگی اور نظریۂ حیات یعنی نظریہ کائنات Weltanshauung سے اس طرح وابستہ ہیں، جس طرح کسی درخت کی شاخیں اور پھول اس کی جڑ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

آج کے اس نظریۂ حیات کا ایک امتیازی وصف مذہب کے معاملے میں (بہ ظاہر) ایک مکمل غیر جانب داری کا ہے۔ لیکن درحقیقت آج کے سارے اجتماعی تصورات یا تو مذہب دشمن ہیں یا لامذہبی طرزِ عمل پر مبنی ہیں، یا کم از کم مذہب کے بارے میں غیر جانب داری کے مدعی ہیں۔ اس کا ایک اہم اور لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کا انسان مذہبی عقائد کے بارے میں کسی اجتماعیت کو قبول کرنے میں سخت پس وپیش سے کام لیتا ہے اور مذہب کے معاملے میں انفرادیت پسندانہ رویے کو ہی ایک قابلِ قبول اور قابل برداشت رویہ سمجھتا ہے۔

تہذیبوں کا یہ تصادم نوع انسانی کو ہر آن طرح طرح کے پیچیدہ مسائل میں

Marfat.com

الجھا رہا ہے۔ ویسے تو دنیا کی ہر قوم اپنی جداگانہ تہذیب کا پرچم اٹھائے ہوئے اس رزم گاہ میں اتری ہے، لیکن عالمی تہذیبی تصادم کے منظرنامے پر صرف دو ہی ایسی تہذیبیں آمنے سامنے دکھائی دیتی ہیں جن کی کش مکش سے پوری دنیا متاثر ہو رہی ہے:

۱۔ ایک طرف دینِ فطرت اسلام کی آفاقی روحانی تہذیب ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لئے خیر و فلاح کا ابدی پیغام لئے ہوئے ہے۔

۲۔ اور دوسری جانب مغرب کی اباحیت پسند تہذیب ہے، جو دین سے بے زار، میکانکی نظریۂ حیات پر استوار اور مخلوط معاشرت کی علم بردار ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کا تصادم ہی بالآخر اسی دھرتی کے سینے پر نوعِ انسانی کی آخری تقدیر کا فیصلہ لکھے گا، اور اسی پر آج پوری دنیا کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں، اور یہی ہے عصرِ حاضر کا وہ چیلنج جس سے امت مسلمہ کو عہدہ براہونا ہے۔

یہ دور تاریخِ اسلام کا نازک ترین دور ہے۔ آج مختلف ذرائع سے دنیائے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں۔ پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا ایک طوفان ہے جو دنیائے اسلام کے خلاف کھڑا کرا دیا گیا ہے۔ یہ دور معلومات کی وسعت اور نت نئے انکشافات کے انفجار (Explosion) کا دور ہے۔ انفجار معلومات کی جتنی شکلیں انسانوں کے تصور میں آ سکتی ہیں وہ سب اس دور میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ آج سے پچاس سال قبل لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ معلومات و اطلاعات اس تیز رفتاری کے ساتھ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل کی جا سکتی ہیں، جتنی وسعت کے ساتھ آج منتقل ہو رہی ہیں۔ آج ایک مغربی ملک میں ایک مفکر ایک نظریہ پیش کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کرۂ ارض کے علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بن جاتا ہے۔ آج ایک بڑی طاقت کا سربراہ نئے عالمی نظام کا ذکر کرتا ہے اور دنوں یا ہفتوں میں نہیں گھنٹوں کے اندر اندر وہ دنیا بھر کی سیاسیات کا سب سے اہم عنوان قرار پا جاتا ہے۔

اس صورت حال سے دنیائے اسلام بھی متاثر ہو رہی ہے۔ آج پاکستان کی

Marfat.com

ایک ماتحت عدالت میں ایک غیر مسلم کے خلاف ملکی قانون کے تحت ایک مقدمہ دائر ہوتا ہے اور چند دنوں کے اندر اندر وہ دنیا کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ کی خبروں اور فیچروں کی سب سے اہم خبر بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے۔ ایک عدالت سے دو غیر ملکیوں کو قانون کے مطابق سزا ہوتی ہے اور روئے زمین کے ہر گوشے سے اتنا شدید ردِ عمل سامنے آتا ہے کہ کم زور ایمان مسلمان اور کم زور تخت و تاج والے حکم راں اندر سے حیران و پریشاں اور باہر سے لرزاں و ترساں نظر آتے ہیں۔ ایک مسلم ملک میں ایک عالم دین ایک بات کہتا ہے اور دنیا اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی خستہ حال عمارت زلزلے کا شکار ہو گئی ہو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کا دور محدودیت کا دور نہیں ہے۔ آج کا دور کسی انغلاق کا دور نہیں ہے کہ کوئی قوم اپنے آپ کو کسی خول میں بند کر کے یہ سمجھنے لگے کہ وہ اپنے کو محفوظ کر لینے میں کام یاب ہو گئی ہے۔ آج کا دور تفتح کا دور ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنے دروازے اور کھڑکیاں دوسروں کے لئے کھول دینے پر مجبور ہے۔ سوویت یونین جیسی دہشت انگیز طاقت تک کے آہنی پردے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کا یہ سمجھ لینا کہ ہم دنیا سے آنکھیں بند کر کے دنیا کی آنکھیں بھی بند کر دیں گے، درست نہیں ہے۔ آج مسلمان جو کچھ کریں گے اس کے اثرات پوری دنیا پر ہوں گے۔ آج مسلمان جو کہیں گے وہ ساری دنیا میں سنا جائے گا اور اس پر موافقانہ اور مخالفانہ دونوں انداز سے رائے زنی ہو گی۔

مغرب کی مسلسل پھیلتی ہوئی بالادستی کا جو گزشتہ دو صدیوں میں بڑھتی گئی، نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام اور مسلم کلچر کو غلط سمجھا گیا۔ نظری اعتبار سے بہت سے لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کا ایک اپنا دنیاوی نظریہ ہے جو زندگی کے بارے میں نقطہ نظر پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ بنیادی تصور ہے جو انسان کے اس دنیا میں مقام و مرتبے کا تعین کرتا ہے اور اس کائنات کے ساتھ اس کے رشتے و تعلق کی نوعیت کا تعین کرتا ہے، جس پر اس زندگی میں اس کے کردار کے متعلق دوسرے تمام سوالات کا دارومدار ہے۔ دنیا کے بارے میں لوگوں کے نقطۂ نظر کو جس قدر بھی کم سنجیدگی سے لیا جائے اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ یہی

Marfat.com

ان کی زندگیوں کو منظم بناتا اور ان کے کاروبارِ حیات میں ترقی کو باضابطہ بناتا ہے۔

اس رعایت کے باوجود مسلمانوں میں عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہمارے مغربی دوست اور ان کے مغربیت میں رنگے ہوئے پیروکار زندگی کے بہت سے اہم مسائل کے مقابلے میں مسلمانوں کے مقام و مرتبے کو بہ نظرِ تحسین نہیں دیکھتے۔ اگر کسی گروہ کا دنیاوی نقطہ نظر اس کے نظریات اور آرا کو ایک شکل دینے میں کوئی کردار ادا کرتا ہو اور اگر پہلے کے کئی نتائج بعد کے نتائج سے مختلف ہوں تو پھر مسلمانوں کے حقوق کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ کئی معاملات میں ان لوگوں کے حقوق سے مختلف ہوں گے جن کا دنیاوی نقطۂ نظر ان کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو اپنے اخلاقی ڈھانچے اور خاندانی زندگی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، اس معاشرے سے ضرور مختلف ہوگا جو معاشی امور کو اگر منفرد نہیں بناتا تو ایک فرد کے مفادات کو زیادہ اہمیت ضرور دیتا ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی کے درمیان پائے جانے والے رشتے و تعلق کی نوعیت ایک اسلامی معاشرے میں جدید مغربی معاشرتی ڈھانچے میں پائے جانے والے تعلق سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں خاندان کا تحفظ معاشرے کے ایک بنیادی چھوٹے سے حصے کی حیثیت رکھتا ہے، اسے بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کو خاندان کے ادارے کی حفاظت اور بچاؤ کے بارے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ایسے معاشروں میں خاندان کو اپنی بنیاد اسلام کی سماجی و اخلاقی ساخت پر رکھنی پڑتی ہے، خاندان کی سماجی ہم آہنگی اور یک جہتی میں خلل ڈالنے کی ہر کوشش کو جیسا کہ ایک مثالی اسلامی ڈھانچے میں یہ تصور موجود ہے، خود اسلامی معاشرے پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس میں اس لئے حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ایسی کوششوں کو اسلام شیطانی کوششیں سمجھتا ہے اور سنت انہیں ناپاک قرار دیتی ہے۔

معاشرہ اور ریاست اسلام میں اپنے اندر اختتام پذیر نہیں ہو جاتے بل کہ یہ تو اس کائنات میں انسان کے مقصدِ حیات کے حوالے سے کچھ مقاصد کے حصول کے صرف ذرائع ہیں۔ قرآن کے مطابق یہ مقصد ایک ایسے انسان کی تخلیق ہے جس نے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہو۔ جس نے خالق کائنات کے حتمی مقاصد کو پورا

Marfat.com

کرنے کا عہد کر رکھا ہو۔ اور جوان آدرشوں اور مقصودات سے پوری طرح واقف ہو جو اس کے خالق نے اسے سکھائے تھے۔ اس سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان کو ہمہ وقت یہ احساس رہے کہ اس نے آگے چل کر اپنے تمام ظاہر اور چھپے ہوئے اعمال و افعال کا حساب دینا ہوگا۔ یہ احتساب ہمہ گیر، کلی، جامع اور اٹل ہونا چاہیے، تاکہ کسی فرد کو یہ توقع نہ ہو کہ وہ اس سے بچ جائے گا۔ یہ کلی، جامع اور اٹل احتساب جس کے لئے ہر انسان کو تیار رہنا چاہیے، وہ واحد غایت ہے جو ایک انسانی معاشرے میں حقیقی عدل و انصاف کے حصول کو یقینی بناتی ہے۔

اسلامی اصولوں پر تشکیل پانے والے معاشرے کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس عہد و پیمان کی پرورش کرے، تاکہ اس احتساب کی آزمائش سے کامیاب گزر جائے۔ کیوں کہ اگر یہ احساس کم زور پڑ جائے یا گہنا جائے تو مردوں اور عورتوں کی مضبوط مادی خواہشات اور جسمانی رجحانات کو اخلاقی حدود کے اندر رکھنے کا کوئی باطنی جواز نہیں رہ جاتا۔ اس پہچان پر اسلامی تعلیمات کے مطابق کوئی ریاست اپنے شہریوں کی سماجی زندگی کے اس بنیادی مفاد سے غافل رہنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسلامی ریاست اپنے اخلاقی نصب العین کے بارے میں غیر جانب دار نہیں رہ سکتی۔ اس کے وجود کا جواز صرف اس وقت بنتا ہے جب یہ ان اصولوں کی حفاظت اور ترقی کے لئے سرگرم عمل رہے، جن کی بنیاد پر یہ وجود میں آئی ہے۔ چناں چہ اس کا ایک مثبت نظریاتی کردار ہے، جو اسے اپنے اہداف کی ترقی کے لئے ادا کرنا چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ ایک اسلامی ریاست بل کہ کوئی بھی مہذب اور ذمے دار سیاسی سرگرمی ان بنیادوں کے بارے میں غیر متحرک اور لاپروا رہنے کی متحمل نہیں ہوسکتی، جن پر اس کا وجود کھڑا ہو۔ ماضی قریب میں ہم نے جدید دنیا کی چند نہایت اہم اور بڑی توانا نظریاتی ریاستوں میں سے ایک ریاست دیکھی۔ اپنے پروگرام سے اس کے عہد و پیمان اور فلسفے نے اس کے لئے اس بات کو ضروری ٹھہرایا کہ اسے نہ صرف اپنے قومی پروگرام تیار کرنے بل کہ اپنی بین الاقوامی پالیسیاں وضع کرنے کے لئے بھی ایک فعال نظریاتی کردار ادا کرنا چاہیے۔ جدید مغربی ریاستیں جو اس دور کی واحد

Marfat.com

محوری دنیا میں برسرِ اقتدار سپر پاور کے نصب العین کو آگے بڑھانے میں مصروف ہوں اپنی موجودگی کی فلسفیانہ بنیاد کے بارے میں کسی طرح بھی غیر جانب دار نہیں ہیں۔ ایک مغربی جمہوری نظام جس کی بنیاد سیاسی پارٹیوں، بالغ رائے دہی، آزاد مارکیٹ معیشت، اور آزاد خیال نہ کہ بداخلاق سماجی ڈھانچے پر ہو مغربی نظام کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب کا ان مقاصد کے لئے حصول کے لئے کیا گیا عہد اتنا بے لچک ہے کہ بعض اوقات تو یہ سیاسی گلا گھونٹنے اور ذہنی گھٹن کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔

بہ ظاہر تو یوں لگتا ہے جیسے مشرق میں مغرب اور اس کی اقدار اور مقاصد کے علم بردار مشرق والوں کو یہ آزادی دینے کے لئے بھی تیار نہیں کہ وہ مغربی اقدار اور معیارات سے بچ کر نکل جائیں، یہاں تک کہ مغربی جمہوری پرزہ کاری بھی جس کی بنیاد بالغ رائے دہی پر ہے اگر مغربی سماجی اقدار، سماجی نمونوں اور سیاسی مفادات کو ترقی نہیں دیتی تو مغرب کے لئے ناقابل قبول ہوتی ہے۔ الجیریا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس میں ہم سایہ مغربی طاقتیں چشم پوشی سے کام لے رہی ہیں اسے دنیا بھر کے مسلمانوں نے مغرب کی طرف سے ان کے حق خود ارادی کو تسلیم کرنے سے انکار قرار دیا ہے۔ ایک بڑے مغربی ملک میں نام ور معاصر مسلم محققین کی دو درجن کتابوں کی فروخت پر پابندی لگا دینے کے عمل کو مسلمانوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سمجھا کہ مغرب نے آزادیٔ اظہار کو تسلیم کرنے سے فرار حاصل کر لیا ہے۔ اسلامی حکومتوں کی طرف سے رشدی کی کتاب کی فروخت پر پابندی لگنے پر تو بہت شور ہوا لیکن تنقید کرنے والوں نے اس کتاب کی فروخت پر ایک مہذب مغربی ملک میں پابندی لگنے پر تو کوئی آواز نہیں اٹھائی تھی۔ دو معصوم لڑکیوں کے اس اصرار پر کہ وہ اپنے سروں کو دوپٹے یا اوڑھنی سے ضرور ڈھانپ کر رکھیں گی مغرب میں جو ردِ عمل ہوا اسے مسلمانوں نے مغرب والوں کی طرف سے مغربی سماجی اصولوں کی رقابت آمیز حفاظت کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔

اس میں شک نہیں کہ امت مسلمہ دنیا کی بہترین، زندہ اور فعال (dynamic) تہذیب کی علم بردار ہے، لیکن اس تہذیب کی توانائیوں سے پوری نوع انسانی کو بہرہ ور

Marfat.com

کرنے کی ذمے داری امت مسلمہ کا سب سے بڑا امتحان ہے اور عصر حاضر کا المیہ یہ ہے کہ ہم اس امتحان کی نزاکتوں کا پوری طرح ادراک نہیں کر پا رہے۔ تہذیب مغرب کی یلغار نے امت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اس کی ظاہری چکا چوند ہماری نگاہوں کو خیرہ کرنے لگی ہے، حال آں کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی ساری تابانی فقط جھوٹے نگوں کی ریزہ گری ہے اور

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

کے مصداق یہ اپنے باطن میں انسانیت کے لئے تباہی و بربادی کے ہزار سامان لئے ہوئے ہے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار سے تہی دامن یہ تہذیب آج بہ ظاہر دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن خود اس کی اپنی کوکھ سے ایک عالم گیر اضطراب، انتشار اور بدامنی کا عفریت جنم لے چکا ہے جو رفتہ رفتہ پوری نوع انسانی کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رہا ہے۔ یہ عصر حاضر کا سب سے بڑا آزار ہے اور نوعِ انسانی کو اس آزار سے بچانا ہم مسلمانوں کی ذمے داری۔

اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ارباب فکر و دانش اور اہلِ قلم آگے بڑھیں، اپنی بصیرت، فراست اور فہم و ادراک کی سب قوتیں بہ روئے کار لائیں اور مغرب کی فرسودہ تہذیب کے مکروہ چہرے سے نقاب الٹ دیں، تا کہ انسانیت اس کے باطن کی تمام آلائشوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لے اور جلد از جلد اس کے حصار سے چھٹکارا پا لے۔

Marfat.com

اسلامی دنیا
اور نیا عالمی نظام

Marfat.com

اسلامی دنیا اور نیا عالمی نظام

نیو ورلڈ آرڈر سے مراد دنیا کی آئندہ سیاسی صورت حال کے بارے میں آج کی بالا دست قوتوں کی سوچ کا ایک انداز ہے۔ آج کی طاقت ور قوتیں مستقبل میں دنیا کو جس طرح چلانا چاہتی ہیں اس کا نام ورلڈ آرڈر ہے۔ اس نئے مستقبل کے عالمی نظام میں سکہ کس کا چلے گا؟ بات کس کی سنی جائے گی؟ کون بے عزت ہو کر رہے گا؟ اور کون باعزت ہو کر رہے گا؟ ان سب چیزوں کا وہ ایک نیا نقشہ ترتیب دے رہیں۔ ماضی میں بھی ایسی کوششیں ہو چکی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کے بڑوں نے دنیا کا ایک نقشہ بنایا تھا اور اس نقشے کے مطابق دنیائے اسلام کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ نظام سلطنت برطانیہ نے ترتیب دیا تھا۔

اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد پھر ایک نیا نقشہ بنایا گیا۔ وہ بھی ایک ورلڈ آرڈر تھا۔ وہ نقشہ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اب امریکہ اور اس کے حامی مل کر ایک نقشہ اپنی بالا دستی کی بقا کے لئے ترتیب دے رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس مل کر پوری دنیا کو بالعموم اور مسلم دنیا کو بالخصوص اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ یہی نیو ورلڈ آرڈر ہے۔ مسلم دنیا کے بارے میں ان کا فارمولا یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں کوئی ایسی آزاد مملکت قائم نہ ہونے دی جائے جس کے پاس اس کی اپنی آزادانہ طاقت ہو۔ دنیائے اسلام میں کوئی حکومت نہ رہنی چاہئے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو اور اسلامی دنیا کو مذہب کی بنیاد پر اکٹھی کر سکے۔ دنیائے اسلام کو کوئی ایسی ٹیکنالوجی فراہم نہ کی جائے جس

Marfat.com

کے بل بوتے پر وہ جرمنی، جاپان، سوئٹزر لینڈ کی طرح آزاد، طاقت ور اور خوش حال ہو سکیں۔ دنیائے اسلام میں ایسے عناصر کو ختم کر دیا جائے جو کسی وقت بھی ان بڑوں کے حکم کے خلاف ورزی کر سکیں۔ دنیائے اسلام میں مضبوط اور کثیر تعداد میں کوئی فوجی قوت باقی نہ رہنے دی جائے جس سے کام لے کر کوئی مسلم ملک اپنی آزاد پالیسی بنا اور چلا سکے۔ یہ ہے نیو ورلڈ آرڈر کا تصور! اس پر عمل ہو رہا ہے۔

مسلم ممالک میں بعض ممالک جو جغرافیائی طور پر بڑے ہیں وہ اس ورلڈ آرڈر کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں، اس لئے ان کا بٹوارہ کیا جائے گا۔ جن ممالک کے پاس ٹیکنالوجی یا تیل کی قوت ہے ان کی دولت کو کسی نہ کسی طرح بے اثر یا تباہ کر دیا جائے گا اور انہیں سیاسی خلفشار سے دوچار کر دیا جائے گا کہ وہ اپنے بقا کی جدوجہد ہی میں مصروف رہیں۔ ایسے ممالک جن میں ان بڑی طاقتوں کی فوجیں موجود ہیں اگرچہ وہ ممالک مکمل طور پر ان کے ساتھ ہیں، لیکن ان کو اتنا طاقت ور نہیں ہونے دیا جائے گا کہ وہ کسی وقت ان بڑوں کے لئے ہی خطرہ بن جائیں۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو بڑھا کر مسلم معاشروں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ جیسے پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ملک کو مستقبل میں کم زور کرنے کے لئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ اختلافات کی آگ آگے بڑھتی ہے تو اس کے اثرات یہاں سے آگے دوسرے مسلم ممالک میں پھیلائے جا سکتے ہیں۔ مصر، افغانستان، سعودی عرب سب اس کی زد میں آ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسلم معاشروں میں موجود عناصر کو ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی کے مذہبی جذبات کو بلیک میل کر کے، کبھی کسی کی انا کو ابھار کر، کبھی کسی کو روپے کے بل بوتے پر اس خلفشار کو ہوا دینے پر آمادہ کر کے۔ میں کسی ایک فرقے یا مسلک کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں مسلم معاشروں کا عمومی جائزہ پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرے لیے سب قابل احترام ہیں۔ غرض کہ غیر مسلم دنیا کے عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم دنیا میں کوئی ہلچل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ یہی اس ورلڈ آرڈر کی تعمیل و تکمیل ہے۔

Marfat.com

دنیا اسلام اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے:

ایک حصہ وہ ہے جو آزاد مسلم مملکتوں پر مشتمل ہے جن کا اپنا علاقہ، اپنا دین، اپنا قانون، اپنی حکومت اور اپنے عوام ہیں جو ایک خودمختار مملکت کے اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں

دنیائے اسلام کا دوسرا حصہ وہ ہے، جو غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے طور پر رہائش پذیر ہے۔ بہ ہر حال ایک مسلمان، چاہے اسلامی ریاست کا شہری ہو یا کسی غیر مسلم ملک میں رہتا ہو وہ فکری طور پر اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے، اسلامی شریعت کو آخری الہامی نظام حیات مانتا ہے اور موجودہ دور میں اسلام کے تقاضوں کے مطابق زندگی کی تشکیل نو کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ تاہم آج کل ایک سوال عام طور پر اٹھایا جا رہا ہے، اور وہ یہ کہ لادینیت کے موجودہ دور میں اسلامی نظام اور اسلامی قانون کی معنویت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دور زوال کے بعد سے عملی طور پر آج تک کسی بھی جگہ یا کسی بھی ملک میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کے قوانین کے نفاذ کے لئے بہت کم کام کیا گیا ہے، لہٰذا عمل کی کسوٹی اور تجربے کی میزان میں ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ واقعی دور جدید میں اسلامی نظام کی کوئی معنویت ہے بھی یا نہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ دنیائے اسلام میں اس ضمن میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی اور اسلامی شریعت کی معنویت کا یہ سوال ایک خالص نظری سوال ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، اس لئے کہ دنیائے اسلام میں معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے، پاکستان میں بھی یہ تجربہ کامیابی سے (اگرچہ جزوی اور نیم دلانہ انداز سے) جاری ہے اور پاکستان سے باہر بھی قابل ذکر کام ہوا ہے۔ اس پیش رفت کی وجہ یہ ہے کہ قریب قریب سب ہی مسلم ممالک میں ایک مضبوط رائے عامہ شریعت کے نفاذ کے لئے پائی جاتی ہے۔ اور اگر کسی ملک میں اس سلسلے میں پیش رفت نہیں ہوئی تو وہاں کم از کم ایسا ضرور ہوا ہے کہ اس رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے کوئی ایسا نظام بھی مکمل طور پر مسلم ممالک میں جگہ نہیں پا سکا جو اسلامی عقائد اور تصورات اور مسلمانوں کی تاریخی روایات سے متصادم ہو۔

Marfat.com

ترکی کو دیکھئے، جہاں ۱۹۲۴ سے تمام سرکاری وسائل اور ریاستی طاقت سے کام لے کر سیکولرزم کا نفاذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، وہاں سیکولرزم کو ہر قسم کی سرکاری امداد پہنچائی گئی، اور ہر وہ اقدام کرنے کی تمام شعوری کوششیں کی گئیں جو ترکی کو ایک خالص لا مذہبی مغربی ملک بنا سکیں۔ ملکی دستور اور قوانین کا معاملہ ہو یا نظام تعلیم کا، لوگوں کے عام رہن سہن کے معاملات ہوں یا قومی زبان ترکی کے رسم الخط کا سوال ہو، وہاں ہر سوال کا جواب مغرب کے اتباع کامل کی صورت میں دیا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر بہت سے خوش فہم مغربی مصنفین نے یہ کہہ دیا کہ اب ترکی میں سیکولرزم اور مغربیت نے اتنے پاؤں جمالئے ہیں کہ اب ترکوں کو سیکولرزم کے اثرات سے آزاد کرنا ممکن نہیں رہا۔

لیکن اسلام سے اس تمام تر دوری کے سرکاری اعلان و مظاہرے کے باوجود بھی کیا ترکی مغربی اقوام میں وہ مقام حاصل کرسکا جو دیگر یورپی ممالک میں ایک یورپی ملک کو حاصل ہے؟ میری ناچیز رائے میں اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم ممالک کو ترکی کے طویل تاریخی تجربے سے سبق سیکھنا چاہئے اور غور و توجہ سے پہلے صورت حال کا مشاہدہ و مطالعہ اور پھر اس سلسلے میں مغرب سے کوئی معاملہ کرنا چاہئے۔

جو کش مکش دنیائے اسلام کے دیگر ملکوں میں جاری ہے اور جو افراتفری دنیائے اسلام میں پائی جاتی ہے کیا واقعہ نہیں ہے کہ بالکل ویسی ہی کش مکش اور افراتفری ترکی میں بھی پائی جاتی ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ترکی کی مغربیت اور لا مذہبیت وہاں کے مسلم ذہن کو مطمئن نہیں کرسکی اور ترکی میں ہونے والی تبدیلیوں اور انحرافات کو (جن کو بعض حضرات اصلاحات قرار دینے پر مصر ہیں) مسلم ذہن نے قبول نہیں کیا۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے ساٹھ کے قریب آزاد یا نیم آزاد (بل کہ درحقیقت برائے نام آزاد) ملکوں میں ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم صحیح مثالی اسلامی ملک کہہ سکیں، جہاں اسلامی احکام پورے طور پر جاری و ساری ہوں اور جہاں کے نظام کو جزوی طور پر ہی سہی اسلام کے تجربے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ لیکن بالکل اسی طرح دنیائے اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جس کو

Marfat.com

ہم خالص مغربی طرز جمہوریت کا مکمل نمونہ قرار دے سکیں، حال آں کہ مسلم ممالک میں قریب قریب سب ہی جگہ مغربی طرز جمہوریت کو اپنانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے، انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور آذربائی جان سے لے کر سوڈان تک سب مسلم ممالک میں ایک بااثر اور طاقت ور طبقہ حکومتی قوت و اقتدار سے کام لے کر مغربی طرز سیاست کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسلامی قوتوں کی طرف سے اس کوشش کی مزاحمت اگر چہ نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن ایک قسم کی کش مکش جاری ہے اور ابھی تک مسلم ذہن اور مسلم مزاج نے لا مذہبی جمہوریت کو پورے طور پر قبول نہیں کیا۔

اس صورت حال کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں، تیسرا جواب نہیں ہو سکتا۔ یا تو ہم اس مغربی لا مذہبی جمہوری نظریہ کو اختیار کرلیں اور یہ کہہ دیں کہ مغربی جمہوری لا مذہبی نظام مزاج کے لحاظ سے دنیائے اسلام کے ضمیر اور خمیر سے مطابقت رکھتا ہے، اور اس کو مسلمانوں کے انفرادی ضمیر اور اجتماعی خمیر کے ساتھ مکمل ہم آہنگی حاصل ہے۔ اور اگر کچھ لوگوں کو اس ہم آہنگی سے اتفاق نہ ہو تو وہ چوں کہ دنیائے اسلام کے مزاج کی نمائندگی نہیں کرتے اس لئے ان کے ذہن کو اس مقصد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن گزشتہ سوسوا سو سالوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ یہ نقطۂ نظر دنیائے اسلام نے قبول نہیں کیا۔

دوسرا جواب یا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ جمہوریت کا مغربی نظام تو بڑی مفید اور کارگر شے ہے لیکن مسلمان ہی بڑے غیر مہذب اور غیر شائستہ ہیں کہ انہیں دنیا میں جینے کا ڈھنگ اور رہنے کا سلیقہ نہیں آتا اور وہ لا مذہبی جمہوری نظام جیسے خیر محض کو اپنانے میں متامل ہیں۔ مذکورہ بالا سوال کے یہی دو جواب ممکن ہیں، جو ہمارا مغرب زدہ طبقہ سو سال سے دے رہا ہے۔ اکثریت پہلے آہنگ میں اور ایک حقیر اقلیت دوسرے آہنگ میں یہ بات کہتی چلی آ رہی ہے۔

دنیائے اسلام شعوری طور پر کون سا عالمی نظام پسند کرتی ہے اور کون سا سیاسی نظام بالآخر اپناتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس سارے تجربے پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ جب تک اپنی موجودہ صورت حال پر ایک غیر جانب دارانہ اور ناقدانہ نظر نہیں ڈالی جائے گی اور اس بات کا تعین نہیں کیا جائے گا کہ مسلمانوں کو اس وقت کس نظام کی ضرورت

Marfat.com

ہے، ان کے موجودہ جاری نظاموں میں کیا کیا خامیاں پائی جاتی ہیں، ماضی کے کن تصورات و تجربات سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور موجودہ دور میں کس طرح اسلام کے سیاسی نظام پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اس وقت تک کسی قابل عمل سیاسی نظام کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔

اس بارے میں مسلمانوں میں دو انتہائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک انتہا یہ ہے کہ ماضی کے چودہ سو سالہ دور میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے اور ان کو جن جن تاریخی، سیاسی اور انتظامی تجربات سے گذرنا پڑا ہے ان سب کو جوں کا توں اختیار کر کے اسی کو دہرانا چاہیے۔ اس پر نہ کسی نظر ثانی کی ضرورت ہے نہ کسی رد و بدل کی حاجت۔ یقیناً اسلام کے کسی بنیادی اصول سے انحراف کر کے اور مسلمانوں کے تشخص اور ان کی اقدار کی قیمت پر اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، بلاشبہ اسلامی روایات کے تسلسل میں کمی رکھنے کو کسی قیمت پر قبول نہیں کیا جا سکتا، لیکن اسلام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی بھی ملک میں نظام اسلام کے احیا و تنفید کے وقت وہاں کے حالات و واقعات کا ادراک ضروری ہے۔

بلاشبہ یہ ایک انتہا پسندانہ نقطہ نظر ہے۔ نہ مسلمانوں کا ہر تجربہ دوسرے انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہے اور نہ اسلامی تاریخ کی ہر نظیر میزان شریعت پر پوری اترتی ہے، نہ قرآن مجید نے کہیں اس کو لازمی قرار دیا ہے کہ اگر ایک دور کے مسلمان اپنی کسی سیاسی یا انتظامی ضرورت سے کوئی ادارہ قائم کریں تو بعد والوں کو لازماً ویسا ہی ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی بھی ملک اور قوم میں اسلام کے احکام پر عمل درآمد کراتے وقت وہاں کے حالات و مسائل کا ادراک کرنا چاہیے اور حالات کی مناسبت سے ضروری ہو اور ناگزیر ہو تو مناسب تدریج سے کام لینا چاہیے۔

دوسرا انتہا پسندانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کو ماضی سے ہر طرح کا رابطہ منقطع کر کے موجودہ دور کے رائج الوقت ملحدانہ نظاموں اور نظریات میں سے کسی کو اپنا لینا چاہیے۔ اسلام کے پرانے فرسودہ اصول و ضوابط کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر مقامی مسلمان یا عوام اس میں مزاحمت کریں تو ان کی مزاحمت کو ریاست کے جبر و تشدد سے کچل دیا جائے، اس معاملے میں مسلمانوں یا مسلم ممالک کی فرسودہ روایات اور از کار رفتہ تجربات سے

Marfat.com

کسی استفادے کی ضرورت نہیں۔ افسوس کہ دنیائے اسلام اکثر و بیشتر حکم راں طبقات اس دوسرے نقطہ نظر کی حامل ہیں اور جہاں جہاں ان کا بس چلا انہوں نے ریاستی جبر سے کام لے کر اپنے نیم پختہ اور ادھ کچرے نظریات کو عامہ الناس پر بہ زور مسلط کرنے کی پوری کوشش کی، اور مسلمانوں کو اسلام سے برگذشتہ اور منحرف کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ تونس کے صدر بورقیبہ سے لے کر انڈونیشیا کے ڈاکٹر سوکارنو تک اور ترکی کے مصطفیٰ کمال سے لے کر صومالیہ کے سیاد بری تک سب کا ریکارڈ اس معاملے میں ایک سا ہی ہے، کسر کسی نے نہیں چھوڑی۔

لیکن یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ دنیائے اسلام کے اجتماعی مزاج نے ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ موخر الذکر نقطہ نظر کے حامیوں کا تیزی سے زوال اور ان کے مسلط کردہ نظریات اور پروگراموں سے بےزاری کی لہریں دنیائے اسلام میں بڑی نمایاں اور واضح ہیں۔ رہے اول الذکر نقطہ نظر کے علم بردار تو چوں کہ وہ فی الجملہ اخلاص سے بات کرتے تھے اس لیے ان کے فلسفیانہ غور و فکر نے ان کے نقطہ نظر میں بڑی مثبت تبدیلی پیدا کی ہے اور اب پہلے جیسی انتہا پسندانہ باتیں کرنے والے حضرات تعداد بڑی محدود اور کم ہوتی جارہی ہے۔ پھر جہاں جہاں اسلام کے نام پر انتہا پسندانہ تحریکیں ہیں بھی وہاں ان کے ظہور کی اصل وجہ اور بنیادی عامل وہاں کی حکومتوں کا غیر ضروری جبر اور اسلام کی آواز پر نامعقول قسم کی بندشیں ہیں۔ اگر جماعت تکفیر و ہجرت اور حزب التحریر وغیرہ کے ہاں خیالات میں کہیں کہیں شدت نظر آتی ہے تو وہ متعلقہ عرب ممالک کے مقامی حالات کا ردعمل ہے۔

ان گزارشات کا مدعا یہ ہے کہ دنیائے اسلام کو نہ صرف ابھی ایک قابل عمل، اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول اور عدل و انصاف کے تقاضوں پر مبنی داخلی سیاسی نظام اور دستوری نقشہ مرتب کرنا ہے، بل کہ ایک ایسا عالمی نظام نامہ بھی تشکیل دینا ہے جس کی اساس اسلام کے قانون بین الممالک کے اصولوں، دور جدید کے مفید اور مثبت تجربات اور دنیائے اسلام کی دبی ہوئی بل کہ کچلی ہوئی آرزوؤں کی تکمیل پر ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس باب میں اپنا ذہن صاف کرلیں کہ مغرب کے سیاسی اور عالمی نظاموں نے ہمارے مسائل حل نہیں کئے، مغرب کے تجربے سے ہمیں جو کچھ (جزوی طور

Marfat.com

پر) لینا تھا وہ ہم لے چکے اور اب ہمیں وہاں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ جب تک اس بنیادی مسئلے پر ذہن صاف، مستقبل واضح اور ارادہ پختہ نہیں ہوگا ہم آگے پیش قدمی نہیں کر سکتے۔

دور جدید میں اسلامی نظام کے معنویت کو سمجھنے کے لئے مغرب کے مختلف نظاموں اور قوانین کے تجربات کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ دنیائے اسلام کو مغرب کے عالمی نظام نے اب تک کیا دیا اور مزید کیا دے سکتا ہے اس کے بارے میں دو ایک ضروری اور اصولی باتیں اختصار سے عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا۔ یہ بات ہر شخص پر واضح ہے کہ جدید مغربی اقوام ایک مکمل اور جامع انسانی قانون دینے میں بڑی حد تک ناکام رہی ہیں۔ جس طرح اور جن حالات میں مغرب کے عالمی نظام کا آغاز ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ اگرچہ آغاز میں اس کا تعلق یورپ کی مسیحی دنیا سے تھا اور مسیحی عقائد اور اخلاق و نظریات کو اس کا ایک اہم ماخذ قرار دیا گیا تھا لیکن جلد ہی اس پر سیکولرزم نے غلبہ حاصل کر لیا۔ پھر خاصا عرصہ وہاں ایک قسم کی کش مکش جاری رہی، جو بہ یک وقت مسیحیت سے استناد اور مسیحیت سے انحراف کی وجہ سے شروع ہوئی۔ سیکولرزم کے غلبے نے اس کو نہ صرف مسیحی اخلاق سے مستغنی کر دیا، بل کہ بالآخر ہر قسم کی اخلاقی قدروں اور بندشوں سے آزاد کر دیا۔ نورمبرگ کے مقدمے سے لے کر خلیج کی جنگ کے دوران ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلوں تک بے شمار مواقع ایسے آئے جہاں دنیا نے صاف دیکھا کہ یہ نظام قانون عدل و انصاف اور اخلاق سے اتنا ہی تعلق رکھتا ہے، جتنا جنگلی جانور۔ یہاں طاقت ہی کا اصول فیصلہ کن تسلیم کیا جاتا ہے اور زور آور ہی کو تمام حقوق اور مراعات حاصل ہیں۔ کوئی یہ بات تسلیم کرے یا نہ کرے واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ سیکولرزم کا لازمی تقاضا اور منطقی نتیجہ ہے۔ جن اقوام کے ہاں نسلی برتری اور لسانی بالادستی کا تصور موجود ہے، وہاں سیکولرزم کا لازمی نتیجہ ایک غیر اخلاقی جبر کی صورت میں نکلتا ہے۔ بھارت، اسرائیل، نازی جرمنی اس کی واضح اور کھلی اور دوسرے بہت سے مغربی ممالک میں مشرقی اقوام کے ساتھ رویہ اس کی چھپی مثالیں ہیں۔

پھر یہ نظام انسانیت کی وحدت اور انسان کو جوڑنے کے تصور پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی اساس انسانوں کو بانٹنے اور تقسیم کرنے پر ہے۔ یہ تقسیمیں جغرافیائی، لسانی، نسلی اور

Marfat.com

لونی سب طرح کی ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ جس کا دور جدید کا مغرب اور اس کے مشرقی تلامذہ اور مستفیدین بڑا فخریہ تذکرہ کرتے رہتے ہیں، اور جس کو قانون بین الاقوام کی اہم ترین کامیابی کا مظہر قرار دیتے ہیں، اس تقسیم وافتراق کا ایک بڑی اور بری مثال ہے۔ اس کا سب سے طاقت ور اور با اثر شعبہ سلامتی کونسل ہو یا اس کے اثر سے قائم ہونے والے دوسرے خودمختار ادارے مثلاً عالمی بنک، ان سب میں نمائندگی اسی تقسیم انسانیت کے اصول پر دی جاتی ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر سلامتی کونسل میں پانچ مستقل ارکان کے وجود اور ان کے حق استرداد کی کیا اخلاقی بنیاد ہے؟ ان پانچ ارکان کو بے پناہ عسکری طاقت اور سیاسی اثر ورسوخ کے علاوہ دوسری اقوام پر کیا فضیلت حاصل ہے؟ غالباً دنیا کے کسی قانون، نظام یا مذہب میں کسی طاقت ور کی طاقت کو بغیر کسی اخلاقی یا قانونی بنیاد کے یوں کھلے طور پر تسلیم نہ کیا گیا ہوگا۔ پرانے لوگوں میں شاید حیا کا مادہ زیادہ رہا ہوگا۔

آج تیسری دنیا کے ممالک میں ادارہ اقوام متحدہ سے جو بے زاری اور مایوسی پھیل رہی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا یہی نسلی پرستانہ، لسانیت پرستانہ اور رنگ پرستانہ کردار ہے۔ آپ ان ممالک میں جو نسبتاً اور مقابلتاً خودمختار ہیں (جن میں بدقسمتی سے دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ شامل نہیں ہے) یہ آوازیں اور مطالبات بلند ہو رہے ہیں کہ فلاں فلاں ممالک کو بھی سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنایا جائے۔ گویا ایک ناانصافی کا سدباب کرنے کے لئے دوسری ناانصافیوں کے مطالبے کئے جا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر تم ہمیں بھی ناانصافیوں اور طاقت کے غرور میں مبتلا لوگوں کے اس کلب میں شامل کرلو اور ہم سے مل کر ناانصافی کرنے کے لئے تیار رہو تو ہم تمہاری اس ناانصافی کے خلاف مزید آواز نہ اٹھائیں گے۔ آج عراق، ایران اور لیبیا کے خلاف یہ ادارہ جس طرح بین الاقوامی دہشت گردی کا ذریعہ بنا ہوا ہے، اس نے اس ادارے کے بارے میں بچی کھچی توقعات بھی ختم کر کے رکھ دی ہیں۔

جو کیفیت آج ادارہ اقوام متحدہ کی ہوگئی ہے، بعینہٖ یہی کیفیت آج سے ساٹھ ستر سال قبل انجمن اقوام کی تھی۔ علامہ اقبال نے جب اس کو کفن چوروں کی انجمن قرار دیا تھا، جس کا مقصد محض قبروں اور قبرستانوں کی تقسیم تھا تو انہوں نے کوئی مبالغہ نہ کیا تھا۔ جو

Marfat.com

حشر آج سے نصف صدی قبل انجمن اقوام کا ہوا تھا۔ آخر ویسا ہی حشر ادارہ اقوام متحدہ کا ہونے میں کیا چیز مانع ہے۔ جن اسباب کی وجہ سے انجمن اقوام کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا وہ تمام اسباب پہلے سے کہیں زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ ادارہ اقوام متحدہ میں موجود ہیں۔ ذرا ان اسباب کا سرسری جائزہ تو لیجئے:

۱۔ انجمن اقوام کا قیام پہلی جنگ عظیم کے فاتحین کے مفادات کے تکمیل اور مال غنیمت کا بٹوارہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ ادارہ اقوام متحدہ کا قیام دوسری جنگ عظیم کے فاتحین کے ہاتھوں ٹھیک ان ہی اغراض کے لئے ہوا۔

۲۔ دونوں جنگوں کے مفتوحین کے ساتھ برابر کا سلوک دونوں اداروں نے نہ کیا۔ وہاں بھی مفتوحین (ترکی، جرمنی) کے حصہ بخرے کر کے فیصلوں پر انجمن کا ٹھپا لگوایا گیا۔ یہاں بھی مفتوحین (جرمنی، جاپان) کو مستقل غلام رکھنے کے فیصلوں پر اقوام متحدہ کی مہریں لگوائی گئیں۔

۳۔ وہاں بھی مفتوحین کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہنے والا نہ تھا، یہاں بھی مفتوحین کے حق میں آواز اٹھانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

۴۔ وہاں بھی مفتوحہ علاقے فاتحین میں تقسیم ہوئے اور یہاں بھی۔

۵۔ وہاں بھی بڑی بڑی بین الاقوامی ناانصافیوں کی تکمیل کے لئے انجمن اقوام کو ذریعہ بنایا گیا اور یہاں بھی مسلسل بنایا جا رہا ہے۔

۶۔ وہاں بھی دستور غیر لچک دار اور نظام ناقابل تبدیلی تھا، یہاں بھی دستور غیر لچک دار اور نظام ناقابل تبدیلی ہے۔ تمام بالادست طاقتوں کی رضامندی کے بغیر وہاں پتہ ہل سکتا تھا اور نہ یہاں ہل سکتا ہے۔

۷۔ وہاں بھی سربرآوردہ ارکان کے مفاد کو ہی بالادستی حاصل تھی، یہاں بھی مستقل ارکان کے مفاد کو بالادستی حاصل ہے، اور اب تو یک طاقتی (یونی پولر) دنیا ہے جہاں ایک ہی طاقت کا سکہ چلتا ہے اور اسی کے مفاد کی تکمیل کا ہر جگہ سامان ہے۔

۸۔ وہاں بھی کم زور اور بے وسیلہ ارکان کے مفادات کی قربانیاں تھیں اور یہاں بھی۔ وہاں بھی بٹوارے کا نشانہ بننے والے مشرق وسطی اور دنیائے اسلام کے

Marfat.com

ممالک تھے اور یہاں بھی۔ ان تمام اسباب وعوامل کی تفصیلی مثالیں دی جائیں تو گفت گو طویل ہو جائے گی، بہ ہر حال حقیقت صرف اس قدر ہے کہ مغربی نظام کے مزاج اور ساخت میں مغرب کی بالادستی، طاقت کی پرستش اور مسلمانوں کی تذلیل وتوہین کے عناصر شامل ہیں۔ اس نظام کے تحت جو ادارہ بھی بنے گا وہ کبھی بھی کسی کم زور مسلمان ملک کو طاقت ور غیر مسلم (بالخصوص مغربی) ملک کے مقابلے میں انصاف فراہم نہیں کر سکے گا۔ یہ ادارے صرف مسیحی مغرب کے مفادات کی تکمیل کے لئے وجود میں لائے جاتے ہیں۔ وہاں یہ ضرورت ہے کہ مغربی بہ مقابلہ غیر مغرب (West Versus the Rest) جب بھی کسی متفقہ موقف کی ضرورت پیش آئے تو اس کام کے لئے کوئی ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہئے جو بہ ظاہر معتبر ہو اور جس کے نام کی دہائی دے کر عملی اقدام کئے جائیں۔ صدیوں یہ کام پوپ کا ادارہ کرتا رہا۔ پوپ کے نام پر مغرب کو متحد کر کے غیر مغرب (ان دنوں کی دنیائے اسلام) کے خلاف کھڑا کیا جاتا رہا۔ جب سیکولرزم کے نتیجے میں پوپ کی یہ حیثیت باقی نہ رہی تو ۱۸۱۵ میں مقدس اتحاد (Holy Alliance) وجود میں آیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انجمن اقوام وجود میں آئی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد میں ادارہ اقوام متحدہ وجود میں لایا گیا۔ اب معاشیات اور تجارتی وصنعتی بالادستی کا دور ہے۔ اب یہی کام ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور ایسے ہی دوسرے اداروں سے لیا جائے گا۔

لیکن اگر انسان تجربہ سے سیکھتا ہے، اگر وہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کی نقشہ کشی کرتا ہے، اگر وہ بیتے دنوں کے واقعات سے آنے والے دنوں کے لئے سبق حاصل کرتا ہے تو ہمیں اپنے مسائل ومشکلات کے سلسلے میں مغرب کے عالمی نظام اور اس کی کوکھ سے وجود میں آنے والے اداروں کے طرز عمل اور رویہ پر غور کرنا چاہئے۔ ایسے مسائل درجنوں اور ایسی مشکلات سیکڑوں ہیں، جو مسلمانوں کو درپیش ہیں اور جن میں اقوام متحدہ کے اصول وضوابط اور ان کے اعلان کردہ تصورات میں سے کسی ایک پر بھی مسلمانوں کے حق میں عمل درآمد نہیں ہوتا، اور مسلمانوں کے مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے خلاف اس ادارے کے تحت اور اس کے قوانین کی دہائیاں دے کر

Marfat.com

محاذ آرائی کی جاتی ہے۔ لیبیا اور عراق کا مسئلہ آپ کے سامنے ہے، حتیٰ کہ کشمیر کے معاملے میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے والا ہے سب وہ آپ کے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ صومالیہ میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہوا وہ دنیا نے دیکھا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان سب مثالوں میں جو بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی مسلم اکثریتی علاقے میں وہ عدل وانصاف نہیں ہوا ہے جس کا مغربی قانون علم بردار ہے اور وہاں کے لوگوں کو وہ حقوق نہیں ملے جو وہاں کے لوگوں کو خود اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ملنے چاہئیں تھے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو وہ حالات کی رحم وکرم پر اپنے آپ کو چھوڑ دیں اور کاروان عالم جہاں لے جا کر انہیں ڈال دے یا جس کنوئیں میں پھینک دے اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرلیں۔ یا پھر جو کچھ وسائل ان کے پاس ہیں ان کو مجتمع کر کے اپنی موجودہ سیاسی ساکھ پر غور کریں اور اپنی خود مختاری کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے تہذیبی تقاضوں اور نظام حیات کے مطابق مستقبل کا کوئی باعزت راستہ متعین کریں۔ اگر دیکھا جائے تو اس دوسرے راستے کے سوا مسلم دنیا کے لئے کوئی راستہ ہے بھی نہیں۔ جن کم زور اور پست حوصلہ قائدین نے پہلا راستہ اپنایا، ان کا انجام اور ان کے ممالک کا حشر بھی آج ہمارے سامنے ہے۔ وہ ستر ستر سال بلا چون و چرا مغرب کی پیروی کرنے کے باوجود عزت نفس اور وقار ملی کے لحاظ سے آج بھی وہیں ہیں جہاں ستر سال قبل تھے۔

اس دوسرے راستے کو اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیائے اسلام اپنے تشخص ملی کو بہ حال کرنے کا شعوری اور اجتماعی فیصلہ کرے اور تمام قوتیں جو دنیائے اسلام میں موجود ہیں اس ایک نقطے پر اکٹھے ہونے کی مخلصانہ اور سنجیدہ کوشش کریں، دنیائے اسلام کے عزائم اور خواہشات کی تکمیل ان کے سیاسی اقتصادی، و اخلاقی کلچر کی روشنی میں ہو۔ لیکن اسلامی روایات کا احیا دور جدید کے تناظر میں ایک گہری اجتہادی بصیرت کا متقاضی ہے۔ جب تک مغرب کے بارے میں ناقدانہ بصیرت اور احکام اسلام کے بارے میں اجتہادی قوت موجود نہ ہو یہ کام ممکن نہیں۔

Marfat.com

دور جدید میں اسلام کا عالمی نظام کس طرح مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرسکتا ہے اس بارے میں چند اہم پہلوؤں پر یہاں گفت گو کرنا مقصود ہے، جن سے خطوط پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ جدید دور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سفارت اور ڈپلومیسی کے ذریعے بڑا کام لیا جاتا ہے۔ یہ دور بین الاقوامی روابط کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی بہت سی قوموں نے میدان جنگ میں ہاری ہوئی بازی سفارت کاری کی میز پر جیت لی، اور کتنوں نے تلوار سے جیتی ہوئی جنگ سفارت کاری کے کارزار میں ہاری دی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی روایات، تاریخ اور شریعت میں اس سلسلے میں کوئی رہ نمائی ملتی ہے اور اگر ملتی ہے تو کیا؟ کہا جاتا ہے کہ تجارت کو بین الاقوامی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور جو اقوام تجارت کے میدان میں دوسروں سے آگے ہیں ان کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں جرمنی اور جاپان کی مثالیں سب کے سامنے ہیں کہ ان کی تجارتی مہارت اور پیش قدمی کے سامنے امریکہ کو تجارتی پسپائی اختیار کرنا پڑ رہی ہے، باوجود اس کہ امریکا ایک بہت بڑی عسکری قوت بھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت اور مالیات کو موجودہ دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

اسلام نے ابتدا سے ہی اس اہم بین الاقوامی عنصر کی اہمیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ قرآن مجید اور سنت و سیرت رسول علیہ السلام میں ایسے احکام اور واقعات موجود ہیں جنہوں نے تجارت کی بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر اور مسلمانوں کے بین الاقوامی مفادات کے لئے اس کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے پر زور دیا ہے۔

قرآن پاک نے ایلاف کا ذکر کیا ہے(۱) اور تجارت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت اور امن وسکون کو اللہ تعالیٰ کی ایک بیش بہا نعمت قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام بین الاقوامی شہرت کے حامل تاجر تھے۔ انہوں نے اپنے اس اہم کاروباری مقام اور تجارتی حیثیت کو اسلامی دعوت کی خاطر استعمال کیا۔ خود حبشہ کی ہجرت اس کی بہترین مثال ہے، جس میں دیگر متعدد مصالح کے علاوہ

۱۔ القریش

Marfat.com

ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ دشمن پر ایک اقتصادی دباؤ ڈالا جائے اور اس کے تجارتی کارواں کو روکا جائے، تاکہ اس کے معاشی مفادات پر ضرب پڑے اور وہ دباؤ محسوس کرے۔

پھر رسول اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اسلامی ریاست کی سرحدوں کو محفوظ بنانے اور دعوت اسلامی کی پر امن توسیع کے کام کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کئے، ان میں یہ کوشش بھی تھی کہ قریش مکہ کا تجارتی مقاطعہ کیا جائے اور ان پر تجارتی اور معاشی پہلوؤں سے ایسا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ ایک مشہور صحابی ثمامہ بن اثال جن کا تعلق یمامہ سے ہے وہ اسلام قبول کرتے ہیں اور اپنی حکومت کو اطلاع دیتے ہیں کہ وہ قریش کے قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے علاقے میں روک دیں اور قریش کو وہاں کی تجارت سے محروم کر دیں۔ اس اقدام نے قریش مکہ کی نیندیں حرام کر دیں اور ان کو معلوم ہو گیا کہ اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ جب ان کو اس کا احساس ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید پابندی جاری رکھنا پسند نہ فرمایا اور آپ کی مداخلت پر یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ اس سے قریش کو واضح طور پر یہ اندازہ ہو گیا کہ اب مسلمانوں کے پاس اتنی بین الاقوامی ساکھ اور تجارتی قوت موجود ہے کہ وہ جب چاہیں قریش کی تجارت کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یہ وہ اقدامات تھے جن کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کے مفاد اور تبلیغ اسلام کے لئے تجارت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

آج اگر دنیائے اسلام اپنی تجارت اور معاشی سرگرمیوں کو اس طرح مربوط کر لے کہ اس سے عمومی طور پر امت اسلامیہ کا مفاد پورا ہو تو وہ بہت آسانی کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ تیسری دنیا کی دولت مند ترین ممالک کی فہرست میں صف اول میں مسلم ممالک شامل ہیں۔ اس کے باوجود تیسری دنیا کے ممالک میں سے اقتصادی مسائل کا شکار بھی مسلم ممالک ہی ہیں۔ تیسری دنیا کے کئی ایک پلیٹ فارم ایسے ہیں جن کی قیادت اور کنٹرول مسلمانوں کے پاس ہے۔ اوپیک کا ادارہ اگرچہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکا ہے لیکن اس کی وجہ سے مسلمان قائدین کی اپنی کم زوری اور مسلمانوں کی نا اہلی ہے۔

Marfat.com

ایک زمانہ تھا کہ ستر اور اسی کے عشروں میں اوپیک کے ادارے کی بڑی اہمیت تھی، اور بعض پہلوؤں سے یہ تنظیم اقوام متحدہ کے ادارے سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہوگئی تھی۔ مسلمان مل کر کوشش کریں تو یہ حیثیت خاصی حد تک دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

مشرق بعید جس میں متعدد ممالک بڑی بین الاقوامی اہمیت کے حامل ہیں وہاں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی پائی جاتی ہے۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا اس علاقے کے مسلمانوں کا مرکز ثقل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حالات میں کوئی بڑا نشیب و فراز نہ آیا تو اس صدی کے آخر تک انڈونیشیا اور ملائیشیا پر مشتمل ایک ایسی اقتصادی قوت معرض وجود میں آجائے گی کہ جس کے وسائل کسی بھی لحاظ سے مشرق بعید کے ترقی یافتہ ممالک جاپان اور کوریا وغیرہ ممالک سے کم نہیں ہوں گے۔ یہ مسلمانوں کے پاس ایک ایسا طاقت ور مرکز یا لیور ہے جس کو موثر طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وسط ایشیا کی ساری نوآزاد مسلم مملکتیں اتنے غیر معمولی وسائل سے مالا مال ہیں کہ ان سے پوری دنیا کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ یہ پورے وسائل اور یہ ساری قوت اگر امت کے اجتماعی مفاد کے لئے استعمال ہو تو نہ صرف مفلوک الحال مسلم ممالک اقتصادی طور پر سنبھل جائیں گے، بل کہ مسلم ممالک عالمی سطح پر زیادہ مثبت انداز میں اپنا تحفظ کر سکیں گے۔

ممکن ہے کہ کہنے والے یہ کہیں کہ تجارت تو ایک خالص کاروباری اور مادی معاملہ ہے، اس سے کیوں کر امت اور اسلامی دعوت کے مفادات کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ ماضی کی بات تو ماضی میں رہی۔ ماضی میں مسلمانوں نے تجارت کے ذریعے دعوت کو فروغ دیا۔ انڈونیشیا، ملائشیا، برونائی اور منڈاناؤ میں مسلمانوں کا وجود اس وسیلے کی کامیابی کی زندہ مثال ہے۔ ممکن ہے آج کے مغرب زدہ اور لادینیت گزیدہ ذہن کے لئے تجارت کو مذہب سے وابستہ کرنا مضحکہ خیز معلوم ہو، لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ یورپ کے سیاسی غلبے کو پوری دنیا میں عیسائی تجارتی اور مالیاتی کمپنیوں نے ہی پھیلایا تھا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مثال ہم سب کے سامنے ہے، مغربی استعمار ہمارے ملک میں تاجروں ہی کے جلو بل کہ پردے میں آیا تھا۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دنیائے اسلام کو تجارت

Marfat.com

اور کاروبار ہی کے نام سے محکوم بنایا گیا تھا۔

چلئے مسلمانوں کی مثالیں شاید دور جدید کے سیکولر ذہن پر گراں گزریں۔ خود شمالی امریکا کی مثال لے لیں، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو دیکھ لیں۔ تجارت کے نام پر وہاں قدم جمائے گئے اور پھر ایک ایک کر کے وہاں کی قدیم آبادیوں کو صاف کر دیا گیا۔ موجودہ دور میں بھی مغربیت کا فروغ تجارت کے نام اور ذریعے سے ہو رہا ہے۔ آج تجارت کے نام سے جو قرضے دیے جا رہے ہیں اور جن شرائط پر دیئے جا رہے ہیں ان سب کا مقصد مغربیت کا تحفظ اور دنیائے اسلام پر اہل مغرب کے سیاسی اور اقتصادی غلبے ہی کے تسلسل کو یقینی بنانا ہے۔ یہ غلبہ خالص عسکری سیاسی نہ سہی اقتصادی یا تہذیبی ہی سہی، لیکن ہدف اس کا بھی اقتصادی ہی تھا اور ہے۔ آج مغرب کا سیاسی نظام اور سیکولرزم دونوں بڑے بڑے شور سے دنیائے اسلام میں متعارف کرائے جا رہے ہیں۔ مغرب کی ساری سیاسی، عسکری اور اقتصادی قوت اس مقصد کے لئے استعمال ہو رہی ہے کہ دنیائے اسلام کو لادینی جمہوریت، سوشل ڈیموکریسی اور مغربی تہذیب و ثقافت سے مانوس کیا جائے۔ ان سب کاوشوں کے پیچھے جو قوت کارفرما ہے وہ صرف تجارت کی قوت ہے۔ دنیائے اسلام کو آزاد تجارت اور معاشی مفادات کے نام پر ان سب چیزوں کو اپنانے پر اسی طرح مجبور کیا جا رہا ہے، جس طرح دو سو سال قبل ان ہی تحریصات کے ذریعے مغربی استعمار کو قبول کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ ان میں ہر ہر چیز کے حق میں مسلمان شکست تسلیم کر چکے ہیں اور یہ شکست صرف اور صرف تجارت کے نام پر دی گئی ہے۔ آج دنیائے اسلام کو چاہئے کہ وہ اپنی تیرہ سو سالہ قدیم روایت کو زندہ کرے، جس میں تجارت کے ذریعے اکناف عالم میں اسلام پھیلایا گیا۔ آج بھی وہاں مسلم آبادیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کا وجود ماضی کے مسلم تاجروں کا مرہون منت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آج مغرب کے بین الاقوامی قانون کا سب سے بڑا ماخذ و مصدر بین الاقوامی معاہدات ہیں، یہی عالمی معاہدات سیاست کا، اقتصادات کا، اور نظام عالم کا سب سے بڑا منبع و ماخذ ہیں۔ اگر ہم ان عالمی معاہدات کا جائزہ لیں تو ہمیں ایسا ایک بھی

Marfat.com

معاہدہ نہیں ملے گا جس میں مسلم مفادات کا تحفظ کیا گیا ہو یا جن کے ذریعے یوں ہی کسی مسلم مفاد کا (کسی بڑی طاقت کے مقابلے میں) تحفظ ہو جاتا ہو، ہماری اپنی کم زوری، پستی اور بے بسی کا حال یہ ہے کہ ہم خود اپنے وسائل کے ذریعے ان مسائل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جو ان معاہدات کے نتیجے میں ہمارے لئے پیدا ہو گئے ہیں۔

خود قیام پاکستان کو دیکھ لیجئے کہ کس طرح ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ تقسیم ہند کے طے شدہ اصولوں کو ترک کر کے ایسی تقسیم کو مان لیں جو نہ صرف تقسیم کے طے شدہ اصولوں کے خلاف ہے، بل کہ جس سے نئی مملکت اسلامیہ مستقل طور پر مسائل کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اس بدعہدی اور دھوکے پر مشتمل جبری معاہدے کے نتائج آج ہم سب کے سامنے ہیں۔ حیدر آباد کو تو لوگوں نے بھلا دیا۔ جونا گڑھ اور مناداور کو بھی فراموش کر دیا۔ کشمیر کی زندہ مثال آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ لوزان اور سیورے کے معاہدے اب ضرب المثل بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ چند مثالیں ہیں جن سے بین الاقوامی معاہدہ جات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام میں دیکھئے کہ اس نے معاہدات کے کچھ اصول بیان فرمائے، چاہے وہ معاہدہ کسی دشمن ہی سے کیا جا رہا ہو۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ معاہدہ طے شدہ شرعی اصولوں سے ہٹ کر نہ ہو۔ ہر وہ شرط جس کی گنجائش کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں نہ ہو کالعدم ہے۔ اسی طرح ہر وہ شرط جس سے مسلمانوں کا مفاد مجروح ہوتا ہو اس سے حتی الامکان احتراز کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ مذاکرات کے دوران عدل کے اصول کو اپنائیں اور کفار کے بارے میں بھی وہ طرز عمل اختیار کریں جو خود وہ اپنے بارے میں پسند کرتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج مسلمان کم زور ہیں اور وہ طاقت ور غیر مسلم دنیا کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات ہم سب سمجھ سکتے ہیں کہ اصولوں پر مبنی مضبوط موقف کو مسترد کر دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مضبوط اور مدلل موقف بہت سے ایسے مسائل سے نجات دلا دیتا ہے، جو کم زوری دکھانے کے

Marfat.com

نتیجے میں پیش آ سکتے ہیں۔ ایک مدلل اور مضبوط موقف کے ذریعے بڑی سے بڑی طاقت کو بھی نیچا دکھایا جا سکتا ہے، بہ شرطے کہ قیادت مخلص، باکردار، باشعور اور صاحب عزیمت ہو۔ ہمارے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ مضبوط موقف اپنا کر ایک کم زور ملک نے طاقت ور دشمن کو جھکا دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بڑی سے بڑی طاقت کو بھی قوت استعمال کرنے سے پہلے اس کی اثرات اور نتائج و عواقب کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

پھر آج کے رائج الوقت اور کارفرما معاہدات کا پس منظر دیکھیں تو ہمیں ایک بھی معاہدہ ایسا نہ ملے گا کہ جس پر مکمل طور پر عمل درآمد ہوا ہو۔ جب طاقت ور فریق سمجھتا ہے کہ اس معاہدے پر عمل درآمد اس کے مفاد میں ہے تب تو وہ اس پر عمل کرتا ہے، اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس معاہدے پر عمل درآمد اس کے مفاد میں نہیں ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔ قرآن نے اس کی اجازت نہیں دی کہ معاہدہ تو کر لیا جائے لیکن اس پر عمل درآمد کو وقتی مفاد سے مشروط کیا جائے۔ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا کہ ایک مرتبہ معاہدہ کر تو لیا جائے لیکن اس پر عمل درآمد کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا جائے۔ اسلام کا حکم تو یہ ہے کہ جب ایک بار معاہدہ کر لیا جائے تو پھر خلوصِ دل سے اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو اس معاہدے کے دوران کسی ایسے طرزِ عمل کی اجازت نہیں ہے جس کے نتیجے میں معاہدہ ختم ہوتے ہی فریق مخالف کو اس کے منفی اثرات کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ اسلامی صورت حال اگر مسلمان اپنی عددی قوت اور اقتصادی طاقت سے کام لے کر پیدا کر سکیں تو عالمی معاہدوں کو ایک صحیح سمت اور ایک نیا رخ مل سکتا ہے، جو عالمی سطح پر یقیناً زیادہ ثمر آور بھی ہو گا اور مثبت رجحانات کو بھی جنم دے گا۔

یہ وہ بنیادی روح ہے جو اگر آج بین الاقوامی معاہدات و معاملات میں اپنا لی جائے تو کم زور اقوام کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہ کام دنیائے اسلام کر سکتی ہے اور اس طرح ہم عالمی نظام کو ایک ایسی معنویت دے سکتے ہیں، جس سے بین الاقوامی تعلقات کو ایک نئی زندگی مل جائے گی۔

بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں مسلمانوں کے بارے میں ایک یہ بھی تاثر

Marfat.com

پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خول میں بند رہتے ہیں اور اگر وہ اس دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس خول سے باہر آنا چاہئے۔ مغربی مصنفین اور اخبار نویسوں کا یہی طرز عمل ہے، جس کا مشاہدہ آئے دن اچھی خاصی سنجیدہ تحریروں اور اخبارات و رسائل میں دیکھنے میں آتا ہے۔ حال آں کہ اسلام اس معاملے میں جتنا وسیع الظرف ہے اس کی مثال اہل مغرب کے ہاں نہیں ملتی۔ یہاں ایک یہ طے شدہ اصول ہے کہ جاہلیت کے دور میں جن اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا تھا زمانہ اسلام میں بھی ان پر عمل کیا جائے گا:

یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلية

مسند امام احمد کی روایت ہے۔ حلف الفضول کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر آج بھی مجھے کوئی دعوت دے تو اس جیسے کسی بھی معاہدے کے لیے تیار ہوں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جاہلی نظاموں کی اچھی باتوں کو بلا تامل اپنانے میں ہرگز تنگ نظر نہیں ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں گفت و شنید اور مذاکرات کا اصول ہر دور میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن مذاکرات میں عدل و توازن کا اصول صرف اسلام نے مدنظر رکھا ہے۔ پھر شریعت اسلامیہ کے جو مقاصد ہیں اور جن کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی تمام پالیسی بنتی ہے وہ انسان کے عقیدے و نظریے، جان و مال، عزت و آبرو اور مال و جائیداد کے تحفظ سے عبارت ہیں۔ یہ وہ مقاصد ہیں جو اسلام میں بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تعلقات کی اساس ہیں۔ ان میں اپنے اور پرائے کی تفریق نہیں ہے اور یہ عدم تفریق ہی بین الاقوامی تعلقات کی اصل بنیاد و اساس ہے، جس سے بڑھ کر کسی اساس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اصول و ضوابط سے ہٹ کر تفصیلی جزئیات کے سلسلے میں جو کچھ فقہائے اسلام نے بیان کیا ہے وہ سب کچھ اتنا منطقی، عقلی، قابل عمل اور ابدیت کا آئینہ دار ہے کہ مسلمان کم از کم امت مسلمہ اور دنیائے اسلام کی سطح تک ایک ایسا عالمی نظام ترتیب دے سکتے ہیں جو غیروں کے لیے بھی کشش کا باعث ہو سکتا ہے۔

اسلام کے اصول شہریت کی رو سے مسلمان جہاں بھی ہو وہ بالقوہ (Potentially) دارالاسلام کا شہری ہے۔ اور جب بھی وہ کسی اسلامی ریاست میں داخل ہو جائے گا تو

Marfat.com

اسے خود بہ خود شہریت حاصل ہو جائے گی، جیسے آج کل اسرائیل نامی ریاست کا اصول ہے کہ دنیا کا ہر یہودی وہاں کا بالقوہ شہری ہے، وہ خواہ کسی بھی ملک میں رہائش پذیر ہو اور جوں ہی وہ اسرائیل کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے وہاں کا شہری قرار پاتا ہے۔ یہی اصول اگر مسلمان ریاستیں اپنا لیں تو نہ صرف اس سے مسلم اقلیتوں کے بہت سے مسائل ختم ہو جائیں گے، بل کہ اس سے ایک ایسا تصور وحدت واخوت پیدا ہو جائے گا جو مسلمانوں کے کئی ایک مسائل کا آگے چل کر حل پیدا کر سکتا ہے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے اس مسلم نیشنلزم کے تصور کو قوت حاصل ہو گی جس کو سب سے زیادہ قوت اور وضاحت سے دور جدید میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا ہے۔ یہ تصور علامہ اقبالؒ نے ہی نہیں دور جدید کے بہت سے مفکرین اسلام نے پیش کیا ہے۔ یہ بات کہ ہر مسلمان دارالاسلام کا شہری ہے مسلمانوں میں شروع سے متفق علیہ چلی آ رہی ہے اور ہر مجتہد وفقیہ نے اس کو ایک طے شدہ اصول سمجھا ہے۔ فقہائے احناف میں سے امام ابو یوسف وامام محمد نے اس کو باقاعدہ فقہی کلئے یا اصول کی شکل دی ہے اور کہا ہے کہ کوئی مسلم جب بھی کسی اسلامی ریاست میں داخل ہو گا تو خود بہ خود اس کا شہری ہو جائے گا۔ امام محمد کے الفاظ ہیں:

المسلم من اهل دارالاسلام اینما یکون

مسلمان جہاں بھی ہو دارالاسلام کا باشندہ ہوتا ہے۔

سلمان رشدی، اور تسلیمہ نسرین کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے تصورات و مفادات کو نقصان پہنچانا مغرب کا آج بھی شیوہ ہے، خواہ بہ راہ راست یہ نقصان پہنچایا جائے یا بالواسطہ۔ یہ دو نام میں نے اس لئے ذکر کئے ہیں کہ یہ آج ضرب المثل بن گئے ہیں اور جو تو میں اسلامی ممالک میں یورپی تصورات زندگی پیام بر اور داعی ہیں یہ دونوں نام ان کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں، جن کی پشت پر آج بھی مغرب کا ہاتھ ہے۔ ان دونوں کو مغربی ممالک نے جس طرح دست و بازو کھول کر دل و جان سے پناہ دی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر منحرف اسلام بالقوہ مغرب کا اسی طرح شہری ہے جس طرح مسلمان دارالاسلام کا۔

Marfat.com

آج کا دور سفارت اور ڈپلومیسی کا دور ہے، اس سلسلے میں اسلام نے کیا ہدایات دی ہیں؟ یہ کہا جاتا ہے کہ بڑی مملکت کے سفیر کا درجہ بڑا ہوتا ہے اور چھوٹی مملکت کے سفیر کا درجہ چھوٹا ہوتا ہے۔ یقیناً آج کے دور میں ایسا ہی ہوتا ہوگا، لیکن ایک مسلم فقیہہ نے یہ تصور آج سے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا:

کل رسول علیٰ مقدارہ و مقدار مرسلہ

ہر ایلچی کی حیثیت کا تعین اس کی اپنی اور اس کو بھیجنے والے کی حیثیت کو دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر سفیر اپنی حکومت و مملکت کا سفیر ہوتا ہے اور اس کی حیثیت کا تعین اس کی حکومت کے حوالے سے ہی کیا جائے گا۔ یعنی سفیر کو ویسی ہی مراعات اور پذیرائی حاصل ہوگی جس کی مستحق وہ ریاست ہے جہاں سے وہ آیا ہے۔

آج کل سیاسی مذاکرات اور گفت و شنید کے ذریعے بین الاقوامی اختلاف کو دور کرنے پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور جنگ وجدل سے بچتے ہوئے بات چیت کے ذریعے صلح و صفائی کا بڑا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ عملاً کیا ہوتا آیا ہے یہ دنیا روز دیکھتی ہے۔ قرآن مجید اس وقت دنیا کی واحد آسمانی کتاب ہے جس میں گھریلو معاملات سے لے کر بین الاقوامی اختلافات تک سب کو صلح کے ذریعے حل کرنے کی بار بار ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن پاک میں:

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (۱)

اور صلح و مصالحت بہترین حل ہے۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (۲)

لڑنے والے فریقین کے مابین صلح کرادو۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (۳)

۱۔ النساء: ۱۲۸

۲۔ الحجرات: ۹

۳۔ الحجرات: ۱۰

Marfat.com

اپنی بھائیوں میں صلح کراؤ۔

اور اس جیسی ہدایات بار بار آئی ہیں جن سے کتاب الٰہی میں مصالحت کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں بھی قرآن پاک نے جنگ کو آخری چارہ کار کے طور پر قبول کیا ہے اور صلح کو ہر حال میں اختیار کیا ہے۔ اسی کا اظہار سیرت کے واقعات سے بھی ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی معرکہ (معاقبانہ مہمات کو چھوڑ کر) ایسا ہوا ہو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے قبل مصالحت اور پر امن گفت وشنید سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس کی نمایاں مثال وہ سیکڑوں معاہدے ہیں جو حضور علیہ السلام نے عرب کے قبائل اور آس پاس کی ریاستوں سے کیے، جن کے نتیجے میں گفت وشنید کے ذریعے پر امن تعلقات وجود میں آ گئے۔ یہ تمام معاہدات کامیاب سفارتی مذاکرات اور گفت وشنید کی درخشاں مثالیں ہیں۔

اسی طرز عمل کو بعد کے حکمرانوں نے بھی قائم رکھنے کی کوشش کی۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے معاصر حکمرانوں سے ذاتی تعلقات اور ہدایا کا تبادلہ معروف واقعات ہیں۔ بعد میں منصور اور ہارون رشید نے اس پالیسی کو بہت ترقی دی۔ ہارون نے فرانس کے شارلماں سے دوستانہ تفاہم پیدا کیا، اور ایک طویل کش مکش کو دوستی میں بدل لیا۔

بین الاقوامی اختلاف کو حل کرنے کا ایک معروف طریقہ تحکیم اور ثالثی بھی ہے۔ یہ طریقہ دنیا میں قدیم سے جاری ہے، لیکن عموماً کم زور اور زیر دست فریق ہی تحکیم اور ثالثی کا راستہ اختیار کرتا ہے، زور آور اور زبردست فریق نے شاذ و نادر ہی یہ راستہ اپنایا ہوگا۔ عرب میں بھی تحکیم اور ثالثی کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل حاصل تھی اور قبل از اسلام سے ہی یہ ادارہ عرب میں مشہور ومعروف تھا۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ثالثی اور تحکیم کا ذکر آیا ہے اور گھریلو معاملات سے لے کر عدالتی امور تک تحکیم کی ہدایت کی گئی ہے۔ دور نبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تحکیم کے طریقہ کار کو اپنانے کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور تحکیم بنی قریظہ کے معاملے میں ہوئی تھی جب خود یہودیوں کی اپنی پسند سے حضرت سعد بن معاذ کو حکم بنایا گیا تھا۔ حضرت سعید بن معاذؓ کے فیصلے کو دونوں فریقوں یعنی بنی

Marfat.com

قریظہ اور مسلمانان مدینہ نے فیصلہ دیے جانے سے قبل ہی قبول کر لینے اور نافذ کرنے کی ہامی بھر لی تھی۔ پھر جب انہوں نے بہ طور حکم فیصلہ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پسندیدگی اور منظوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ فیصلہ ساتوں آسمانوں کے اوپر سے ہوا ہے۔ یہ اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ یہ فیصلہ تورات کے احکام کے عین مطابق دیا گیا ہے، جس پر یہودی اعتراض نہیں کر سکیں گے۔

پرامن بقائے باہمی آج کے بین الاقوامی تعلقات کا ایک بہت اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ پرامن بقائے باہمی کو کسی باضابطہ قانون کے دائرے میں لا کر منظم و منضبط کرنا اور بھی زیادہ نازک اور اہم ہے۔ پھر اس ضابطے پر کاربند رہنا ان دونوں سے زیادہ نزاکت اور اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام نے یہ تینوں مرحلے پہلے ہی دن طے کر لئے۔

پُرامن بقائے باہمی اور مشترکہ اصولوں پر اتفاق کرنے کی دعوت قرآن نے چودہ، پندرہ سو سال قبل ہی دے دی تھی۔ اس نے اہلِ کتاب کو (جو علم الٰہی میں سیکڑوں سال تک دنیا میں فعال اور موثر کردار ادا کرنے والے تھے) ایک کلمہ سواء (۱) پر جمع ہونے کی دعوت دی تھی جس کا جواب اب تک اہلِ کتاب کے ذمے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہم عصر قریبی کتابی حکم رانوں اور اقوام سے پُرامن بقائے باہمی کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ مدینے کے یہودیوں سے تحریری معاہدے ہوئے۔ فریقین کے حقوق اور ذمے داریوں کا تعین ہوا، لیکن یہودیوں نے ایک ایک کر کے معاہدوں کو توڑا۔ آپ ﷺ نے نجران، حبشہ اور حدود شام کے متعدد عیسائی رؤسا سے مفاہمے اور معاہدے کیے۔ ان سب میں حبشہ سے ہونے والا مفاہمہ صدیوں قائم رہا، گویا بین الاقوامی سطح پر پُرامن بقائے باہمی اور دوستانہ روابط کا حبشہ ماڈل کامیاب ترین ماڈل تھا، جو ایک ہزار برس سے بھی زیادہ قائم رہا۔

۱۔ ملاحظہ کیجئے: آل عمران: ۶۴

Marfat.com

نئے عالمی نظام کی تشکیل

اور

امت مسلمہ کی ذمے داریاں

تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

قومی سیرت کانفرنس۔ اسلام آباد

۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء

Marfat.com

نئے عالمی نظام کی تشکیل

اور

امت مسلمہ کی ذمے داریاں

تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

علمائے کرام

مہمانان گرامی

خواتین وحضرات

اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی جس نئے عالمی نظام کی تشکیل کا غلغلہ بلند ہورہا تھا وہ اب اپنی واضح شکل میں دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ امت مسلمہ سے برسرپیکار ہے۔ یہ نیا عالمی نظام، جو دراصل نیا نہیں، اپنے

Marfat.com

اندر وہ تمام عناصر رکھتا ہے جو ماضی کے استعماری عالمی نظاموں کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے وحی الٰہی کی رہنمائی سے ہٹ کر جب بھی کسی نظام نے عالمی نظام بننے کی کوشش کی، اور جب بھی کسی دنیوی طاقت کے سر میں یہ سودا سمایا کہ وہ اقوام عالم کے لئے کوئی از خود عالمی نظام وضع کرے تو اس کے نتیجے میں دنیا کو سوائے ظلم و جبر، ناانصافی اور استحصال کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ اقوام عالم کے وسائل کو اپنے تصرف میں لینا، زیردستوں کو غلام بنانا اور کسی مخصوص فرد، نسل یا گروہ کو انسانوں کی گردنوں پر مسلط کر دینا ان تمام عالمی نظاموں کا واحد مقصد رہا ہے۔

قرآن مجید میں ایک ایسے ہی خود ساختہ عالمی نظام کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے جو مصر کے فرعونوں نے قائم کیا تھا اس کے بنیادی عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نظام کے علم برداروں نے زمین میں اپنی بڑائی قائم کی:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ O (۱)

یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور باشندگان ملک کو ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کمزور کیا اور ان کی نسل کشی کی ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بے شک وہ مفسدوں میں سے تھا۔

یہ نظام جو اس وقت کے فرعون نے قائم کیا تھا اپنے اندر وہ تمام خصائص رکھتا ہے جو بعد میں سامنے آنے والے دوسرے نظاموں میں اپنائے گئے۔ لہٰذا قرآن مجید کی رو سے ہر وہ خود ساختہ عالمی نظام فرعونی نظام ہے جو یہ مقاصد رکھتا ہو۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی بالادست قوتوں نے جو عالمی نظام تشکیل دیا تھا اور جس کے ذریعے دنیائے مشرق پر کم و بیش ڈیڑھ سو سال حکومت کی گئی اب اپنی عمر پوری کر چکا

۱۔ القصص: ۴

Marfat.com

ہے۔ یہ عالم پیراب مردنی کیفیت میں ہے۔ اس کے بطن سے اب وہ جہانِ نو پیدا ہو رہا ہے جس کے لئے گزشتہ نصف صدی سے تیاریاں ہو رہی تھیں، وہ عالم پیراب مر رہا ہے جسے فرنگی مقامروں نے قمار خانہ بنا دیا تھا۔ پردۂ تہذیب میں وہی آدم کشی اور غارت گری اس نئے نظام میں بھی موجود ہے جو مرنے والے نظام کا واحد مقصد تھی۔ کم زور اقوام مشرق آج بھی اسی طرح بے بس ہیں جس طرح وہ سابقہ نظام کے تحت بے بس تھیں۔ وسائل عالم پر زبردستوں کی بالادستی آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح اس عالم پیر میں نظر آتی تھی۔

حکیم مشرق نے آج سے بہت پہلے جمعیت اقوام کو کفن چوروں کی انجمن قرار دیتے ہوئے اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ اگر طہران عالم مشرق کا جنیوا ہو جائے تو ممکن ہے کہ کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے اور ملوکیت افرنگ نے جو خواب دیکھا ہے ہوسکتا ہے کہ اس کی تعبیر بدل جائے، لیکن افسوس کہ دنیائے اسلام ایسا نہ کرسکی اور حالات اسی نہج پر چلے آ جا رہے ہیں، جس نہج پر مقامرین غرب ان کو چلانا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں امت مسلمہ کی ذمے داریاں چند در چند بڑھ جاتی ہیں۔

امت مسلمہ اپنی ساخت، اپنی تشکیل اور اپنے مقاصد و اہداف کے اعتبار سے ایک عالمی برادری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا کردار روز اول ہی سے ایک عالمی کردار قرار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اس امت کو ایک ایسی امت وسط قرار دیا گیا ہے جو ہر قسم کی انتہاؤں کے درمیان راہ اعتدال پر قائم ہے، جو نہ شرقیہ ہے اور نہ غربیہ، بل کہ یہ ایک ایسا نور سرمدی ہے جس کی ضیا پاشی سے پوری کائنات مستنیر ہے۔ یہ امت مسلمہ ہر قسم کے رنگ، نسل، لسانی اختلافات، جغرافیائی حوالوں سے اور ایسے تمام مادی امتیازات سے ماورا ہے جو انسانوں میں تقسیم وافتراق کا موجب رہے ہیں۔ امت مسلمہ انسانوں کی فلاح و بہبود، خدمت اور رہ نمائی کے لئے نکالی گئی ہے۔

أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۱)

اس کا کام یہ ہے کہ روئے زمین پر عدل و انصاف کی علم بردار ہو اور صرف اللہ

۱۔ آل عمران: ۱۱۰

Marfat.com

کی رضا کی خاطر عدل وانصاف کی گواہ بن کر اٹھے۔

كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (۱)

عدل وانصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودیٔ مولا کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ۔

اس ذمے داری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امت اپنے طرز عمل سے انسانیت کے سامنے اسلام کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کرے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو شہادت حق کی جامع اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر امت مسلمہ کا قول وفعل، طرز عمل، رویہ اور انفرادی اور اجتماعی اسلوب حیات ایسا ہونا چاہئے کہ اس کو دیکھ کر دنیا اسلام کے پیغام کو سمجھ سکے اور اس کے قریب آسکے۔

اسلام کا پیغام روز اول ہی سے ایک عالمی پیغام تھا۔ قرآن مجید کی دعوت اپنے آغاز سے ہی ایک عالمی دعوت تھی۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کا طرز عمل تاریخ اسلام کے ابتدائی لمحات سے ہی ایک بین الانسانی اپیل کا حامل تھا۔ قرآن مجید شاید دنیا کی واحد مذہبی کتاب ہے جو اپنے خطاب کا آغاز یا بنی آدم اور یا ایھا الناس جیسے الفاظ سے کرتی ہے۔ بہت سی دوسری مذہبی کتابوں کے برعکس اس کتاب نے خالق کائنات کا تعارف بھی کسی قوم، قبیلے یا نسل کے معبود کے طور پر نہیں بل کہ رب العالمین اور رب الناس کے طور پر کرایا ہے۔ خالق کائنات پوری کائنات اور عالم انسانیت کا فرماں روا ہے، وہ پوری انسانیت کا خالق ومالک اور معبود ہے، جس ذات گرامی ﷺ کے ذریعے قرآن مجید انسانوں تک پہنچایا گیا اس کا امتیازی وصف بھی رحمۃ للعالمین ہے۔ ان کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۲)

اے انسانو! میں تم سب کی طرف خالق کائنات کا ایلچی بن کر آیا ہوں۔

۱۔ النساء: ۱۳۵

۲۔ الاعراف: ۱۵۸

Marfat.com

یوں اسلام خود کو ایک عالمی نظام کے طور پر پیش کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس عالمی نظام کی بنیادیں رکھیں، اس کے بنیادی قواعد طے فرمائے، اس نظام کے تحت انسانوں کے حقوق و فرائض متعین کئے اور ایک ایسی نسل تیار فرمادی جس نے چار دانگ عالم میں اس نظام کے منصفانہ پیغام اور عادلانہ قوانین کی دھاک بٹھادی۔ جب تک یہ نظام دنیا کا بالا دست نظام رہا اقوام عالم کو عدل وانصاف اور مساوات کے وہ مناظر دکھاتا رہا جن کے دیکھنے کی آج نہ معلوم کتنی آنکھیں منتظر ہیں۔ یہ نظام قرآنی ہر استعماری اور استحصالی قوت کے خلاف ایک شمشیر براں کی حیثیت رکھتا ہے:

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندہ بے سازو برگ

اس نظام قرآنی اور نظام مصطفوی کی موجودگی میں نہ قیصریت پنپ سکتی ہے اور نہ کسرویت۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا اعلان فرماتے ہوئے یہ تاریخ ساز پیشین گوئی فرمادی تھی:

اذا ھلك كسرى فلا كسرى بعده و اذا ھلك قيصر فلا قيصر بعده (۱)

جب ایک بار کسریٰ ہلاک ہوگیا تو پھر اس کے بعد کوئی دوسرا کسریٰ نہیں ہوگا، اور جب ایک مرتبہ قیصر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہوگا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اس عالمی نظام کی دو اہم بنیادیں وحدت الہ اور وحدت آدم ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بار بار یہ اعلان کرایا گیا کہ ان کی نبوت ورسالت کا دائرہ نہ صرف پورے عالم انسانیت بل کہ جنات تک کو محیط ہے، وہیں بار بار یہ بات بھی واضح کی گئی کہ اس پوری کائنات کی ربوبیت اور خلق وامر صرف ایک ذات پاک کے ہاتھ میں

۱۔ مسند احمد: ج ۲، ص ۴۶۴، رقم ۱۴۴۷

Marfat.com

ہے جس کے روبرو پوری اولادآدم یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ اولاد آدم اور بنات حوا میں سے ہر ایک کا تعلق اس ذات پاک سے ہے صرف بندگی اور عبودیت کا ہے:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا O (۱)

آسمان وزمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔

وحدت آدم کے اصول کو جب ایک مرتبہ تسلیم کرلیا جائے تو مساوات آدم کا اصول خود بہ خود سامنے آجاتا ہے۔ دوسری بہت سی مذہبی کتابوں کے برعکس قرآن مجید میں انسانوں کی نسلی، لسانی یا علاقائی تقسیموں کا ہلکا سا بھی اشارا نہیں ملتا، قرآن مجید میں واضح ترین الفاظ میں اور احادیث مبارکہ میں نئے نئے انداز سے مساوات آدم کے اس تصور کو بیان فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید کا کون سا طالب علم ہے جس نے سورۃ حجرات کی یہ انقلاب آفرین آیات نہ پڑھی ہوں جن میں کہا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (۲)

اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم میں قومیں اور قبیلے اس لئے بنائے کہ تم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرسکو۔

لہٰذا قوموں، قبیلوں اور ملکوں کا وجود محض ایک وجہ تعارف اور حوالہ تشخص ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

مساوات آدم کا لازمی نتیجہ کرامت آدم ہے، انسان بہ طور انسان مکرم اور محترم ہے۔ وہ مکرم ومحترم ہی پیدا ہوتا ہے اور یہ استحقاق رکھتا ہے کہ زندگی بھر اس کے ساتھ تکریم اور احترام ہی کا معاملہ کیا جائے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے کرامت آدم کے تصور کو اتنی وضاحت،

۱۔ مریم: ۹۳

۲۔ الحجرات: ۱۳

Marfat.com

صراحت اور قطعیت کے ساتھ بیان نہیں کیا جس طرح قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (۱)

یقیناً ہم نے اولادِ آدم کو بڑی عزت دی۔

یہ نوید مکہ ہی میں سنائی جا چکی تھی۔ مدینہ منورہ میں دیا جانے والا نظام اسی کرامت آدم کی عملی تعبیر تھا۔ انسان کی تکریم اور عظمت لامتناہی ہے۔ اس کی فضیلت اور برتری کی حدود کا اندازہ ممکن نہیں۔ لیکن اس فضیلت میں اضافے اور برتری میں مزید ترقی کی واحد بنیاد تقویٰ اور تعلق مع اللہ ہے۔ جو انسان تقوی کی میزان میں جتنا وزن رکھتا ہے اتنا ہی تکریم واحترام کا استحقاق بھی رکھتا ہے۔

کرامت آدم کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ آدم کو خلافت الٰہیہ اور نیابت حق کے مقام پر فائز قرار دیا گیا۔ غلام انسانوں کی آزادی کے عمل میں شرکت، بے سہارا انسانوں کی مدد اور کم زور انسانوں کو سہارے کی فراہمی کو نیکی کی ایک بہت بڑی گھاٹی عبور کرنے کے مترادف قرار دیا گیا۔ انسان کو احسن تقویم کی خلعت عطا فرمائی گئی۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کا اور ایک قوم کو دوسری قوم کا احترام کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس بات کی ممانعت کر دی گئی کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کو توہین اور تمسخر کا نشانہ بنائے۔

دنیا کی بہت سی اقوام میں ایک غلط تصور یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور ماضی میں کسی کی طرف سے کی گئی کسی غلطی کا پیدائشی طور پر ذمے دار ہے یا کسی سابقہ موہوم اور فرضی جنم کی پاداش بھگتنے پر مجبور ہے۔ اس تصور سے نہ صرف کرامت آدم کا تصور داغ دار ہوتا ہے، بل کہ مساوات آدم کے اصول پر بھی زد پڑتی ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر اس کی تردید کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بل کہ ماضی کی تمام آسمانی شریعتوں میں بنیادی اصول یہی دیا گیا تھا:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۲)

ا۔ بنی اسرائیل: ۷۰

۲۔ الزمر: ۷

Marfat.com

نہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ اٹھانے کا پابند ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (۱)

اور نہ کسی دوسرے کی سعی و کاوش سے فائدہ اٹھانے کا حق دار۔

چناں چہ کسی بھی عالمی نظام کو نہ حقیقی طور پر عالمی قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ حقیقی مفہوم میں انسانی فلاح و بہبود کا حامل مانا جاسکتا ہے، اگر اس کی بنیاد انسانی مساوات اور انسان کے احترام اور تکریم کے اصولوں پر نہ ہو۔ آدمیت صرف احترام آدمی کا نام ہے۔ ماضی کے عالمی نظاموں کی طرح دور جدید کے عالمی نظام نے بھی ظلم و جبر کے علاوہ کم زور اور بے وسیلہ انسانوں کو کچھ نہیں دیا۔ ان نظاموں کے مرتبین کو مخصوص گروہوں اور نسلوں کی بالادستی اور برتری کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہ تھی۔

اسلامی شریعت کی رو سے انسانوں کے مابین کوئی نظام اس وقت تک کام یاب نہیں ہوسکتا جب تک اس کی بنیاد عدل و انصاف اور قول کے احترام پر نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ بتایا کہ ماضی میں جتنی آسمانی شریعتیں اتاری گئیں اور جتنی کتابیں بھیجی گئیں ان سب کا واحد مقصد یہ تھا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔ کوئی عالم گیر نظام ظلم کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ماضی کے ظالمانہ نظام بھی اسی لئے فنا کا شکار ہوئے کہ ان کی بنیاد ظلم پر تھی۔ قرآن میں یہ مضمون درجنوں بار بیان ہوا ہے کہ ماضی میں جن اقوام کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا وہ ان کے اپنے ظالمانہ رویوں کی وجہ سے تھا۔ قرآن مجید نے ماضی کی بہت سی اقوام اور تہذیبوں کی مثالیں دے کر یہ بتایا:

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۲)

اور آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی گرفت سخت تکلیف دینے والی ہے۔

۱۔ النجم: ۳۹

۲۔ ہود: ۱۰۲

Marfat.com

مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت کی گئی کہ

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱)

تم ہرگز ظالموں کا ساتھ نہ دو۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ ظالموں کو دنیا کی حقیقی اور دیرپا قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ آج سے کئی ہزار سال قبل جب حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کو یہ نوید دی گئی کہ ان کو پوری انسانیت کا امام بنایا جا رہا ہے تو انہوں نے دعا کی کہ امامت کا یہ سلسلہ ان کی اولاد میں بھی جاری رہے۔ اس پر انہیں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۲)

میرا یہ وعدہ ظلم کرنے والوں کے لئے نہیں ہوگا۔

خود اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن مسلمان حکومتوں میں عدل وانصاف اور قانون الٰہی کی بالادستی موجود رہی ان کو نہ صرف دنیوی کامیابی ملی بلکہ ان کو صدیوں دنیا کی قیادت اور رہ نمائی کرنے کا موقع ملا، اور جیسے ہی قانون کی بالادستی اور عدل وانصاف میں رکاوٹ پیدا ہوئی ان میں کمزوری اور تباہی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

اسلامی شریعت میں جہاں عدل وانصاف کی فطری اہمیت بیان کی گئی وہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عملی تفصیلات بھی بیان فرمائیں۔ بنیادی حقوق اور عدل وانصاف کے مجرد اور مبہم نعرے لگانا آسان ہے، لیکن ان کی عملی تفصیلات کا تعین اور ان پر عمل درآمد اصل کارنامہ ہے۔ ماضی کے بہت سے نظاموں کی طرح آج کے مدعیان انسانیت اور علم برداران عالم گیریت خدمت انسانیت، بنیادی حقوق، عدل اور انسانوں سے محبت جیسے خوش نما الفاظ بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔ زور تقریر اور شعر وشاعری کی حد تک یہ موضوعات بڑے خوش نما نظر آتے ہیں۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر چپت مارے تو تم بایاں رخسار بھی پیش کردو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ

۱۔ ہود ۱۱۳

۲۔ البقرۃ: ۱۲۴

Marfat.com

گزشتہ دو ہزار سالوں میں کتنے انسانوں نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس نعرے کے علم بردار کم وبیش گزشتہ دو ڈھائی سو سال سے عالمی نظام کی سربراہی کے مدعی ہیں۔ لیکن دنیا کو بالعموم اور عالم مشرق کو بالخصوص ان کے ہاتھوں میں جو کچھ ملا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں عدل کو ہر انسانی معاملے کی اساس قرار دیا ہے وہاں عدل کی عملی تفصیلات اور احکام بھی بیان فرمائے ہیں۔ آپ کی عطا فرمودہ شریعت میں عدل سے مراد وہ نظام ہے جس میں انسانوں کی درج ذیل پانچ چیزوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو۔

۱۔ دین کا تحفظ یعنی عقیدے اور مذہب کی آزادی

۲۔ جان کا تحفظ

۳۔ عقل کا تحفظ

۴۔ انسانوں کی آبرو اور خاندانی وقار کا تحفظ

۵۔ انسان کے مال وجائیداد کا تحفظ

اسلامی قانون کا پورا ذخیرہ اور اسلامی فقہ وشریعت کا پورا کتب خانہ ان ہی پانچ ارکان عدل کی تشریح وتوضیح سے عبارت ہے، جن کو متاخرین نے بہ جا طور پر مقاصد شریعت کی جامع اصطلاح سے یاد کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مقاصد شریعت کے ان تفصیلی احکام کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو عدل وانصاف اور حریت ومساوات کے سارے نعرے بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ آج دنیا میں جس عالمی نظام کا چرچا ہے اس کی تشکیل وتنفیذ کرنے والوں کی زبانوں پر انتہائی خوش نما الفاظ موجود رہتے ہیں، لیکن عمل کی میزان میں یہ الفاظ شاید کبھی اتنے کھوکھلے اور بے روح ثابت نہ ہوئے ہوں جتنے آج نظر آ رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے وجود نامسعود سے باخبر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا تھا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَافِي قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ (۱)

۱۔ البقرہ: ۲۰۴، ۲۰۵

Marfat.com

انسانوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں کہ جن کی باتیں اس دنیوی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوں گی۔ یہ لوگ اپنی نیتوں اور عزائم کے بارے میں اللہ کو بھی گواہ قرار دینے سے نہیں چوکیں گے۔ لیکن دراصل یہ لوگ انتہائی جھگڑالو دشمن ثابت ہوں گے۔ ایسے لوگوں کو جب بھی قیادت اور ولایت ملتی ہے تو یہ زمین میں فساد پھیلانے سے نہیں چوکتے۔ اور انسانی آبادیوں اور کھیتیوں کو تباہ و برباد کرنے سے باز نہیں آتے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے پیمانے ہر دور میں مختلف رہے ہیں ان کے یہاں لینے کے پیمانے اور، اور دینے کے پیمانے اور ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی ہلاکت اور تباہی کی خبر دیتے ہوئے اعلان کیا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ O الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ O وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ O (۱)

تباہی اور بربادی ہے ان مطففین کے لئے جو لوگوں سے کوئی چیز وصول کرتے ہیں تو پورا پورا ناپ کر لیتے ہیں۔ اور جب انہیں کوئی چیز ناپ کر دینی ہو تو کم دیتے ہیں۔

آج کل بالادست گروہوں اور ملکوں کا رویہ اس سے مختلف نہیں۔ جہاں کسی مسلمان کا حق متاثر ہوتا ہو تو وہاں اس بین الاقوامی نظام کے قواعد اور ہیں، اور جہاں مفاد کسی مغربی طاقت یا ان کے کسی پسندیدہ گروہ کا ہو تو وہاں قواعد و ضوابط اور ہوتے ہیں۔ آج کل کے بین الاقوامی معاملات و مسائل میں اس تفریق کی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہی وہ تخفیف ہے جس کے باعث ہلاکت ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے۔

کسی بھی بین الاقوامی نظام کی کامیابی کے لئے معاملات کی پابندی اور قول کا پاس ایک لازمی شرط ہے۔ کوئی بھی انسان انتظام معاہدات کی پابندی اور قول کے پاس

۱۔ المطففین: ۱ تا ۳

کے بغیر کام یاب نہیں ہوسکتا۔ آج کل معاہدات کی پابندی کی جو کیفیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ خاص طور پر کم زوروں اور بالاخص مسلمانوں اور طاقت وراور بااثر اقوام کے درمیان کیے جانے والے معاہدوں کے انجام سے ہم سب بہ خوبی واقف ہیں۔ قرآن مجید نے اس بنیادی کم زوری کی خوب نشان دہی کی ہے اور ایفائے عہد کی ضرورت دینے اور اس کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ اس کو اسلام کا امتیازی وصف ٹھہرایا ہے۔ نہ صرف قرآن مجید کی واضح ہدایات واحکام بل کہ پیغمبر صادق وامین علیہ الصلاۃ والسلام کے اسوہ مبارکہ میں یہ چیز نمایاں مقام رکھتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ کہہ کر کہ اپنے کیے ہوئے عہد اور دی ہوئی زبان کا پاس کرو، اس لئے کہ ہر عہد ومیثاق کے بارے میں روز قیامت سوال کیا جائے گا۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱)

اور عہد پورے کیا کرو، بلاشبہ عہد کے بارے میں سوال ہوگا۔

ہر جائز انسانی معاہدے کو ایک مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ اب مسلمان نہ صرف ایک دینی اور مذہبی ذمے داری کے طور پر بھی معاہدات کی پابندی کا مکلف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں حتیٰ کہ بدترین دشمنوں سے کیے جانے والے عہد ومیثاق کو جس طرح نبھایا وہ سیرت مقدسہ کا ایک نہایت اہم اور تاب ناک باب ہے۔ آپ ﷺ نے نہ صرف معاہدات کی پابندی کو مسلمانوں کے مزاج کا حصہ بنا دیا، بل کہ آپ کی لائی کتاب نے ان لوگوں کو بدترین چوپایوں سے تشبیہ دی جو معاہدوں کو توڑتے ہیں۔ کتاب الٰہی نے نہ صرف معاہدے توڑنے والوں کو شر دواب یعنی بدترین چوپائے قرار دیا۔ بل کہ ایسے لوگوں کو فاسق اور خاسر یعنی ناکام بھی ٹھہرایا۔

ایک کام یاب عالمی نظام کے لئے ان تمام معاملات میں تعاون اور ہم کاری انتہائی ضروری ہے جو انسانوں کی فلاح وبہبود کے لئے ہوں۔ جو امور بلاتفریق رنگ ونسل انسانیت کی خدمت کے لئے ہوں ان میں قرآن مجید نے سب سے تعاون کرنے کا

۱۔ بنی اسرائیل:۳۴

Marfat.com

حکم دیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں بین الاقوامی تعاون اور ہم کاری کے معاملات کو منظم کرنے کا ایک بنیادی اصول بتا دیا گیا۔ یعنی ان تمام کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو جو انسانی بھلائی اور اخلاقی اور روحانی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہوں اور ایسے کسی معاملے میں کسی سے تعاون نہ کرو جو انسانوں کے خلاف زیادتی اور سرکشی کے ساتھ ساتھ اللہ کے احکام کی نافرمانی کا ذریعہ بنے۔ یہاں کسی مذہبی اختلاف یا عقیدے کی بنیاد پر کوئی بات کہنے کے بہ جائے خالص انسانی اور روحانی اقدار کو بنیاد بنا دیا گیا ہے۔ مزید برآں ان غیر مسلم اقوام کے ساتھ مزید حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے جو مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ نہیں ہیں، اور جن کا ریکارڈ مسلمانوں کے خلاف ظلم و جبر کا نہیں ہے۔

خود سیرت پاک میں ایسے تعاون کی سب سے بڑی مثال حلف الفضول ہے، اس معاہدے میں براہ راست سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی۔ یہ معاہدہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم جناب زبیر ابن عبدالمطلب کی تحریک پر کیا گیا تھا اس کا مقصد مظلوموں کی دادرسی، ناداروں کی مدد، بے سہارا لوگوں کو سہارے کی فراہمی اور بے گھر، بے در اور بے خانماں قبائل کو امداد مہیا کرنا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل اپنے چچاؤں کے ساتھ اس معاہدے میں بہ نفس نفیس شرکت فرمائی تھی۔ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے کسی بھی معاہدے میں شرکت میرے لے سرخ اونٹوں یعنی دنیا کی بہترین نعمتوں سے بڑھ کر ہے اور اگر مجھے ایسے کسی معاہدے میں شرکت کی اب عہد اسلام میں دعوت دی جائے تو میں فوراً لبیک کہوں۔

دوسری اقوام و ملک کے با اثر اور محترم انصاف پسند قائدین کو احترام کا مقام دینا اور ان کی بات سننا بھی کسی بین الاقوامی نظام کی کام یابی کے لئے ناگزیر ہے۔ کسی قوم کے باعزت افراد کی تکریم خود اس قوم کی تکریم کے مترادف ہے۔ اور کسی قوم کی محترم شخصیتوں کی توہین خود اس قوم کی توہین کے مترادف ہے۔ اسی طرح ایسے مکارم اخلاق جن پر جاہلی تہذیبوں میں بھی عمل کیا جاتا ہو ان پر اسلامی دور میں بہ طریق اولیٰ عمل

Marfat.com

کیا جائے گا:

یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلية

غزوہ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے قریش کے جنگی قیدیوں کے بارے میں فرمایا کہ اگر مطعم ابن عدی آج زندہ ہوتا اور وہ ان لوگوں کی سفارش کرتا تو میں اس کی خاطر ان کو چھوڑ دیتا۔ مطعم قریش کا ایک انصاف پسند شخص تھا جس نے ہجرت سے قبل کے دور جبر و تشدد میں بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی گستاخانہ مہم میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ایسی انصاف پسند غیر مسلم شخصیتوں کا احترام بھی اسلام کے مزاج میں شامل ہے۔

لہٰذا مظلوموں کی امداد اسلام کے تجویز کردہ عالمی نظام کا اولین فرض ہے۔

مظلوم جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو، اس کی بہ قدر استطاعت مدد کرنا مسلمان کا فرض ہے۔

خاص طور پر اگر مظلوم مسلمان بھی ہو تو اس کی مدد ایک دوہرا فریضہ بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کی مدد اور دفاع کے لئے کیوں نہیں نکلتے جنہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

مظلوموں کو حق دفاع دیتے ہوئے قرآن مجید میں اعلان کیا گیا:

> **اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (۱)**
>
> ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی جن سے کافر قتال کرتے ہیں کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔
> یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے، محض یہ کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

قرآن مجید نے مظلوم کے حق فریاد کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بری بات کو کھلم کھلا کہہ دینے کو پسند نہیں کرتا۔ الا یہ کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے ہو

۱۔ الحج: ۳۹

Marfat.com

جن پر ظلم کیا گیا ہو۔ سرکار رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ مظلوم کی بددعا سے بچو اس لئے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حجاب نہیں بن سکتی۔

ایک کام یاب بین الاقوامی نظام کے لئے ضروری ہے کہ کسی قوم کے مخصوص عقائد ونظریات یا کسی مخصوص تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے تصورات واقدار کو دوسروں پر بالجبر مسلط نہ کیا جائے۔ ایسا نظام جس میں کم زوروں کو بہ زور شمشیر طاقتوروں کے نظریات وتصورات کو ماننے پر مجبور کر دیا جائے ایک استعماری نظام تو ہوسکتا ہے، بین الاقوامی تعاون کا کوئی نظام نہیں ہوسکتا۔ اگر پروپیگنڈے کے زور سے کسی مخصوص نظریے کی بالادستی قائم کی جائے تو اس سے ایک ظالمانہ نظام تو جنم لے سکتا ہے، ایک آزاد اور عادلانہ نظام جنم نہیں لے سکتا۔ قرآن مجید میں جب اقوام عالم کو بالعموم اور اہل کتاب کو بالخصوص ایک عالمی انسانی ہم کاری کی دعوت دی گئی تو کہا گیا کہ اے اہل کتاب آؤ اور ایک کلمہ سوا پر متحد ہو جاؤ تا کہ ہم سب مل جل کر ان مشترک اقدار کے لئے کام کریں جو ہم سب کے درمیان متفق علیہ ہیں۔ اس سیاق میں قرآن پاک میں ایک نہایت بلیغ بات یہ فرمائی گئی:

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱)

اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنائے سوائے اللہ کے۔

یعنی ہماری مشترکہ ہم کاری اسی وقت کام یاب ہوسکتی ہے جب ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کا آقا بن کر نہ بیٹھے۔ اور فیصلے کرنے کا اختیار یک طرفہ طور پر کسی ایک کے ہاتھ میں نہ ہو۔ قرآن کی اس دعوتِ تعاون کا جواب آنا ابھی تک باقی ہے۔

دوسروں کے مذہبی احساسات کا احترام کئے بغیر کوئی دیرپا اور پرامن نظام اول تو تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر اس کی تشکیل ہو بھی جائے تو اس کو چلانا بڑا دشوار ہے۔ اسلام نے اس پہلو کو غیر معمولی اہمیت دی اور مسلمانوں کو اس بات کی تربیت دی کہ وہ دوسروں کے مذہبی احساسات کا پورا احترام ملحوظ رکھیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر

۱۔ آل عمران: ۶۴

Marfat.com

قرآن مجید نے حکم دیا کہ دوسروں کے معبودان باطل حتیٰ کہ لات ومنات کو بھی برا نہ کہو، اس لئے کہ اگر تم دوسروں کے معبودان باطل کو برا کہو گے تو جواباً وہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے بارے میں بدزبانی سے باز نہیں آئیں گے۔ اور یوں تعاون اور اشتراک کی وہ فضا ختم ہو جائے گی جو کسی بھی بین الاقوامی نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

اسلام کی یہ رواداری مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین ہر قسم کے معاملات میں کارفرما نظر آتی ہے۔ انسانی تاریخ میں علمی اور فکری رواداری کی جو مثالیں مسلمانوں نے قائم کیں ان کی نظیر پیش کرنے سے دوسری اقوام قاصر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت دی تھی کہ غیر مسلم اہل کتاب کی مذہبی روایات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج (۱)

بنی اسرائیل کے قصے بیان کر سکتے ہو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

ایسے ہی سیاق وسباق میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے مذہبی روایات کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔

بین الاقوامی معاملات میں بعض اوقات مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں، اور ہر فریق اپنے نقطہ نظر کے حق میں دلائل دیتا ہے۔ ایسے موقع پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے۔ خاص طور اس صورت میں جب ایک فریق زیادہ طاقت ور اور بااثر ہو۔ پر انسان کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اپنے سے کم زور کے مقابلے میں اپنے موقف کو دلیل کے بہ جائے طاقت سے منوانا چاہتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہ تعلیم دی کہ جب کسی اس طرح کی بحث وتمحیص کی ضرورت پیش آئے تو بہترین طریقے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرو:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۲)

۱۔ مجمع الزوائد: ج۱، ص۳۷۹، رقم ۶۷۳

۲۔ النحل: ۱۲۵

Marfat.com

اور ان کے ساتھ بحث اچھے طریقے سے کیجئے۔

حکمت اور دانائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور دردمندانہ نصیحت اور خیر خواہی کا رویہ اپنائے رکھو۔ خاص طور پر اہل کتاب کے ساتھ گفت گو اور مکالے میں بہترین طرز عمل کو اپناؤ۔

بین الاقوامی معاملات میں نقطہ نظر کا اختلاف اور مصلحتوں کا ٹکراؤ ایک ناگزیر عمل ہے۔ ایسی صورت میں کسی طاقت ور اور بالادست گروہ کا جادۂ اعتدال پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی کمزور کو یہ تلقین کرنا تو بہت آسان ہے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لے اور صبر اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ لیکن اس تلقین کی زیادہ ضرورت طاقتور اور بااثر فریق کو ہوتی ہے جو صبر کا دامن چھوڑنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ قرآن مجید نے اس معاملے میں تین رویوں کا ذکر کیا ہے۔

مثالی رویہ تو یہ ہے کہ اخلاق اور تہذیب کا دامن کسی حال میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱)

آپ (برائی کو) نیک برتاؤ سے دور کیجئے۔

فریق مخالف کی بدکلامی اور بدزبانی کو معاف کر دیا جائے اور مصالحانہ رویہ اپنایا جائے:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ (۲)

اور صلح کرلے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

اور صبر سے کام لیتے ہوئے اس کی زیادتیوں سے درگزر کیا جائے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِO (۳)

۱۔حم السجدة:۳۴

۲۔شوریٰ:۴۰

۳۔شوریٰ:۴۳

Marfat.com

اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

اگر کوئی شخص اس اعلیٰ ترین مثالی رویے کو نہ اپنا سکے تو اس کو اجازت ہے کہ وہ فریق مخالف کو اسی زبان اور لب و لہجے میں جواب دے جو اس نے پہلے اپنایا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے اور جتنی برائی اس کے ساتھ کی گئی اتنی ہی برائی کا جواب دشمن کو دے دے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۱)

برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے اور جو معاف کر دے۔

اس سے آگے بڑھ کر کسی بھی قسم کے اقدام یا رویے کی ممانعت ہے۔ اس لئے کہ دشمن نے جتنی زیادتی کی ہے اس سے زیادہ اس کے خلاف اقدام کرنا یہ خود ایک قسم کی زیادتی ہے جس کی سختی سے ممانعت ہے:

وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (۲)

اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ بات کہ جنگ اور دشمن میں بھی عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے صرف اسلام کی تعلیم اور پیغمبر اسلام ہی کے اسوۂ حسنہ میں ملتی ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر حکم دیا گیا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں کوئی زیادتی کرنے پر ہرگز آمادہ نہ کرے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ یہ مثالیں صرف اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں کہ مفتوح دشمن اور اس کی شکست خوردہ فوج کو اسلامی عدالتوں سے وہ انصاف ملا جو خود ان کو اپنے آزاد ملک کی عدالتوں سے نہ ملا ہوگا۔ تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی فاتح قوم نے کوئی مفتوحہ ملک از خود اس لئے چھوڑ دیا ہو کہ ان کو ان کی اپنی عدالت نے مفتوحین کی شکایت پر اس کا حکم دیا ہو۔ اسلامی تاریخ میں سمرقند کے حکمرانوں کے

۱۔ شوریٰ: ۴۰

۲۔ البقرۃ: ۱۹۰

Marfat.com

واقعے میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی فاتح قوم نے مفتوحہ قوم کے باشندوں سے وصول کیا ہوا ٹیکس اس لئے واپس کر دیا ہو کہ چوں کہ فاتحین شہر خالی کر رہے ہیں اور وہ اس علاقے کے باشندوں کو تحفظ فراہم نہیں کر رہے جن سے انہوں نے ٹیکس لیا ہے اس لئے انہیں ٹیکس وصول کرنے کا حق نہیں۔ ایسی ایک مثال حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح اور حضرت خالد بن ولید کے طرز عمل میں ملتی ہے جب انہوں نے مفتوحہ شہر حمص کا خراج یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ ہم عسکری ضرورت سے شہر خالی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ خراج اپنے قبضے میں رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

یہ ہے اس عالمی نظام کا خاکہ جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو عطا فرمایا۔ آج اگر عالمی نظام کی تشکیل نو ان احکام و تعلیمات کی بنیاد پر کی جائے جو حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے انسانوں تک پہنچائیں اور جن کو آپ ﷺ نے عملاً نافذ کر کے دکھلایا تو دنیا ان مصائب و آلام سے بچ سکتی ہے جو لادینی مادی نظاموں کے پیدا کردہ ہیں۔

لیکن افسوس کہ آج دنیا کی بالادست قوتوں کے ہاتھوں جو نیا نظام تشکیل دیا جا رہا ہے یہ مغرب کا وہی سازِ کہن ہے جس کو آج نئے ناموں اور نئے عنوانات سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جن اسباب سے بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق وسطیٰ کے حصے بخرے کیے گئے تھے، آج اکیسویں صدی کے اوائل میں بھی ان ہی اسباب و محرکات کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی نئی نقشہ کشی کی جا رہی ہے۔ کل جن اسباب سے انجمن اقوام ناکام ہوئی تھی آج ان ہی اسباب سے ادارہ اقوام متحدہ بے اثر اور بے حیثیت نظر آتا ہے۔ حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال نے اس وقت مرض کی جو تشخیص کی تھی آج بھی وہی تشخیص درست معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد

Marfat.com

مشکلات حضرت انسان ازو است
آدمیت را غم پنہاں ازو است
در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است
دانش افرنگیاں تیغ بدوش
در ہلاک نوع انسان سخت کوش
آہ از افرنگ و از آئینِ او
آہ از اندیشۂ لادینِ او

ان حالات میں امت مسلمہ کی ذمے داریاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ آج کے سیاق وسباق ان ذمے داریوں کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ پاکستان میں مکمل اتحاد و یک جہتی کا فروغ آج سب چیزوں سے بڑھ کر اہم ہے، بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے فرمان کے مطابق پاکستان امت مسلمہ کا ایک بیس کیمپ اور دفاعی ڈھال ہے۔ اگر پاکستان کم زور ہوا تو دنیائے اسلام کم زور ہوگی۔ اگر پاکستان طاقت ور ہوا تو دنیائے اسلام طاقت ور ہوگی۔ لہٰذا امت مسلمہ کے مستقبل کی خاطر، اسلام کی بالادستی کی خاطر اور انسانیت کے روشن مستقبل کی خاطر سب سے پہلے پاکستان کا تحفظ ضروری ہے۔

۲۔ پاکستان کی بقا کی واحد ضمانت صرف اور صرف اسلام ہے۔ یہ ملک اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر وجود میں آیا تھا، اور جب تک یہ اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بنے گا اس وقت تک پاکستان کے تحفظ کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دی جاسکے گی۔

۳۔ دنیائے اسلام کے قائدین اور حکمرانوں کے مابین بنیادی بین الاقوامی معاملات میں عمومی اتفاق رائے اور فکری ہم آہنگی۔

۴۔ داخلی طور پر موجودہ مسلم ممالک کی آزادی، خودمختاری اور قومی سیادت کا تحفظ اور اس باب میں دنیائے اسلام کے مابین ممکنہ حد تک تعاون۔

Marfat.com

۵۔ دنیائے اسلام میں تعلیم وثقافت کے باب میں مکمل یک جہتی اور مہارتوں اور تخصصات کا تبادلہ اور تعلیمی وسائل کی تقسیم وتنسیق۔

۶۔ زیادہ سے زیادہ اقتصادی تعاون کو فروغ اور مسلم ممالک کی قومی معیشتوں میں خود کفالت کا حصول۔

۷۔ مسلم سیاست اور اسلامی ریاست کے کم سے کم مشترکہ قابل قبول عمل تصورات پر اتفاق رائے۔

۸۔ دینی تحریکات اور اسلامی تنظیموں اور حکومتوں کے مابین کش مکش کا مکمل اور فوری خاتمہ اور اس غرض کے لئے ایک بین الاقوامی مسلم مصالحتی کمیشن کی تشکیل جو اس کشاکش کے اسباب ومحرکات کا جائزہ لے کر ان کو ختم کرنے کے لئے تجاویز دے اور امت مسلمہ میں وحدت اور یک جہتی کو فروغ دینے کی راہیں ہموار کرے۔

یہ مقاصد واہداف کوئی معمولی مقاصد نہیں ہیں۔ ان کی تکمیل وتحصیل نہ محض خواہشات کے اظہار سے ممکن ہے اور نہ محض نعرہ بازی اور مطالبہ سازی سے یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے امت مسلمہ اور بالخصوص ملت پاکستان کے لوگوں کو بہ یک جان اور بہ یک آواز کام کرنا ہوگا۔ یہ چیز ایک طویل جدوجہد، جہاد، کا تقاضا کرتی ہے۔ جہاد صرف قتال یا جہاد بالسیف کو نہیں کہتے، بل کہ اسلام کے فروغ اور امت مسلمہ کے دفاع اور ترقی کے لئے کیا جانے والا ہر مثبت اور تعمیری کام بھی جہاد ہی کی ایک قسم ہے۔

آج کا زمانہ تلوار اور تیر کا نہیں، اعلیٰ ترین فنی مہارتوں اور سپر ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو ہر ممکن اور دست یاب قوت کے حصول کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خاص طور پر منجنیق کے استعمال کا طریقہ سیکھنے کے لئے یمن روانہ فرمایا اور اس مہارت سے طائف کی فتح میں کام لیا۔ مزید برآں قرآن مجید کا حکم ہے کہ جن وسائل سے دشمن تم پر حملہ آور ہو ان ہی وسائل سے تم اس کے حملے کا جواب دو۔

Marfat.com

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۱)

پس تم اسی قدر بدلہ لو، جس قدر اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

آج اگر ہم محض نعروں اور جلوسوں سے سپر ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنا چاہیں تو یہ نہ صرف حکمت اور دانائی بل کہ قرآن مجید کی ہدایات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے منافی ہوگا۔

جہاد ایک طویل المیعاد عمل کا تقاضا کرتا ہے، اس کا کوئی مختصر راستہ یا شارٹ کٹ نہیں ہے۔ اس کے لئے صبر، حوصلہ اور ہمت سے جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کو جا بہ جا صبر کی نصیحت کی گئی ہے۔ صبر کوئی منفی صفت نہیں، بل کہ ایک مثبت اور تعمیری رویئے کا نام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو دنیا کی امامت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے۔ صبر کے قرآنی اور اسلامی مفہوم میں استقلال، ہمت اور جہد مسلسل کے عناصر شامل ہیں۔ صبر سے ہی دشمن کی چالیں بے اثر بنائی جاسکتی ہیں:

وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ط وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (۲)

اور اگر تم پر کوئی سختی آتی ہے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو ان کا مکر تمہیں ذرا بھی نقصان نہ دے گا۔

جس طرح مادی کام یابی کے لئے جہاد ناگزیر ہے اس طرح روحانی اور فکری کام رانی کے لئے اجتہاد ضروری ہے۔ دور جدید میں مسلمانوں کو درپیش چیلنجز کا جواب کیسے دیا جائے۔ اسلامی علوم وفنون کے بے بہا ذخائر کو عصر حاضر میں کیسے ایک زندہ اور فعال علمی روایت بنایا جائے، مغربی علوم وفنون پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان کی کس طرح ایسی تشکیل نو کی جائے کہ وہ مسلم معاشرے کے مزاج اور روایات سے ہم آہنگ ہوجائیں،

۱۔ البقرہ: ۱۹۴

۲۔ آل عمران: ۱۲۰

Marfat.com

دین و دنیا کی جامعیت اور وحدت کے اسلامی اور قرآنی تصور کو کس طرح ہمارے تعلیمی نظام اور ثقافتی زندگی کی اساس بنایا جائے، ان سب سوالات کا جواب گہری اجتہادی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔

امت مسلمہ قوامین بالقسط کا نمونہ اسی وقت بن سکتی ہے، جب اس کا اندرونی نظام اسلام کے تصور عدل کی بنیاد پر از سر نو استوار ہو۔ وسائل کی عادلانہ تقسیم، دولت کی یک ساں گردش اور تقسیم دولت کی اسلامی ہدایات پر عمل درآمد کئے بغیر اسلام کے معیار عدل کی طرف پیش قدمی کرنا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام مقاصد کی تکمیل اور اس بہت بڑے چیلنج کا سامنا کرنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔

Marfat.com

دفاعِ اسلام اور مطالعہ مسیحیت

مولانا رحمت اللہ کیرانوی قرآن ہال کے افتتاح کے موقع پر خطاب

جنوری ۲۰۰۵ء

جامعہ اسلامیہ ٹرسٹ۔ کاموکی

Marfat.com

دفاعِ اسلام اور مطالعہ مسیحیت

محترم علمائے کرام

زعمائے ملت اور شرکائے تقریب

میں جامعہ اسلامیہ کے منتظمین کو مجاہد کبیر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے حوالے سے اس تقریب کے انعقاد اور ان کی خدمات کے اعتراف میں اس قرآن ہال کو ان سے منسوب کرنے پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور شکرگزار ہوں کہ اس تقریب کے ذریعے اتنی بڑی تعداد میں جید علمائے کرام اور دوسرے اہل علم حضرات سے گفت گو کرنے کا مجھے موقع فراہم کیا۔ مولانا زاہد الراشدی نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی حیات و خدمات پر جامع گفت گو کی ہے، جس سے ان کے کام کی اہمیت اور عظمت کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ امر نہایت خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے کہ اس ادارے کے منتظم مولانا عبدالرؤف فاروقی نے اپنے آپ کو اور اس ادارے کو حضرت مولانا کیرانوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے علمی وفکری کام کو آگے بڑھانے کے لئے وقف کرنے کا اعلان کیا ہے۔ میں آپ کے سامنے اس کام کے پس منظر اور امت مسلمہ میں اس کی اہمیت کے سلسلے میں کچھ گفت گو کروں گا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی خدمات کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس موضوع کو اچھی طرح سمجھا جائے جس پر مولانا نے کام کیا۔ عنوان کے اعتبار سے تو وہ کام ہے ردعیسائیت اور دفاع اسلام کا، کہنے کو تو یہ بڑے آسان سے عنوانات ہیں، لیکن علمی اعتبار سے یہ کتنے ہمہ گیر ہیں اس بات کو جاننے کے لئے ہر مسلمان کو اس کا پس منظر اور اس کی تاریخ کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

Marfat.com

ہم مسلمان روزانہ دن رات میں کم از کم سترہ بار سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں۔سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کی راہ نمائی کی درخواست کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی ہے کہ اے اللہ المغضوب علیھم اور الضالین کے راستے پر چلنے سے ہماری حفاظت فرما اور اس راہ سے بچنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔اندازہ کیجئے کہ وہ صراط مستقیم کیا ہے جس پر چلنے کی ہم روزانہ کم از کم سترہ بار توفیق مانگتے ہیں اور انحراف کے وہ راستے کیا ہیں جن سے ہم روزانہ سترہ بار پناہ مانگتے ہیں۔تمام مفسرین اور اہل علم متفق ہیں کہ صراط مستقیم تو انبیا،صدیقین،شہدا اور صالحین کا راستہ ہے،جن پر اللہ پاک کا انعام ہوا ہے۔جب کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں کہ جو راہ حق سے بھٹک گئے۔

تاریخ انسانیت میں گم راہی کے اسباب دو ہی ہو سکتے ہیں،ایک تو یہ کہ کوئی شخص یا گروہ جان بوجھ کر ایک غلط نظریے یا راستے کا انتخاب کر لے اور دوسرا یہ کہ شیطان یا کوئی دھوکہ دینے والا اسے دھوکے میں مبتلا کر دے اور وہ راہ حق سے بھٹک کر غلط راستے کو ہی صحیح راستہ سمجھتے ہوئے اسے اختیار کر لے اور اس پر چل پڑے۔انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی شخص ایک راستے کو غلط سمجھتے ہوئے اسے اختیار کرے اور اس پر سفر کا آغاز کر دے۔عموماً کوئی نادانی اور مغالطہ ہوتا ہے جس میں مبتلا ہو کر کوئی صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔اعتقادی و علمی دنیا میں بسا اوقات معمولی سی غلطی اور نادانی بل کہ معمولی سی غفلت انسان کو حق و صداقت سے بہت دور لے جاتی ہے اور وہ راہ صواب سے کوسوں دور نکل جاتا ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے ایک لمحے کے لئے رکا تھا کہ محبوب کی سواری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور میری یہ ایک لمحے کی غفلت میرے لئے سیکڑوں سال کے لئے بچھڑ جانے کا سبب بن گئی۔

Marfat.com

انسانی تاریخ میں مذہبی انحراف کے باب میں جو غلطیاں ہوئیں وہ دو طرح کی ہیں۔ ایک انداز کی غلطی تو وہ ہے جس کی نمائندگی یہودیت کرتی ہے، اور دوسری طرح کی غلطی وہ ہے جس کی نمائندگی کا اظہار عیسائیت میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں انداز کی غلطیوں اور انحرافات کی نشان دہی متعدد مواقع پر اور مختلف انداز میں کی اور امت کو ان سے بچنے کی تعلیم دی۔

مثلاً عیسائیت میں رہبانیت کا تصور اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ ہمارے لئے شریعت میں جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ مادیات سے بچنے اور روحانی درجات کے حصول کے لئے ناکافی ہیں، ان کو یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لئے مزید پابندیوں کی ضرورت ہے۔ چناں چہ انہوں نے خود اپنی طرف سے رہبانیت کا راستہ اختیار کیا۔ قرآن مجید میں کہا گیا:

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۱)

رہبانیت کا حکم ہم نے نہیں دیا تھا بل کہ انہوں نے خود ہی اسے ایجاد کر لیا تھا۔

دوسری طرف یہودیوں نے ہفتے کے سات دنوں میں سے ایک دن تو عبادت خداوندی کے لئے مخصوص کر لیا کہ اس دن ہم دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے اور ہر طرح کی مادی ضرورتوں اور خواہشات سے کنارہ کش رہیں گے، جب کہ باقی ایام میں ہم شریعت کی ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہوں گے اور جس طرح چاہیں گے اپنی مرضی سے زندگی گزاریں گے۔

ہمارے یہاں بھی ایک خطرناک اور گم راہ کن سوچ ان ہی کی پیروی میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم شریعت کے اصولوں پر عمل کریں گے۔ خود شریعت سے تو گھبراتے ہیں۔ شریعت کے اصولوں پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی! تم شریعت کے اصولوں پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہو تو خود شریعت پر عمل کیوں نہیں کرتے، یہ دراصل اسی کج فہمی اور کج روی کا نتیجہ ہے کہ کچھ

۱۔ الحدید: ۲۷

Marfat.com

لوگ شریعت کے اصولوں کی بات کر کے احکام شریعت کو اپنی مرضی کے معنی پہنا دینا چاہتے ہیں اور احکام شریعت کو اپنی سوچ اور خواہشات کا تابع بنا دینا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر شریعت کا اصول یہ ہے کہ اس میں عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ اب کچھ لوگ عدل و انصاف کے شرعی پیمانوں کے بہ جائے خود اپنے یہاں سے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عدل وانصاف وہ ہوگا جس کو ہمارا ذہن عدل وانصاف قرار دے گا۔ یہی وہ انداز ہے جو یہود اور نصاریٰ نے اختیار کیا۔ آپ عموماً دیکھتے ہوں گے کہ جب کوئی عیسائی مبلغ و مفکر اپنے مذہب کی دعوت وتبلیغ کا کام کرتا ہے۔ وہ ایسے عجیب وغریب قسم کے دعوے کرتا ہے، جن کے پیچھے کوئی حقیقت اور کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور ان کی حیثیت ایک نعرے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، اور ایک مسیحی مبلغ اور پادری اسے ایک نعرے کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے، وہ کوئی قابل عمل حقیقت یا تعلیم نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ پر انسانیت کی خدمت کا پردہ ڈال کر بات کرتا ہے کہ صاحب ہم تو انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ انسانیت کی خدمت بہت اچھی بات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الخلق عیال اللہ (۱)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی خدمت پر بڑا اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ عیسائیت کے پاس اس کے لئے کیا تعلیم اور کیا ہدایت نامہ ہے اور اس کے مذہبی لٹریچر میں اس کے لئے کیا انداز تعلیم دیا گیا ہے؟ اس کے لئے اس کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے۔

تین چار سال قبل مجھے ایک ایسے اجتماع میں جانے کا اتفاق ہوا جو مسلمان، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا مخلوط اجتماع تھا۔ مجھے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر گفت گو کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے کہا رسول اللہ کی سیرت

۱۔ ہیثمی۔ مجمع الزوائد، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۴ء، ج ۸، ص ۳۴۹، رقم ۱۳۷۰۶

Marfat.com

طیبہ تو ایک ایسی جان دار اور ہمہ گیر حقیقت ہے جس کو ہر گروہ اور ہر ملک کے لوگ اپنانے پر مجبور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں انسانوں کے لئے ایسا لائحہ عمل موجود ہے کہ تمام انسان اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے سعادت مند ہیں جنہوں نے برضا و رغبت آپ کو رسول اللہ تسلیم کرتے ہوئے آپ کی پیروی کی اور اس طرح دارین کی سعادت حاصل کر لی، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو مجبوراً آپ ﷺ کی پیروی کر رہے ہیں، بل کہ اس وقت بھی زیادہ تعداد انسانی برادری کی وہ ہے جو آپ کے رسول اللہ ہونے کا انکار کرنے کے باوجود آپ کی پیروی کرنے پر مجبور ہے، وہ تسلیم کرے یا نہ کرے آپ ﷺ کی عملاً پیروی کر رہی ہے، اور اسی پیروی کی وجہ سے ان کی دنیا میں امن اور سکون ہے۔ انسانیت سے محبت کی تعلیم آپ نے بھی دی ہے لیکن وہ اس طرح دی گئی ہے کہ اس پر عمل کرنا ممکن ہے۔ آپ ﷺ نے مظلوم کی حمایت کرنے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تعلیم دی تو فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ مظلوم بھائی کی امداد تو سمجھ آتی ہے، ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ظالم کو ظلم سے روک دو، یہی اس کی امداد ہے۔ (۱)

لہٰذا انسانی عقل اس اصول کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ وہ یہ بات سمجھ گئی ہے کہ دنیا سے ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مظلوم کی حمایت کی جائے اور ظالم کا ہاتھ روک کر اسے ظلم سے باز رکھا جائے۔ یہ خود اس ظالم کی بھی امداد ہے کہ وہ کسی پر اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر ظلم کر ہی نہ سکے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں عدل و انصاف کا ایک آسان اور قابل عمل معیار مقرر دیا، یہی اسلامی شریعت ہے۔

ظاہر ہے ظالم سے تعاون کا طریقہ اور ہوگا، مظلوم سے تعاون کا طریقہ اور ہوگا، قاتل سے تعاون کا طریقہ اور ہوگا، مقتول سے تعاون کا طریقہ اور ہوگا۔ ظالم اور قاتل سے ہم دردی کا انداز یہی ہے کہ قاتل اور ظالم کو عدل و انصاف کے کٹہرے میں لا کر کھڑا

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: انصر اخاک ظالماً او مظلوماً۔ احمد۔ المسند، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۳، ص ۵۳۲، رقم ۱۱۵۳۸

Marfat.com

کردو، اس کے جرم کی اسے سزا دے دو، اسی سے دنیا میں انصاف قائم ہوگا اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی طرح ہم پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی عدل، انصاف اور مساوات کا جو درس دیا ہے اس کے لئے محض کھوکھلے نعرے دینے پر اکتفا نہیں فرمایا، بل کہ ان کے اصولوں پر عمل درآمد کے لئے با قاعدہ ایک ضابطہ اخلاق دیا ہے جسے شریعت کہتے ہیں۔ اس کو دنیا میں نافذ کردو، انسانوں میں انصاف قائم ہو جائے گا۔

میں نے اُس اجتماع میں بیان کیا کہ دوسری طرف تم انسانیت کی خدمت کے حوالے سے جو سب سے بڑی بات کہتے ہو وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم دی تھی کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر چانٹا رسید کرے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کے آگے کردو کہ وہ اس پر بھی چانٹا لگا دے۔ یہ کیسی ناقابل عمل تعلیم ہے اور کیا اس طرح کبھی دنیا سے ظلم کا خاتمہ ہو سکتا ہے؟ گزشتہ دو ہزار سال کی مسیحی تاریخ کوئی ایک مثال تو دنیا کے سامنے لائے کہ کسی نے کسی کے ایک گال پر تھپڑ مارا ہو تو اس نے دوسرا گال بھی آگے کر دیا ہو؟ آپ ہی بتایئے کہ کیا کبھی کسی نے ایسا کیا ہے کہ اس کے ایک بھائی کو کسی نے قتل کر دیا ہو، تو اس نے دوسرا بھائی آگے کر دیا ہو کہ لو اسے بھی قتل کرتے جاؤ۔ کسی چور نے ایک کمرے کا تالہ توڑ کر چوری کی ہو یا ڈاکہ ڈالا ہو تو آپ نے دوسرے کمرے کا تالا خود کھول دیا ہو کہ جناب اس کمرے میں سے بھی مال اٹھا کر لے جایئے۔ کسی دشمن نے ایک شہر فتح کیا ہو تو آپ نے دوسرا شہر خالی کر دیا ہو کہ لیجئے اسے بھی لیتے جایئے؟ اس طرح کی غیر عملی اور غیر حقیقی اخلاقی تعلیم سے تو کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ انصاف تو شریعت کے پوری طرح نفاذ سے قائم ہوگا کہ ظلم کرنے والے کو عدالت اور انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کیجئے، یہ الگ بات ہے کہ مظلوم یا مقتول کے ورثا اسے معاف کر دیں تو:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (۱)

کی رو سے اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے لئے اجر ہے۔ ورنہ جب حد قائم ہوگی

۱۔ الشوریٰ: ۴۰

Marfat.com

اور جرم کی سزا جاری ہوگی تب ہی دنیا سے ظلم کا خاتمہ ممکن ہوگا۔

یہ بات اس طرح چلی کہ یہود و نصاری کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے شریعت نازل کی تھی، لیکن انہوں نے اس پر پوری طرح عمل کرنے کی بہ جائے اپنی عقلی تدابیر سے فرار کی راہیں تلاش کیں تو گم راہ بھی ہوئے اور اللہ کے غضب کے مستحق بھی قرار پائے۔ امت مسلمہ کو ان کی سی راہ اور ان کا سا انداز فکر اختیار کرنے سے روکا گیا۔

پہلی آسمانی کتابوں میں دین کی جو اساسیات اور شریعت کی جو بنیادیں نازل ہوئی تھیں ان کا قرآن میں تحفظ کیا گیا اور ان کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے ان کی شکل تبدیل کر دی تھی اور ان کی تعبیرات و تشریحات کو اپنی خواہشات کے تابع بنالیا تھا۔ اس لئے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان شریعتوں کی خوبیوں اور اصولوں کو جمع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے: وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ (۱) یعنی یہ قرآن پہلی کتابوں کی بنیادی تعلیمات کی جامع ہے اور ان کی محافظ ہے۔ جو اصول و عقائد تمام شریعتوں میں مشترک چلے آرہے تھے جب اہل کتاب نے ان میں تحریف کر دی تو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لئے قرآن مجید میں وہ تمام اصول و عقائد واضح، صاف صاف اور مکمل انداز میں بیان کر دیئے کہ اس کتاب کو باقی رہنا تھا۔ اب امت مسلمہ کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ان عقائد و تعلیمات کا داعی اور ذمے دار قرار دے دیا گیا، بل کہ زمین پر ہی نہیں نئے نئے سیاروں میں اور جہاں جہاں بھی انسانی آبادی دریافت ہوگی یا انسان وہاں جا کر آباد ہوگا امت مسلمہ وہاں شریعت کے داعی کا فریضہ سرانجام دے گی، اور اس کا ہر فرد اس بات کا ذمے دار ہوگا کہ وہ انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دے اور دنیا و آخرت میں اس کی کام یابی کی ضمانت دینے والا دین اس کے سامنے پیش کرے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں پہلی قوموں کی نفسیات، تاریخ، عروج و زوال، طرز عمل اور انجام سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جب مضامین نازل فرمائے تو جو مذہب وقت

ا۔ المائدہ: ۴۸

Marfat.com

اور زمانے کے ساتھ ساتھ مٹ جانے والے تھے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بت پرستی، آتش پرستی اور اس طرح کے خود بہ خود ختم ہو جانے والے مذاہب کے بارے میں آپ کو قرآن پاک میں زیادہ مضامین نہیں ملیں گے، لیکن جن دو مذاہب کے ساتھ اس امت کو ہمیشہ واسطہ پڑنے والا تھا اور مقابلے کی صورت ہمیشہ سامنے آنے والی تھی ان کا اللہ تعالیٰ نے پوری تفصیل کے ساتھ جابہ جا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن مجید جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر مشتمل آیات ہیں۔ احکام شریعت ہیں، تعلق مع اللہ کے لئے دعائیں اور اسمائے حسنیٰ کا ذکر ہے، وہاں ان دونوں قوموں کی بے اعتدالی اور ان تمام معاملات میں عدم توازن کا تفصیلی بیان بھی ہے۔ آپ ذرا اس بات پر غور فرمائیں کہ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن مجید کی پہلی دو سورتیں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہیں۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دو سورتیں ''زہراوین'' ہیں کہ قیامت کے دن یہ دو پھولوں کی طرح امت مسلمہ پر سایہ کریں گی۔ ان دونوں سورتوں میں کیا مضامین ہیں۔ آپ آج ہی جا کر مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ سورۂ بقرہ میں تمام انسانوں کو خطاب کرنے، دین کی دعوت کے نتیجے میں سامنے آنے والے تین گروہوں کا ذکر کرنے اور خلافت الٰہیہ کا بیان کرنے کے بعد بنی اسرائیل کا تذکرہ فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے، اور یہود کا یہ تذکرہ سورت کے آخر تک کسی نہ کسی انداز سے جاری رہتا ہے۔ اس سورت کے مضامین کی تورات کے مضامین سے گہری مناسبت محسوس ہوتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ تورات میں احکام تھے تو سورۂ بقرہ میں بھی حلال وحرام جہاد وحج، زروزہ، نکاح طلاق وغیرہ کے احکام ہیں۔ ان کا طرز وہی ہے جو تورات کا طرز ہے۔ یہود نے چوں کہ تورات میں تحریف کر دی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ان کی فریب کاری، بے راہ روی، قتل انبیا اور کتاب اللہ میں تحریف و تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے امت مسلمہ کو ان کی نفسیات کو سمجھنے ان سے ہوشیار رہنے اور ان کا سا انداز حیات اختیار نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

پھر جب سورۂ آل عمران شروع ہوتی ہے تو آغاز میں ہی اللہ تعالیٰ کی توحید کا

Marfat.com

بیان ہے اور ان صفات کا ذکر ہے جن میں عیسائیوں نے مشرکانہ عقائد اختیار کر لئے تھے۔ پوری سورت میں احکام نہیں ہیں، بل کہ تعلق مع اللہ کی بنیادیں بیان کی گئی ہیں اور اس طرح اس سورت کے مضامین کی انجیل کے مضامین سے مناسبت ہے کہ انجیل میں بھی احکام اور حدود نہ تھے۔ شریعت تو ان کے لئے بھی وہی تھی جو تورات میں نازل کی گئی تھی، انجیل میں شریعت کے اعلیٰ اخلاقی مقاصد پر زور دیا گیا ہے اور نظام الٰہی کی روحانی بنیادیں بیان کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کی شفقت اور مہربانیوں کا تذکرہ ہے۔ شاید اسی سے عیسائیوں کی گم راہی کی بنیاد قائم ہوئی۔ ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی شفقت کو سمجھانے کے لئے باپ اور اولاد کی مثال دی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنی مخلوق کے ساتھ شفقت فرماتے ہیں جس طرح باپ اپنی اولاد کے ساتھ شفقت کرتا ہے۔ ممکن ہے اس تمثیل کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے وہ اس شرکانہ عقیدہ تثلیث میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ بہ ہر حال سورۂ آل عمران میں عیسائیت کی تاریخ، حضرت مریم و عیسیٰ کا تذکرہ اور اہل کتاب کی ان خصلتوں کا ذکر ہے جن کو پوری طرح سمجھ کر ہی امت مسلمہ اپنی ہمہ گیر اور عالمی ذمے داریوں کو سرانجام دینے کے قابل ہو سکتی تھی۔

گویا ان دونوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس کے بین الاقوامی کردار کے لئے علمی فکری اور نظریاتی اعتبار سے تیار کیا ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ اس عالم گیر کردار کی انجام دہی کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔ جب بھی آپ اپنا وہ عالمی اور بین الاقوامی کردار ادا کرنا چاہیں گے تو وہ تین چیزیں آپ میں موجود ہونی چاہئیں۔

پہلی چیز یہودیت و عیسائیت کی نفسیات، طریقہ واردات، عقائد و اعمال کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ احکام اور تذکیر یعنی حدود اللہ اور تعلق مع اللہ کے مضامین کے درمیان توازن قائم ہو، شریعت اور طریقت یعنی شریعت کے ظاہری احکام اور اس کی داخلی حکمتوں کو پوری پوری طرح سمجھ کر ان پر کماحقہ عمل ہو۔ ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی نظر انداز ہو گیا تو وہ توازن بگڑ جائے گا جسے قائم رکھنے کا ذمے دار اس امت کو بنایا گیا

Marfat.com

ہے۔ اور یہی عدم توازن یہودیت وعیسائیت کا طرز عمل ہے۔

اور تیسری چیز یہ ہے اور مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے اور اسے یاد رکھنا چاہئے کہ جب بھی وہ اپنے بین الاقوامی کردار کو ادا کرنے پر زور دیں گے اور اسے ادا کرنے کے لئے نکلیں گے تو یہودیت وعیسائیت سے ان کے مقابلے کی صورت پیدا ہوگی، اس صورت میں جو ٹکراؤ ہوگا اس کے لئے تیاری پہلے سے کرنا ہوگی۔ یہ تیسری ضروری چیز ہے۔ یہ تیاری علمی میدان کے لئے بھی ہوگی اور جہاد کے میدان کے لئے بھی۔ یہ ٹکراؤ علمی، فکری، تہذیبی، تمدنی، عسکری، سیاسی، اقتصادی غرض سب میدانوں میں ہوگا۔ ان سب میدانوں میں اس ٹکراؤ یعنی encounter کے لئے مسلمانوں کو تیار ہونا اور ہمیشہ تیار رہنا پڑے گا:

تکیہ بر محبت و اعجاز بیاں نیز کنند
کار حق گاہ بہ شمشیر وسنان نیز کنند

یاد رکھئے اگر ان تین چیزوں کا اہتمام ہوگا تو آپ اپنا بین الاقوامی کردار ادا کر سکیں گے۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز بھی رہ گئی تو یہودیت وعیسائیت آپ کے لئے سدراہ ہوگی۔ لہٰذا سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ مطالعۂ مسیحیت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے نام سے یہ ہال منسوب کیا گیا ہے اور مولانا فاروقی نے مطالعہ مسیحیت کے لئے اپنے آپ کو اور اس ادارے کو وقف کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے انداز میں مسیحیت کا مطالعہ اور اس کا علمی تعاقب ومحاسبہ ہو سکے گا۔ اس وقت اس طرح کے ادارے کی ضرورت اہل علم کو بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسیحیت کا ناقدانہ مطالعہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے یہاں ایک اہم کام سمجھا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص جیسے صحابہ کرامؓ میں اس سلسلے میں ذوق موجود تھا اور صحابہؓ کے اتباع میں ان کی اس سنت کو جاری رکھتے ہوئے ہر دور میں کے علمائے اسلام نے مطالعہ مسیحیت کو اپنے خصوصی

Marfat.com

مطالعہ کا موضوع بنایا۔ چناں چہ علامہ شہرستانی، امام ابن حزم، امام ابن تیمیہ اور دیگر علمائے امت نے اس پر مستقل کام کیا اور ردعیسائیت کے علمی اصول متعین کئے۔ ہمارے اس برصغیر میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس سلسلے میں گراں مایہ خدمات سرانجام دی ہیں۔

مطالعہ مسیحیت کے سلسلے میں یہ بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ مسیحیت کا مطالعہ صرف مذہبی اعتبار سے کرنا کافی نہیں۔ ان کی تاریخ، تمدن اور سیاست سب کا مطالعہ ضروری ہے۔ عیسائیت کے تمام گروہوں اور طبقوں پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ حکم راں اور سیاست داں ہوں۔ محقق اور مستشرق ہوں یا مبلغ اور مبشر۔ عیسائیت کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جہاں تاجر یا حکم راں پہلے گئے تو بعد میں وہاں پادری اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے پہنچے اور جہاں مبلغ اور تبشیری افراد پہلے پہنچے اس کے بعد راہ ہموار ہوئی، اور حکم رانوں کے لئے راستہ کھلا۔ ہندوستان اور افریقہ کی الگ الگ مثالیں اس کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ یہاں پہلے تاجر اور حکم راں آئے۔ ان کے بعد عیسائی مبلغین نے اسلام کے خلاف یلغار کی۔ جب کہ افریقہ میں پادریوں نے عیسائی استعمار کا راستہ ہموار کیا، یہ حقیقت ہے کہ عیسائی مبلغین اور پادریوں کا گہرا رابطہ باقی تمام گروہوں سے رہا ہے، بہ ظاہر وہ الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن ان کے درمیان ایک منصوبہ بندی ہے، جس کے مطابق یہ سب گروہ مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھتے ہیں۔

مستشرقین عیسائیوں کی وہ جماعت ہے جو بہ ظاہر غیر جانب دار علمی تحقیق کے حوالے سے متعارف ہے، لیکن اگر ان کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا تبشیری گروہ سے بڑا گہرا تعلق ہے بل کہ حکم رانوں کے ساتھ بھی ان کے روابط بڑے مضبوط ہیں۔

آج سے چالیس برس قبل لبنان کے ایک عالم نے بڑی تحقیقی کتاب لکھی تھی جس کا موضوع ہے العلاقة بين الاستعمار والتبشير، اس میں انہوں نے دلائل کے ساتھ واضح بل کہ ثابت کیا کہ مغربی حکم رانوں کے ساتھ عیسائی مذہبی مبلغین کا کتنا گہرا رابطہ

Marfat.com

ہے۔ میری یہ درخواست ہوگی کہ جب یہاں اس عنوان پر کام کرنے کے لئے مرکز قائم ہو تو اس کتاب کا اردو ترجمہ کرکے اسے شائع کیا جائے۔ اس کتاب میں مصنف ڈاکٹر عمر فروخ لبنانی نے ایک ایک کرکے ثابت کیا ہے کہ کس عیسائی پادری کے کس مستشرق کے ساتھ رابطے تھے اور کون سا مستشرق تحقیق کے میدان میں آنے سے پہلے ایک انتہا پسند عیسائی مبلغ تھا۔

آپ اپنے طور پر مستشرقین کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ یہاں بجا طور پر آپ کو علم ہوگا کہ درجنوں ایسے مستشرق اسے ہیں جو تحقیق کے میدان میں آنے سے پہلے پادری ہی تھے۔ یہاں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اپنی زندگی بہ حیثیت پادری عیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف کر چکا ہے اب یکا یک اس کو کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ مذہبی تبلیغ چھوڑ کر سیرت، حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، عربی زبان اور اس طرح کے خالص اسلامی موضوعات پر تحقیق کرنے کے لئے باقی زندگی گزار دے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو انہیں اسلامی موضوعات پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ علم اور تحقیق کی کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں، وہ تو غیر جانب دارانہ تحقیق کے نام پر اسلام پر طعن کا دروازہ کھولتے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ان میں سے بیشتر کا مشن ہے۔

چناں چہ جب انیسویں صدی میں مستشرقین نے دیکھا کہ تقریباً پورا عالم اسلام عیسائی استعمار کے زیر تسلط ہوگیا ہے تو انہوں نے سمجھا کہ اب ان کا کام بڑا آسان ہوگیا ہے۔ اب انہوں نے سب سے پہلا حملہ قرآن مجید پر کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ قرآن پاک نعوذ باللہ ایک لغو کلام ہے، اور یہ کوئی آسمانی کتاب نہیں بل کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر سے مضامین لے کر اسے آسمانی کتاب قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور زیادہ سے زیادہ یہ عربی زبان میں ایک عام درجے کی ادبی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں پہلی قوموں کے واقعات بھی ہیں اور اخلاقی وفلسفیانہ تعلیمات بھی۔ لیکن پچاس سال تقریباً اس عنوان پر کام کرنے اور قرآن کو ہدف تنقید بنانے کے بعد انہیں اندازہ ہوگیا کہ قرآن کی مضبوط بنیادوں کو اپنی جگہ سے ہلانا ممکن نہیں اور وہ قرآن مجید پر

Marfat.com

تنقید کر کے محض اپنی توانائی ضائع کر رہے ہیں۔ اب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا اور آپ کی اخلاقی حیثیت پر طعنہ زن ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ہماری زبان میں ہرگز یہ طاقت نہیں کہ ان کے الفاظ کو دھرا سکیں۔ لیکن جلد ہی یہاں بھی انہیں اندازہ ہوگیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت پاک ایسی قوی اور ناقابل شکست عملی اور مضبوط اخلاقی بنیادوں پر کھڑی ہے کہ جو کوئی آپ ﷺ کے بارے میں کوئی منفی بات کرے گا وہ اپنا ہی منہ سیاہ کرے گا۔ چناں چہ انہوں نے جو کچھ اس سلسلے میں لکھا انیسویں صدی میں سرسید جیسے شخص نے اس کا علمی جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستشرقین کی ساری تحقیق تعصب، جانب داری اور علمی خیانت پر مبنی ہے۔ پھر انہوں نے رسول اللہ کی ذات کو چھوڑ کر حدیث رسول کو اپنا موضوع بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا علم حدیث انتہائی کم زور ہے اور یہ رطب و یابس کا مجموعہ ہے، جو بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق جمع کیا اور مسلمانوں نے عقیدت کی بنیاد پر اسے حدیث رسول ﷺ قرار دے دیا، ورنہ قرون اولیٰ میں تو ان کے جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا۔ لیکن جب اس پر بھی مسلمان علما اور متکلمین نے علمی و عقلی دلائل کے انبار لگا دیئے اور فن روایت و درایت سے ایک ایک حدیث کا صحیح ہونا اور اس کی سند کا مضبوط اور ثقہ ہونا ثابت کر دیا تو مستشرقین کو اندازہ ہوگیا کہ اس میدان میں بھی وہ ناکام ہیں، اس لئے کہ علم حدیث بھی انتہائی ناقابل شکست مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ اس پر ان کی بڑی تعداد نے اس موضوع کو بھی چھوڑ دیا اور دوسرے طریقے تلاش کرنا شروع کئے۔

بہ ہر حال مستشرقین کا عیسائی مبلغین سے انتہائی گہرا رابطہ ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ایسے ہی اگر آپ عیسائی حکم رانوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ عیسائی حکومتوں نے اس سلسلے میں پادریوں کو کتنی بڑی بڑی مالی امدادیں دی ہیں۔ ایک طرف تو سیکولرازم کا دعویٰ ہے، لیکن دوسری طرف اگر مسلمان بچی کے سر پر

Marfat.com

اسکارف نظر آجائے تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اسے اپنے دین کی شناخت کیوں ہونے لگی ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہے اور سیکولرازم کا دعویٰ سچا ہے تو پھر عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے گرجا کی یہ مالی امداد کس بات کا پتا دیتی ہے۔ کروڑوں، اربوں ڈالر کی امداد گرجا کے لئے اور مستشرقین کے اداروں کے لئے اس بات کا ثبوت ہے کہ عیسائی حکم راں، مستشرق اور مبلغ ایک ہی منصوبے پر باہم مل جل کر کام کر رہے ہیں اور وہ منصوبہ ہے مسلمانوں کو عیسائی بنانا۔ لیکن یہ بات بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدیوں سے اس سلسلے میں پوری کوشش کے باوجود وہ کام یاب نہیں ہوئے اور انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے سلسلے میں وہ اپنے اہداف میں کام یاب نہیں ہوئے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں کافی حد تک کام یاب ہوئے ہیں۔ اس میں جتنا حصہ عیسائیوں کی تبلیغ کا ہے اتنا ہی حصہ ہمارے عمومی نظام تعلیم کا ہے اور کسی حد تک ہمارے کم زور لوگوں کی کم زوری کا بھی حصہ ہے۔

تاہم اس بات کا جائزہ لینے کے لئے کہ مسلمان عیسائیت کی تبلیغ سے متاثر کیوں نہیں ہوئے اور آج سے دوسو برس قبل جس طرح وہ توقع رکھتے تھے کہ مسلمان متاثر ہوں گے، ان کی یہ توقع کیوں ناکام ہوئی، عیسائی مفکرین وقتاً فوقتاً اکٹھے ہوکر اور انفرادی طور پر اس پر غور وخوض کرتے رہے ہیں، چناں چہ اس سلسلے میں ایک کوشش ۱۸۶۰ء میں یعنی آج سے تقریباً کم وبیش ایک سو پچاس برس پہلے منعقد ہوئی۔ بعد میں بھی ایسے اجتماعات ہوتے رہے، جن میں دنیا بھر سے عیسائی مفکرین جمع ہوکر اس پر غور کرتے رہے کہ عیسائیت کی تبلیغ میں ناکامی کے اسباب کیا ہیں اور ان کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ بحث اور غور و فکر کے بعد انہوں نے قرار دیا کہ اس ناکامی کے تین اسباب ہیں۔ جب تک ان تین اسباب کو دور نہ کیا جائے وہ اپنے مقاصد میں کام یاب نہیں ہو سکتے۔

انہوں نے کہا کہ پہلا سبب تو عیسائی استعمار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عیسائی حکم راں کسی مسلمان ملک اور زمین پر قبضہ کرتے ہیں اور انہیں غلام بنا لیتے ہیں تو

Marfat.com

فطری طور پر غلام قوم کو فاتح اور استعماری قوم سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ نفرت انہیں عیسائی مذہب سے متعلق مثبت سوچ پیدا کرنے سے روکتی ہے، لہٰذا زمینوں پر قبضے کی بہ جائے حکم راں کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں اور وہ اقتصادی، مالی یا فکری غلامی کا راستہ ہوسکتا ہے۔

دوسرا بڑا سبب مسلمانوں کا ارتداد کے بارے میں عقیدہ اور قانون ہے کہ جب کوئی شخص ان میں سے مذہب تبدیل کرتا ہے، تو اسے وہ مرتد اور واجب القتل قرار دیتے ہیں، یہ قانون بھی عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ چناں چہ انہوں نے یہ کوشش کی مسلمانوں میں سزائے ارتداد کے بارے میں شبہات پیدا کیے جائیں اور اس سزا کو غیر معقول اور غیر انسانی قرار دیا جائے۔ مزید برآں دنیائے اسلام میں مرتد کی سزا کو ختم کرانے کے لئے اسے بنیادی انسانی حقوق کے خلاف قرار دیا جائے اور تبدیلی مذہب کو انسان کا بنیادی حق قرار دینے کے لئے ذہن سازی کی جائے۔

تیسرا سبب مسلمانوں کی مذہبی قیادت ہے یعنی جید علما اور ثقہ و مستند علما۔ لہٰذا ان کے خلاف نفرت پیدا کر کے ان کی جگہ ایسی جعلی مذہبی قیادت آگے لائی جائے جو مسلمانوں میں اپنے مذہب پر تصلب اور پختگی کو کم کرنے میں کام یاب ہو اور اس طرح عیسائیت کی راہ ہم وار ہو۔ ۱۸۶۰ء کے اس فیصلے کی روداد بعد میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئی اور اب اس کی روشنی میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقے اپنائے گئے۔ گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران ایسے کئی واقعات آپ کے سامنے گزرے ہوں گے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب سے راہ نمائی لے کر مسیحی مبلغین کس طرح کام کر رہے ہیں۔

بہ ہر حال اس اجلاس اور کانفرنس میں چند باتیں طے کی گئیں اور پھر پوری مسیحی برادری ان پر عمل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ پہلی بات تو اس سلسلے میں طے کی گئی کہ عیسائی حکم راں براہ راست کسی مسلم ریاست پر حکومت کرنے کی بہ جائے وہاں جمہوریت کے فروغ، وہاں کے عوام کو آمریت اور ملوکیت سے آزادی دلانے اور انہیں عالمی برادری کا حصہ بنانے کے دل فریب نعروں کے ساتھ مداخلت کریں گے اور وہاں کی مذہبی قیادت کو

Marfat.com

ختم کر کے وہاں بے دین قیادت کو مسلط کرنے کا کردار ادا کریں گے۔

دوسری بات یہ طے کی گئی کہ مسیحیت کے فروغ میں سلطنت عثمانیہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جہاں کہیں مسیحی مبلغین جاتے ہیں سلطنت عثمانیہ کے کارندے ان کے پیچھے پیچھے پہنچ جاتے ہیں اور سلطنت عثمانیہ ہر جگہ ان شخصیتوں اور اداروں کو مدد فراہم کرتی ہے جو عیسائیت کے رد میں لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کو ہر قیمت پر توڑا جائے اور مسلمانوں میں خلافت کے قیام کے لئے جو نظریہ ہے اس کو کم زور کیا جائے، اس طرح اس سلطنت کا جواز ختم ہو جائے گا، اور پھر جب سلطنت عثمانیہ ٹوٹ پھوٹ جائے تو مسلم دنیا کو چھوٹے چھوٹے ملکوں اور ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اس طرح ہر ریاست میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام آسان ہو جائے گا۔ چناں چہ اس پر عمل ہوا اور پوری مسیحی دنیا نے سلطنت عثمانیہ کو توڑنے اور مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے کا کام پوری قوت اور مشنری جذبے سے کیا۔

لیکن پھر بھی تیس چالیس برس تک مطلوبہ کام یابی حاصل نہ ہو سکی تو آج سے تقریباً تیس برس پہلے پھر ایک بڑا اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام اسلامی ممالک سے بہ طور خاص تین تین چار چار عیسائی مبلغ اور پادری مدعو کئے گئے اور ہر ملک سے متعلق الگ الگ مقالے لکھے گئے اور ان پر کئی روز تک بحث کی گئی اور ہر ملک کے حالات کا بہت غور سے مطالعہ کیا گیا، اور وہاں مسیحی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر تجاویز مرتب کی گئیں، یہ اجلاس چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس رپورٹ اور اجلاس کی کارروائی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا، لیکن کسی طرح اس کا ایک نسخہ ایک مسلمان کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اس کو شائع کر دیا۔ بل کہ اس کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کر کے ایک عرب عالم دین نے اسے عربی میں بھی شائع کر دیا۔ اس کتاب میں پاکستان سے متعلق مسیحیت کی تبلیغ کے لئے جو حصہ ہے اس کا خلاصہ میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

اس میں ایک بات تو یہ کہی گئی کہ پاکستان میں عیسائیوں کو معاشرتی اعتبار سے انتہائی کم تر سمجھا جاتا ہے اور ان کے کام کی وجہ سے انہیں چوڑھا کہا جاتا ہے، لہٰذا جب تک

Marfat.com

اس معاشرتی فرق کو ختم نہ کیا جائے عیسائیت کا فروغ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پھر بڑی بڑی کمپنیوں اور حکومتی اداروں اور درس گاہوں میں اعلیٰ مناصب پر عیسائی افراد کی تعیناتی کرائی گئی، تاکہ مسلمانوں کے دل سے عیسائیوں کے بارے میں پستی کا یہ تاثر ختم ہو، اور ان کو یہ احساس ہو کہ اگر کچھ عیسائی معاشرتی طور پر انتہائی کمزور ہیں تو کچھ عیسائی افراد اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں۔ اس سے وہ نفرت کم ہوگی۔

دوسری بات یہ سامنے لائی گئی کہ جب کوئی مسلمان عیسائی ہوتا ہے تو مسلمانوں میں اس کے خلاف انتہائی نفرت پیدا ہو جاتی ہے وہ مسلم معاشرے سے کٹ جاتا ہے، اور خاص طور پر انگریزی نام رکھنے سے اس کی مسیحی حیثیت بہت نمایاں اور واضح ہوتی ہے، پھر بھی اس کے ذریعے مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کا جو دروازہ کھلنا چاہئے تھا وہ نہیں کھل پاتا، لہٰذا طے کیا گیا اور اس پر عمل ہو رہا ہے کہ اب مسیحی اپنے بچوں کے نام بھی ہمارے عام ناموں سے ملتے جلتے رکھ رہے ہیں اور جب کوئی مسلمان عیسائی مذہب اختیار کرتا ہے تو یا تو اس کا سابقہ نام ہی برقرار رکھا جاتا ہے یا پھر معمولی سی تبدیلی کرائی جاتی ہے اور ایسا نام تجویز کیا جاتا ہے جس سے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ شخص مسلمان ہے یا عیسائی۔ اب پچھلے بارہ پندرہ سالوں سے اس طرح کے مشترک نام مثلاً پرویز یا داؤد، سلیمان وغیرہ رکھے جاتے ہیں جو مسلمانوں کے ہاں بھی رکھنے کا رواج ہے۔

تیسری بات یہ تجویز کی گئی کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا اپنا ایک تشخص ہے اور مذہب کے حوالے سے ہر مسلمان کی مسجد اور دینی زندگی سے ایک خاص طرح کی وابستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اگر چہ نماز نہ پڑھتا ہو۔ ربیع الاول اور اس طرح کی مذہبی تقریبات میں زور و شور سے شریک ہوتا ہے اور اس طرح اپنے مذہب کے ساتھ اس کی وابستگی مضبوط رہتی ہے۔ لہٰذا یہاں ایسی تقریبات کو فروغ دیا جائے جن میں مسلمان نوجوان عیسائیوں کو اپنے سے الگ سمجھنے کی بجائے ان کے ساتھ مل جل کر ان تقریبات میں حصہ لیں، چناں چہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ کئی سالوں سے عیسائی اپنے گرجوں کی مخصوص شکل سے ہٹ کر اس انداز سے انہیں تعمیر کرتے ہیں کہ پہلی نظر میں یہ فرق محسوس کرنا

Marfat.com

مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مسجد ہے یا گرجا۔ پھر اس پر گرجا کا بورڈ لگانے کی بہ جائے انبیا کے ناموں پر اسے ایک عبادت گاہ کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے۔

اسی طرح میں دیکھ رہا ہوں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا یوم ولادت ۲۵ ر دسمبر (حال آں کہ واقعاتی اعتبار سے یہ غلط ہے) لیکن عیسائی مذہب کی یہ ایک سالانہ تقریب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ایک منصوبہ بندی کے ساتھ ایک عیسائی مذہبی تقریب کی بہ جائے ایک قومی تہوار اور تقریب کے طور پر منانے لگا ہے اور اس میں مسلمانوں سے ہر طبقے کے لوگوں کو شریک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں قرب پیدا ہو۔ مذہبی دوری اور ثقافتی بعد کم ہو اور اس طرح ان میں عیسائیت کی تبلیغ کا راستہ کھل سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو تقریب ہے محبت کے نام پر ایک دن پھول پیش کرنے کی ایک خالص عیسائی تقریب ہے۔ اسے ویلنٹائن ڈے کہا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کسی مذہبی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں اور پھولوں کا تحفہ دیتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے ایام مسلمانوں کو بہ طور خاص نوجوانوں میں اپنے مذہب سے وابستگی کو کم اور کم زور کرنے کے لئے منائے جاتے ہیں، تا کہ آگے چل کر ان کو شکار کیا جائے۔ مسیحی دنیا کے ذمے دار یہ بات خوب سمجھتے ہیں کہ بڑے بوڑھے تو اپنے مذہب کے بارے میں حساس اور پختہ ہیں لہٰذا انہیں چھوڑ کر نوجوانوں پر محنت کی جائے۔

اس تمام صورت حال میں مسیحیت کی اس یلغار کا مقابلہ کرنے کے لئے جو کام کیے جانے انتہائی ضروری ہیں وہ میری رائے کے مطابق یہ ہیں:

ا۔ یہاں اس مرکز میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ایسے جید علما کی ایک ٹیم کو جو اسلامی علوم میں انتہائی پختہ اور مستند ہوں یہاں بٹھایا جائے۔ یہ ٹیم عیسائیت کا ہر اعتبار سے اور ہر پہلو سے گہرا مطالعہ کرے اور یہ جائزہ لے کر عیسائی کس کس انداز میں اور کس کس نام سے اپنا تبلیغی کام کر رہے ہیں۔ بہ طور خاص این جی اوز کی سرگرمیوں کا کڑی نظر سے جائزہ لے۔ مسلم رائے عامہ کو بیدار کرے اور مسلمانوں میں اپنے دین کے ساتھ لگاؤ اور مذاہب باطلہ کی سرگرمیوں سے متعلق شعور پیدا کرے۔

Marfat.com

۲۔ وہ اسلامی عقائد و تعلیمات جن کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا عیسائیت کا دوسو برس سے مشن ہے۔ ان پر عام فہم زبان میں لٹریچر تیار ہو اور اسے عام کیا جائے۔

۳۔ عیسائیت کے رد میں جو کام دنیا میں کہیں بھی ہوا ہو اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ میں یہاں یہ بتادوں کہ عرب دنیا میں اس سلسلے میں بڑا ٹھوس اور علمی کام ہوا ہے اسے یہاں اردو میں منتقل کرنا اسے عام کرنا اور جہاں جہاں عیسائی مذہبی کام زیادہ ہے ان علاقوں میں اسے پھیلانا نہایت ضروری ہے۔ دنیائے اسلام میں جتنا کام اس سلسلے میں ہوا اسے یک جا کر کے اسے عام کرنا از حد ضروری ہے۔ اس باب میں ماضی میں بھی بہت کام ہوا اور حال میں بھی۔ ان علاقوں میں اسے عام کیا جائے جن علاقوں میں عیسائی مبلغین کا کام زیادہ ہے۔ مثلاً سیالکوٹ، گوجراں والہ، شیخوپورہ اور لاہور وغیرہ میں۔ اسی طرح جائزہ لیا جائے جن اضلاع میں عیسائیت کا کام زیادہ ہے وہاں ردعیسائیت پر ہونے والے کام کو عام کیا جائے۔

۴۔ ایک اور کام جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کے لئے بڑے وسائل درکار ہوں گے، تاہم اگر اس کا اہتمام کرلیا جائے تو یہ بہت بڑی پیش رفت ہوگی کہ جن علاقوں میں عیسائی مبلغین کا کام زیادہ ہے وہاں سے تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے علمی ذوق رکھنے والے نوجوانوں کو یہاں جامعہ اسلامیہ میں لایا جائے اور انہیں تربیتی کورس مختلف مدت کے کرائے جائیں، عیسائیت کا گہرا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے، اسلام کی حقانیت اور ردعیسائیت کے دلائل کی تیاری کرائی جائے اور یہ نوجوان پھر اپنے علاقوں میں جاکر عیسائی مبلغین کا علمی مقابلہ کریں اور ان کی تبلیغ کا راستہ روکیں۔

میں اس سلسلے میں مولانا عبدالرؤف فاروقی کو اور ان کے رفقا کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آج اس ادارے کو جس عظیم کام کا مرکز بنانے کا بیڑہ انہوں نے اٹھایا ہے اللہ تعالیٰ اس میں انہیں کامیاب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

مسیحیت کے بین الاقوامی عزائم

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی۔ اسلام آباد

۱۹۹۸ء

Marfat.com

مسیحیت کے بین الاقوامی عزائم

مسیحیت کے بین الاقوامی عزائم ایک ایسا وسیع اور طویل موضوع ہے جس پر کسی ایک لیکچر کی نہیں بل کہ لیکچروں کے ایک طویل سلسلے کی ضرورت ہے، جب جا کر یہ مضمون کما حقہ پورا ہوسکتا ہے، اور اس کے مختلف گوشوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن بہت اختصار کے ساتھ دنیائے اسلام کے مختلف مما لک کی صرف مثالیں دیتے ہوئے میں یہ عرض کرنے کی کوشش کروں گا کہ عیسائی مشنریز جو دنیا بھر میں کام کررہی ہیں ان کے سامنے کیا عزائم ہیں، جن جن چیزوں کے وہ دعوے دار ہیں کیا وہ دعوے درست ہیں؟ اور کیا وہی ان کے مقاصد ہیں یا ان کے علاوہ ان کے اور مقاصد بھی معلوم ہوتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ دنیائے اسلام میں عیسائی مشنریز کی سرگرمیاں نئی نہیں ہیں، پچھلے کئی سو سال سے دنیائے اسلام میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں، جب دنیائے اسلام میں استعمار کی کوشش شروع ہوئی، یعنی Colonilation کا سلسلہ شروع ہوا تو اس سے پہلے دنیائے اسلام میں مسیحی سرگرمیاں شروع ہوچکی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان میں بڑی تعداد میں مشنریز آچکی تھیں۔ اکبر کے دربار میں عیسائی مشنریز آئے تھے، اور کسی وجہ سے اکبر اور جہانگیر جیسے حکم رانوں نے اجازت دے دی کہ وہ ہندوستان میں اپنی سرگرمیاں منظم کریں۔ اس زمانے میں تاجر مسیحی مشنری یہ دونوں اس طرح مل جل کر کام کررہے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقاصد کو بڑھا رہے تھے، تاجر جب اپنی پیش رفت کرتے تھے تو عیسائی مشنریز کے کام میں مدد ملتی تھی۔ عیسائی مشنریز اپنے کام کو جتنا منظم کرتے تھے اس سے تاجروں کے کام میں مدد ملتی تھی۔ اور اس طرح ہوتے ہوتے تقریباً دو سو ڈھائی سو سال کا زمانہ ایسا گزرا کہ تجارت اور مشنری سرگرمیاں

Marfat.com

دونوں ایک ساتھ چلیں اور جہاں جہاں انگریزوں کی تجارت منظم ہوتی گئی وہاں عیسائی مشنریز بھی بہت زیادہ فعال اور مضبوط ہو گئیں۔

چناں چہ اگر آپ نے اس دور میں عیسائی مشنریز کی یا عیسائی سرگرمیوں کی تجارتی سرگرمیوں کی تاریخ دیکھی ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ ساحلی علاقوں میں پھیلایا۔ ساحلی علاقوں میں ان کے پاس بڑی مضبوط بحری طاقت تھی، پوری دنیا پر ان کا کنٹرول اسی بحری طاقت کے ذریعے تھا، اور اسی بحری طاقت کے بل پر ان کے لئے بڑا آسان تھا کہ وہ ایسے علاقوں میں آسانی سے جاسکیں جو ساحلی علاقوں میں ہیں، اور اگر انہیں وہاں کوئی خطرہ درپیش ہو تو اپنی بحری طاقت کے ذریعے وہاں سے فرار بھی ہو سکیں۔ چناں چہ انہوں نے بمبئی میں، سورت میں، مدراس میں، کلکتے میں، کراچی میں، سنگاپور میں، ملایا میں، گانا میں اپنی سرگرمیاں منظم کیں۔ آپ پوری دنیائے اسلام کا نقشہ لیں تو سب سے زیادہ مسیحی سرگرمیوں کی تنظیم آپ کو ساحلی علاقوں میں ملے گی۔ اور ان ساحلی علاقوں میں ملے گی جو بڑے تجارتی مراکز تھے، یا بعد میں بڑے تجارتی مراکز بن گئے۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی سادہ لوحی، ناعاقبت اندیشی، بے وقوفی، مفادات یا کسی اور سبب سے، ہم نہیں کہہ سکتے، اللہ کو معلوم ہے کیا اسباب تھے لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اسی طرح عیسائی مشنری سرگرمیوں سے غفلت برتی، جیسے آج بہت سی چیزوں سے وقتی مفاد کی خاطر ہمارے ہاں غفلت برتی جارہی ہے۔ فوری، چند ٹکے کے مفاد کی خاطر وہ مراعات عیسائی مشنریوں کو دی گئیں جس کے نتائج آج ہم سب بھگت رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کسی بادشاہ کی کوئی عزیز خاتون بیمار ہو گئیں، جہانگیر کے سرکاری حکیموں نے علاج کیا اور وہ ٹھیک نہیں ہوا، تو ایک انگریز ڈاکٹر نے ان کا علاج کیا، اور اس کو صحت ہو گئی۔ صحت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس میں عقیدے کی کمزوری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن جہانگیر نے خوش ہو کر اجازت دے دی کہ آپ جہاں چاہیں تجارت کریں، اور انہیں پوری طرح اس بات کی اجازت دے دی کہ جہاں جہاں جی چاہے جائیں۔

چناں چہ ہندوستان کے اندرونی مراکز میں لکھنو میں، دہلی میں، آگرہ میں، ان

Marfat.com

کو تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ انہوں نے تجارتی مراکز بنائے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جہانگیر کے زمانے میں بڑی بڑی حویلیاں، کوٹھیاں اور مراکز بنا لئے۔ بادشاہ کی طرف سے اجازت ہو، اور مسلمان کم زور ہوں، مالی مفادات کی اسی طرح لالچ رکھتے ہوں جس طرح آج ہمارے حالات ہیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور انگریزوں کے پاس مال و دولت کی نہ اس وقت کمی تھی نہ آج ہے۔ عیسائی مشنریز نے ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے ہندوستان میں اپنا جال پھیلا دیا۔ اورنگ زیب عالم گیر کو اس کا احساس ہوا کہ یہ سلسلہ بڑا غلط ہے، اس نے ان کی تجارتی کوٹھیاں چھین لیں، آپ نے فرنگی محل کا نام سنا ہوگا، فرنگی محل لکھنو میں ایک بہت بڑی حویلی تھی، جو انگریزوں کو جہانگیر نے دی تھی، اور اسی لئے فرنگی محل کہلاتی تھی، اورنگ زیب نے وہ حویلی ان سے چھین لی اور وہ بعض علما کو دے دی کہ آپ دینی مدرسہ قائم کر لیں، چناں چہ فرنگی محل کے نام سے علما کا جو طویل سلسلہ ہے یہ اسی تجارتی کوٹھی میں قائم ہوا تھا، جو جہانگیر نے انگریزوں کو دی تھی اور اورنگ زیب نے ان سے چھین کر لکھنو کے علمائے کرام کو دے دی تھی۔ اس میں سو، سوا سو سال تک ایک بڑا دارالعلوم قائم رہا، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، عبدالحیٔ فرنگی محلی سمیت علما کا طویل سلسلہ اس سے پیدا ہوا۔ اس چھوٹے سے تمہیدی مقدمے سے یا ابتدائی گزارش سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہمارے اس برصغیر میں خاص طور پر عیسائی مشنریز کی آمد کوئی نئی بات نہیں ہے، بل کہ پچھلے تین ساڑھے تین سو سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور مختلف حکم رانوں نے مختلف اوقات میں بہت تھوڑے مفاد کی خاطر یا سادہ لوحی کے سبب عیسائی مشنریز کو جو مراعات دیں ان کے نتیجے میں یہ چیز پھیلتی چلی گئی۔

جیسے جیسے انگریز کے قدم ہندوستان میں پھیلتے گئے عیسائی مشنری سرگرمیاں مرتب اور منظم ہوتی گئیں۔ صرف ہندوستان میں نہیں بل کہ دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں ایسا ہی ہوا، یہاں تک کہ افریقہ میں ایک لطیفہ مشہور ہے اور افریقی باشندے اس کو بہت کثرت سے بیان کرتے ہیں کہ جب انگریز یہاں آیا تو زمین ہمارے ہاتھ میں تھی اور کتاب اس کے ہاتھ میں تھی، یعنی بائبل، اور انگریز جب یہاں سے گیا تو کتاب ہمارے

Marfat.com

ہاتھ میں تھی اور زمین انگریز کے ہاتھ میں تھی، گویا انہوں نے ہمیں عیسائی بنادیا اور ہماری زمینوں پر اور جائیدادوں اور مال و دولت پر قبضہ کرلیا۔ یہ پورے افریقہ میں ہوا، افریقہ کے بیشتر حصوں پر کئی سو سال انگریز قابض رہے، اور بعض علاقے تو ایسے تھے کہ انہوں نے اس کو تقریباً گوروں کا ملک تصور کر کے کالوں کو انہوں نے وہاں سے نکال دینے کی کوشش کی، یا کالوں کو انہوں نے اس طرح سے مٹا دینا چاہا کہ وہ کبھی بھی ان کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوسکیں، چناں چہ ساؤتھ افریقہ، زمبابوے وغیرہ یہ سب علاقے وہ تھے جن پر انگریزوں، گوروں کی لاکھوں کی آبادیاں ہیں اور ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ہم یہاں مستقل حکم راں رہیں گے، چناں چہ چار سو سال وہ ساؤتھ افریقہ پر حکم راں رہے، ساڑھے تین سو پونے چار سو سال روڈیشیاں میں حکم راں رہے جس کا نام اب بدل کر زمبابوے کردیا گیا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اس پورے علاقے میں اکثریت کو انہوں نے عیسائی بنالیا۔ جہاں جہاں عیسائی حکم راں ہوئے وہاں افریقی اکثریت عیسائی ہوگئی، اس لئے کہ ان کا کوئی مذہب نہیں تھا، ان کے سابقہ مذاہب میں کوئی جان نہیں تھی، کوئی تہذیب نہیں تھی، تمدن نہیں تھا، تعلیم نہیں تھی، اس لئے بہت جلد ہی عیسائی مشنریز نے ان کو اپنے دام میں لے لیا اور وہ عیسائی ہوگئے۔

لیکن مسلم ممالک میں انہیں کام یابی نہیں ہوئی اور کہیں بھی انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کوئی بھی مسلم ملک ایسا نہیں تھا، جہاں انہیں ایک فی صد یا ایک فی ہزار بھی کام یابی ہوئی ہو، بل کہ ایک فی دس ہزار کے تناسب سے بھی انہیں کام یابی نہیں ملی۔ ان پورے تین سو سال میں ایسا نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں سے انہوں نے کسی کو عیسائی بنایا ہو۔ اس بارے میں جتنے دعوے ہیں وہ سب کے سب یا تو مبالغے پر مبنی ہیں یا جھوٹ پر مبنی ہیں یا مسلمانوں کے خوف کی پیداوار ہیں کہ جی سندھ میں انہوں نے دس لاکھ مسلمانوں کو عیسائی کرلیا۔ وہ نہ تو دس ہزار کو عیسائی کرسکے، نہ دس کو، سب غلط ہے انہوں نے کسی کو عیسائی نہیں بنایا۔ اِکا دُکا واقعات کہیں ہوئے ہوں گے لیکن اکثر و بیشتر نہیں ہوئے، نہ ان کے ذہن میں مسلمانوں کو عیسائی بنانا ہے، یہ ان کے ذہن میں صاف ہے کہ مسلمانوں کو بڑی تعداد

Marfat.com

میں عیسائی نہیں بنا سکتے ۔ کم از کم اب تک مسلمانوں کی تعلیم اور دینی حمیت کی وجہ سے صورت حال یہی ہے، آئندہ کیا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے ۔

لیکن عیسائیوں کے ذہن میں کیا ہے، وہ ایسا کس مقصد کے تحت کرتے ہیں، وہ کیوں ہندوستان میں تین سو سال سوا تین سو سال سے اپنے وسائل اور دولت کو ضائع کر رہے ہیں ۔ پوری پوری عمریں انہوں نے لگا دی ہیں، اور جتنے انہاک سے اور جتنے خلوص سے کام کر رہے ہیں اس کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی ۔ مسلمانوں میں شاید پاکستان میں ایک بھی ایسا آدمی نہ ملے، شاید بھی میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں ورنہ بہ ظاہر یقینی طور پر ایسا ہی ہے کہ ایک بھی ایسا آدمی نہ ملے جو لاہور، کراچی، فیصل آباد، ملتان، پشاور کسی بڑے شہر کو چھوڑ کے اور سندھ کے ریگستان میں جا کر کسی جھونپڑی میں بیٹھ جائے اور ۵۰ سال زندگی کے وہاں اسلام کی تبلیغ میں گزار دے، اور روکھی سوکھی کھائے اور مزدوری کرے، بکریاں پال کر اپنا پیٹ پالے ۔ کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی مثال پاکستان میں، مصر میں، انڈونیشیا میں سعودیہ میں کوئی نہیں ہے کہ تبلیغ اسلام کے لئے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی نے جو ایم اے پاس ہو، بی اے ہو، بڑا مشہور ہو، معروف آدمی ہو، کسی بڑے شہر میں اس کی پکی ملازمت لگی ہوئی ہو مگر اس نے ملازمت کو چھوڑ کے تھر پارکر میں رہائش اختیار کر لی ہو، یا وہ چولستان کے صحرا میں چلا گیا ہو، یا قلات کے قریب کسی گاؤں میں چلا گیا ہو اور وہاں جا کر اس طرح دعوت اور تبلیغ سے وابستہ ہو گیا ہو کہ اس نے باقی سب کچھ چھوڑ دیا ہو ۔ ایسا کوئی نہیں ملے گا، لیکن پاکستان میں درجنوں نہیں سیکڑوں ایسے عیسائی مشنریز ملیں گے جو نہ صرف پاکستان میں اور دنیا کے ہر گوشے میں ہزاروں کی تعداد میں لاکھوں کی تعداد میں ہے کہ جنہوں نے زندگیاں قربان کر دیں ۔ اپنے پچاس پچاس سال، چالیس چالیس سال ایک دیہات میں بیٹھے گزار دیئے ۔

چند برس پہلے ہمیں سندھ جانے کا موقع ملا ۔ تھر پارکر کے ایک علاقے میں کینیڈا کے ایک پادری کے بارے میں علم ہوا کہ اس نے ۴۵ سال، یا ۴۸ سال ایک دیہات میں گزار دیئے اور دیہات کے ہندوؤں کو اس نے عیسائی بنایا، عیسائیوں کے گاؤں اس نے

Marfat.com

آباد کیے ، ایک گرجا بنایا اور وہیں سڑک کے کنارے وصیت کی کہ مجھے یہاں دفن کر دیا جائے اور قبر پر بائبل کا کوئی جملہ لکھنے کی وصیت کی تاکہ ہر گزرنے والا اس کو دیکھے۔ اب اس کا بیٹا یا اس کی اولاد اسی طرح سے گاؤں میں آباد ہے۔ جب کہ ہم میں سے کوئی آدمی ایک دن بھی وہاں گزارنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا کہ صرف دینی دعوت کے نقطۂ نظر سے وہاں وقت گزار سکے اور اسلام کی دعوت ان تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

میں اپنے آپ کو بھی کہتا ہوں، میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا، ہم سب کو اعتراف کرنا چاہئے کہ دین کا علم رکھنے والوں نے یا دعوت دین کے مقصد سے دل چسپی رکھنے والوں نے اتنی قربانی دینے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا، ایسا کیوں ہے؟ اس کے پیچھے کیا محرک ہے۔ یقیناً اس کا محرک گہرا مذہبی جذبہ ہے لیکن اس کے باوجود کے پچھلے ساڑھے تین سو سال میں مسلمانوں سے عیسائی ہو جانے والوں کی تعداد بڑی تھوڑی ہے۔

یہ کیوں اتنے تسلسل کے ساتھ اور ارتکاز کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اس پر غور کریں، ان کی تحریریں دیکھیں جو وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں تو اس کے دو بڑے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں بسنے والے ان غیر مسلم کو جو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے زیادہ مقام اونچا نہیں رکھتے عیسائی بنایا جائے اور عیسائی بنانے کے لئے ان کو یہ تاثر دیا جائے کہ ان کا معاشرتی مقام عیسائی بن کر بلند ہو جائے گا، کم از کم وہ گوروں کے ساتھ، عیسائیوں کے ساتھ برابر کی سطح پر سمجھے جانے لگیں گے۔ اس طرح سے ان کو عیسائیت کے دائرے میں داخل کیا جائے۔ یہ چیز بڑی کامیابی کے ساتھ ہندوستان میں، پاکستان میں، بنگلہ دیش میں عیسائیوں نے کی ہے۔

یہاں آپ کو معلوم ہے کہ ہندوؤں میں طبقاتی نظام تھا اور چار بڑے طبقات تھے جن کے سارے حقوق تھے، ان چار طبقات سے نیچے بغیر طبقے کے جو لوگ تھے جنہیں اچھوت کہتے ہیں جن کا کوئی طبقہ نہیں تھا، افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں بھی اس طبقے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اس طبقے میں قبول اسلام کے لئے کوئی کام نہیں کیا، اور اگر کیا تو وہ قابل ذکر نہیں تھا، اس لئے نتیجہ خیز نہیں ہوا اور وہ طبقہ

Marfat.com

اسی طرح ایک ہزار سال تک پستا رہا۔ مسلمانوں نے بھی اسے پیسنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں میں دیکھا کہ ان کے ہاں چار گروہ تھے، ایک برہمنوں کا تھا ایک کھتریوں کا تھا، ایک ویشوں کا تھا ایک شودروں کا تھا، یہ چار طبقات انہوں نے دیکھے تو مسلمانوں نے بھی اپنے کچھ اور طبقات بنا دیئے۔ یہ سادات کا طبقہ ہے، اور یہ شیخوں کا طبقہ ہے، یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ اور اسی طرح سے انہوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں کے متعلقہ طبقے سے Identify کرلیا، یہ مغل ہے، یہ پٹھان ہے، چار بڑے گروہ برصغیر میں مسلمانوں کے بنا کر انہوں نے اور ہندوؤں کے اعلیٰ طبقوں نے مل کر شودروں کو اسی طرح محکوم رکھا، اسی طرح سے پیسا جس طرح ہندو پستے چلے آرہے تھے، اس لئے اس طبقے میں اسلام کے لئے مسلمانوں کے لئے کوئی ہم دردی کا جذبہ نہیں پایا جاتا تھا، لیکن جب عیسائی مشنریز آئے انہوں نے سب سے زیادہ اس طبقے پر کام کیا۔

آپ دیکھیئے پاکستان میں آج جتنا بھی خاک روبوں کا طبقہ کہلاتا ہے یہ سارا کا سارا وہی ہے جو اچھوت ہے اور جسے ہندوؤں نے دبا کر رکھا تھا، مسلمانوں نے بھی اپنے حکم رانی کے دور میں ان کی حالت پر توجہ نہیں دی تھی اور عیسائیوں نے ان سب کو عیسائیت میں داخل کرلیا۔ یہی چیز پاکستان میں بھی نظر آئے گی، بنگلہ دیش میں نظر آئے گی، سوڈان میں نظر آئے گی۔ یہی چیز دنیائے اسلام کے بیشتر علاقوں میں نظر آئے گی کہ غیر مسلموں کا وہ طبقہ جو معاشرتی اعتبار سے کم زور تھا اس کو انگریزوں نے سر پرستی فراہم کی اور اس سر پرستی کے نتیجے میں ایک قابل ذکر تعداد عیسائیوں کی پیدا ہوگئی۔ یہ کام بڑی آسانی کے ساتھ خاموشی کے ساتھ کئی سو سال میں ہوا ہے، آج عیسائیت کی آبادی پاکستان میں کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم لیکن جتنی بھی تعداد ہو تین چار فی صد سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ تین چار فی صد اگر چہ تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن بہ تدریج ان کا جو اجتماعی اور سیاسی رول ہے وہ تیزی کے ساتھ بڑھایا جا رہا ہے، صرف پاکستان میں نہیں بل کہ پاکستان، سوڈان، لبنان، عراق، سینٹرل ایشیا، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ان علاقوں میں عیسائی اقلیت کو بڑی تیزی کے ساتھ ترقی دی جارہی ہے، اور بڑی تعداد میں اس پر وسائل صرف کئے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

آج سے اگر ۲۵ سال پہلے کے حالات اگر آپ کو یاد ہوں، اور آپ اپنی یاد داشت ذہن میں تازہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ۲۰،۲۵ سال پہلے عام سا عیسائی اتنا زیادہ پرجوش اور اتنا زیادہ سرگرم یا جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ Offensine نہیں تھا، اس کے مزاج میں جارحیت نہیں تھی، جو آج معلوم ہوتی ہے، یہ کیوں تھا؟ برصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ہوتا رہا، اسی جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔ پھر پاکستان بننے کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ جداگانہ انتخاب کے نظام کو باقی رکھا جائے یا مخلوط جاری کر دیا جائے تو بنگلہ دیش کے ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ مخلوط کر دیا جائے، باقی سب کا مطالبہ تھا کہ جداگانہ ہونا چاہئے، حتیٰ کہ عیسائیوں کا مطالبہ بھی یہی رہا اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے، اسمبلی کی دستاویزات میں موجود ہے، ان کی اپنی تحریروں میں موجود ہے اور اس موضوع پر عیسائی دانش وروں کی کتابیں موجود ہیں کہ جداگانہ انتخاب ہونا چاہئے، اس معاملے میں ان کا رویہ بڑا نرمی کا، بڑا ٹھنڈا رویہ تھا۔

اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں جارحیت پیدا ہو رہی ہے، یہ کیوں پیدا ہو رہی ہے، اس طرح کے مطالبے کہ شناختی کارڈ میں مذہب کا نام ہم نہیں لکھیں گے اور اس پر دھمکی کہ ہم پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، یہ سب کسی بڑی طاقت کے ایما کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی گاؤں کا چار خاندانوں پر مشتمل خاک روبوں کا چھوٹا گروہ جو مسلمانوں کے کسی گاؤں میں رہتا ہو، ہزار سال سے وہاں محکوموں کی زندگی گزار رہا ہو، اگرچہ میں کبھی بھی یہ نہیں کہتا کہ ان کے ساتھ ہمارا جو رویہ تھا صحیح تھا، لیکن جو حقیقت تھی آپ کے سامنے ہے کہ کبھی بھی کسی خاک روب کو چارپائی یا کرسی پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، گاؤں کے آدمیوں کے مقابلے میں ہمیشہ زمین پر بیٹھتے تھے، آج اچانک وہ کھڑا ہو کر گاؤں کے چودھری کو چیلنج کرے، اور کہے کہ میں تمہاری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور پوری دنیا اس اعلان پر ہل جائے۔ یہ آخر اچانک تو نہیں ہوتا، ایسا کسی کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیچھے کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوا، اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہئے۔

Marfat.com

آج کل دنیا میں بہ ظاہر سیکولرازم کا بڑا چرچا ہے اور ہمارے نالائق نااہل اور جاہل حکم راں اور بااثر لوگوں کا طبقہ جنہیں حالات کا کچھ پتہ نہیں، جنہوں نے کبھی دنیا کے معاملات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں واقعی سیکولرازم کا بڑا چرچا ہے اور واقعتاً مغربی دنیا سیکولرازم کی علم بردار ہے، اور مذہبی معاملات میں وہ غیر جانب دار ہے۔ انہوں نے ہمارے بااثر طبقے کو سیکولرازم کا ترجمہ بتایا ہے، مذہبی غیر جانب داری، حال آں کہ اس کا یہ مفہوم کبھی ہوگا، لیکن اگر آج یہ مفہوم مان لیا جائے تو مغرب ایک منٹ کے لئے بھی غیر جانب دار نہیں ہے، وہ انتہائی تعصب کے ساتھ عیسائیت کے معاملے میں جانب دار ہے، اور انتہائی متعصبانہ انداز سے اسلام سے دشمنی کے وہ تمام مظاہر اور شرائط وعناصر اس میں موجود ہیں جو ایک انتہائی متعصب انسان میں ہوسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے سیاست دانوں کے بااثر طبقے نے اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ لیا کہ ایک جدید انسان کو مذہبی غیر جانب دار ہونا چاہئے، لہٰذا وہ غیر جانب دار ہے، اس کی نظر میں آپ اور آپ کا اسلام اور ایک اپنے مذہب سے جاہل کی عیسائیت سب برابر ہے، وہ آپ کو ایک سطح پر رکھے گا، بل کہ وہ عیسائی کو زیادہ اہمیت دے گا، اس لئے کہ اس کے پیچھے انگریز ہے اور آپ کے ساتھ اس کا رویہ ایک غیر ہم دردانہ نہیں بل کہ ایک طرح کا معاندانہ ہوگا، اس کا اگر تجربہ کرنا چاہیں تو آپ کر کے دیکھ لیں کہ کسی عیسائی کے خلاف جاکر پولیس میں رپورٹ درج کروائیں کہ اس نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہے، صرف آپ جاکر سادہ سی شکایت درج کروائیں، آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ یہاں کے بااثر طبقوں کا رویہ آپ کے بارے میں کیا ہے۔ پوری حکومت آپ کی، پولیس آپ کی، عدالت آپ کی، سارے کے سارے جتنے بھی ادارے ہیں وہ اس کا ساتھ دیں گے اور آپ کو مجرم سمجھیں گے، آپ کو جان بچانا، عزت بچانا مشکل کردیں گے۔ پاکستان کے جس گوشے میں جائیں تجربہ کرکے دیکھ لیں، یہاں کسی عیسائی کی مسلمان اگر نکسیر بھی پھوڑ دیں کہ اس نے توہین رسالت کی ہے، اس جرم میں اگر کوئی عام مسلمان شہری جذبات میں آکر اسے پتھر ماردے، دھکا دے دے، اور اس کے نتیجے میں دیوار سے اس کی ناک لگ جائے، اور

Marfat.com

نکسیر پھوٹ جائے تو اگلے دن پوری دنیا اس طرح ہلتی ہوئے نظر آئے گی کہ جیسے پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کا قتل عام بھی کر دیں، ابھی ۲۴ بچوں کو چینی گورنمنٹ نے مارڈالا، آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا، لیکن کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی، کسی اخبار میں، کسی معروف چینل پر بی بی سی اور سی این این پر کسی چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی آپ نے نہیں دیکھی۔ ۲۴ بچے، ۱۲، ۱۳، ۱۴ سال کے، اور انہیں کھڑے کر کے گولی سے ماردیا، لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اگر پاکستان کے کسی گاؤں میں دیہات میں سیالکوٹ میں گوجراں والہ میں کسی عیسائی کی نکسیر پھوٹ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے، اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں، یہ روز کے مشاہدات ہیں۔

قابل غور امر یہ ہے کہ یہ سب محض اتفاق نہیں ہے، دنیا میں کوئی چیز اتفاق سے نہیں ہوتی بل کہ ہر چیز کے پیچھے ایک سلسلہ اسباب ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسباب ونتائج اور علت ومعلول کے سلسلے سے منسلک کیا ہے، ہر واقعے کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں اور ہر واقعے کے نتائج ہوتے ہیں، کوئی واقعہ ہو اور آپ یہ سمجھیں کہ اس کے اسباب نہیں تھے، یہ بالکل غلط بات ہے۔ ہر واقعے کے پیچھے اسباب تھے اور نتائج ہوتے ہیں۔ وہ نتائج کیا ہیں، مسلمانوں میں افسوس کہ ہم نے نہ کبھی دیکھا کہ اس کے واقعے کے پیچھے اسباب کیا تھے، کب سے اس واقعے کے اسباب تیار کیے جارہے تھے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے، ہم یہ کبھی نہیں سوچتے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے حکم رانوں کو اس سے دل چسپی رہتی ہے کہ اگر کوئی ہنگامہ ہو گیا اور ۵۰ سو ادھر کے آگئے اور ۵۰ سو ادھر کے آگئے، تو معاملے کو ختم کر دیا جائے، اور کوئی گولی وغیرہ نہ چلے، امن وسکون رہے۔ لیکن اس کے پیچھے کیا ہو رہا ہے، ان کے کیا عزائم ہیں کیا ارادے ہیں، اس پر کوئی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، نہ کسی کو دل چسپی ہے، نہ کسی کے پاس وقت ہے نہ کسی میں اتنی صلاحیت ہے کہ ان مسائل پر غور کرے، ان کو سوچے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

میں ایک چھوٹی سی مثال آپ کو لبنان سے دوں گا، لوگ تاریخ پڑھتے ہیں لیکن سبق نہیں لیتے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

Marfat.com

ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار (۱)

تاریخ عبرت کے لئے ہے۔

اور تاریخ کو ہر جگہ عبرت کہا گیا ہے

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب (۲)

ان واقعات میں عبرت ہے عقل والوں کے لئے۔

تو اگر تاریخ میں عبرت ہے، جیسا کہ یقیناً ہے تو پھر تاریخی واقعات کو آپ دیکھ لیں۔

لبنان ایک چھوٹا سا ملک ہے اور اتنا چھوٹا کہ اگر چھوٹا نقشہ ہو تو روئے زمین پر نظر بھی نہ آئے لیکن دنیا کے خوب صورت ترین مقامات میں سے ایک ہے، اور روایتی طور پر شام کا ایک حصہ تھا، وہ کبھی بھی الگ ملک نہیں تھا، شام میں ایک پہاڑ کا نام لبنان تھا، لیکن عیسائی مشنریز نے وہاں تقریباً ڈھائی سو سال پہلے سے کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا، شام میں ہمیشہ مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے۔ شامی مسلمانوں کی دینی حمیت اور دینی روایات پر پختگی ہمیشہ سے مشہور ہے۔ بڑے بڑے اہل علم، علما صلحاء بڑے بڑے محدثین سب شام میں پیدا ہوئے، لیکن ڈھائی سو سال پہلے تین سو سال پہلے وہاں عیسائی مشنریز نے کام کرنا شروع کیا اور اور آہستہ آہستہ ایسے طبقات جو مسلمانوں میں برابر کی سطح پر نہیں مانے جاتے تھے ان کو عیسائیت میں داخل کرنا شروع کیا۔ ڈھائی سو سال کے دوران باہر کے عیسائی بھی وہاں آکر بستے گئے۔ وہاں بسنا اس لئے آسان تھا کہ لبنانی باشندے بھی خوب صورت گورے ہوتے ہیں عیسائی یورپ سے آنے والے بھی گورے ہوتے ہیں، تو لونی التزام کی وجہ سے باہر سے آنے والوں کا پتہ نہیں چل سکتا۔ پاکستان میں، سندھ میں اگر باہر سے لاکر سو انگریزوں کو بسا دیں تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ انگریز ہیں، پتہ چل جائے گا کہ یہ باہر سے آیا ہے، البتہ لبنان جیسے علاقے میں ۲۵، ۳۰ سال کے بعد پتہ نہیں چلے گا کہ فلاں کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

۱۔ آل عمران: ۱۳

۲۔ یوسف: ۱۱۱

Marfat.com

اس طرح عیسائی مشنریز نے عیسائیوں کو باہر سے آہستہ آہستہ لاکر یہاں بسانا شروع کیا۔ آس پاس کے قرب وجوار سے مصر سے لبنان سے شام سے عراق سے ترکی سے جو عیسائی ہوتا گیا اسے لاکر بساتے گئے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان میں عیسائیوں کی آبادی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ۲۵، ۳۰ فی صد ہوگئی۔ جب یہ ہوگیا تو انہوں نے لبنان کو ایک الگ ملک بنادیا اور الگ ملک بنانے کے بعد اس ملک میں اختیارات کی تقسیم یہ کی کہ اس میں اتنے فیصد عیسائی ہوں گے، اتنے فی صد شیعہ ہوں گے، اور اتنے فی صد سنی مسلمان ہوں گے، اور ان کے درمیان تقسیم کار یہ ہوگی کہ صدر مملکت ہمیشہ عیسائی ہوگا وزیر اعظم شیعہ ہوا کرے گا یا سنی مسلمان، اور پارلے منٹ کا اسپیکر فلاں مسلمان ہوا کرے گا۔ اس طرح عملاً انہوں نے لبنان کو ایک عیسائی مملکت بنادیا۔

اس کے بعد عیسائیوں کی جتنی بھی مشنریز سرگرمیاں عرب دنیا میں ہیں وہ ساری کی ساری لبنان سے منظم ہوتی ہیں۔ امریکن یونی ورسٹی بیروت کی وہاں ہے، جتنے عیسائی یونی ورسٹی، کالج اور اسکول لبنان میں بنے اتنے عرب دنیا میں نہیں بنے، اور وہاں سے بیٹھ کر انہوں نے پوری دنیا میں مسلم دنیا میں، عرب دنیا میں سیکولر ازم اور لامذہبیت اور عرب نیشنل ازم کو فروغ دیا۔ سب سے زیادہ عرب نیشنل ازم پر اور مسلم امت کے تصور کے خلاف جو لٹریچر چھپا، وہ ۹۰ فی صد لبنان سے چھپا، اور عیسائی پادریوں کے ہاتھوں چھپا، عربی ادب کے نام پر، قصے کہانیوں کے نام پر، لٹریچر کے نام پر، کہانیوں کے، صحافت کے نام پر جتنے بڑی صحافی عرب دنیا میں سیکولر ازم کے علم بردار پیدا ہوتے وہ سارے کے سارے لبنان سے پیدا ہوتے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ لبنان کو کس کام کے لئے تیار کیا جارہا تھا، کیوں ایسا ہورہا تھا اس سے پتہ چلا کہ جو کام وہ کرنا چاہتے ہیں اس کی وہ کئی سو سال پہلے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اور ان کے ذہن میں کام کرنے کا ایک مکمل نقشہ کام شروع کرنے سے پہلے موجود ہوتا ہے۔

گذشتہ دو ڈھائی سو سال ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اسی طرح منظم محنت کی گئی۔ کم زور طبقات کے بارے میں یہ کوشش ہوئی کہ انہیں عیسائیت کی طرف

Marfat.com

لایا جائے۔ ہندوؤں کے اچھوتوں اور کم زور طبقات کو عیسائیت میں داخل کرلو، وہ عیسائی ہو گئے وہ جھاڑو برتن اسی طرح کرتے رہے، بھنگی کا کام کرتے رہے، خاک روبی کا کام کرتے رہے۔ مسلمانوں نے کہا چلو ٹھیک ہے پہلے ہندو تھے اب عیسائی ہو گئے، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی نے کوئی توجہ نہیں دی کہ عیسائی ہو گیا تو ٹھیک ہے، نہیں ہوا تو ٹھیک ہے۔ بھنگی رہا تو ٹھیک ہے، نہیں رہا تو ٹھیک ہے، کسی مسلمان نے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کے بعد انہوں نے جب ایک بڑا طبقہ بن گیا اور تین چار نسلیں اس پر گزر گئیں، دو تین نسلیں گزرنے کے بعد ان میں پختگی آتی ہے، ورنہ وقتی طور پر آدمی نہیں سوچ سکتا کہ ہمیں کوئی کسی اور مقصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ دو تین نسلوں کے بعد پختگی آ گئی تو انہوں نے اس طبقے میں سے افراد کو چھانٹنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ انہیں انگلستان اور امریکا میں اعلیٰ تعلیم دینا شروع کی۔ آج آپ کو ملے گا کہ فلاں بڑے شہر کا جو میئر ہے وہ پاکستانی ہے، لیکن یہ کہاں کا پاکستانی ہے؟ فلاں ایک بشپ پاکستانی بن گیا ہے، فلاں شہر کا، وہ کون ہے کوئی غور نہیں کرتا، کوئی نہیں سوچتا۔ یہ لوگ اس طرح کے طبقے سے لوگوں کو لے کر اوپر لا رہے ہیں، اس کے بعد انہیں اہم مناسب پر عدلیہ میں پھر سول سروس میں، پولیس میں لا کر بٹھا رہے ہیں۔ ہمارا مزاج یہ ہے کہ انگلستان کا پڑھا ہوا تعلیم یافتہ اور انگریزوں کی طرح سے انگریزی فر فر بولتا ہوا اور فراٹے سے انگریزی میں باتیں کرتا ہوا ہمارے ہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور فرق بھی محسوس کیا گیا کہ معاشرے میں ایک تھوڑا سا تاثر یہ تھا کہ یہ بھنگی تھا یہ چوڑا تھا، یہ الفاظ ہمارے ہاں بدقسمتی سے استعمال ہوتے رہے۔ اس بنا پر اس کی بات کو اس طرح اہمیت نہیں دیتے۔ اب ایک تجویز یہ چلی ہے کہ کسی طرح ان کا سماجی پس منظر اور بیک گراؤنڈ تبدیل کر دیا جائے، اور ان کی اس کم زوری کو اُن سے دور کیا جائے اس کی صورت یہ نکالی گئی ہے کہ یہاں سے بچوں کو نوجوانوں کو چھوٹی عمر میں لے جایا جائے ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں اور وہ ساری عمر انگلستان میں بڑے تعلیمی اداروں میں گزارے۔ اس کے بعد ان کا سماجی مرتبہ اتنا بڑا کر دیا جائے کہ وہ دنیائے اسلام میں

Marfat.com

آئیں اور یہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں۔

یہ کوشش جب کی گئی تو معلوم ہوا کہ مسلمان ممالک میں جن کے نام میں بھی بشیر مسیح، فلپ یا پیٹرک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو عیسائی ہے، عرب دنیا میں انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کو آزمایا تھا، مصر وغیرہ میں لبنان میں۔ اب یہاں بھی اس کو آزما رہے ہیں۔ عرب دنیا میں آج سے ۵۰ سال پہلے ۶۰ سال پہلے یہ طے کیا کہ جو شخص عیسائی ہو وہ نام انگریزی یا یورپین زبان کا اختیار نہ کرے، بل کہ وہ عربی نام ہی اپنائے، آپ کو الیاس، بہت ملیں گے، وہاں عرب میں دنیائے مصر میں بے شمار عرب نام رکھنے والے ملیں گے ابراہیم اور موسیٰ عیسیٰ وغیرہ، آپ کو کوئی اندازہ ان کے لب و لہجے سے نہیں ہوگا کہ یہ عیسائی ہے۔ مجھے ایک شخص ملا جس کا نام تھا سبحان الیاس۔ سبحان الیاس تو خالص قرآن پاک کا لفظ ہے۔ وہ جامع ازہر سے حدیث میں پی ایچ ڈی تھا اور شاید ہم سب کو مجموعی طور پر ملا کر اتنی حدیثیں یاد نہ ہوں جتنی اس کو یاد تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ عیسائی ہے اور بچپن سے عیسائی تھا، پیدائشی عیسائی تھا لیکن کسی ایسے ماں باپ کی اولاد تھا جو مصر میں کسی معمولی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، نوجوانی میں اس کے ماں باپ کو عیسائی بنالیا تھا اور اس کی پرورش لبنان میں ہوئی تھی اور لبنان میں ہی اس کی پیدائش ہوئی تھی اور پیدائش کے بعد اس کو کہیں باہر انگلستان وغیرہ میں لے گئے تھے، وہاں سے اس کو جامع ازہر میں پی ایچ ڈی کے لئے بھیجا، پتہ نہیں عیسائی کہہ کر داخل ہوا تھا یا مسلمان بن کر لیکن وہاں سے حدیث میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور اب وہ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو ویٹی کن سٹی میں متعین تھا، جو کیتھولک عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز ہے، وہاں ان کا ایک سیکرٹریٹ تھا، جو مسلمانوں سے تعلقات رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے، اس سیکرٹریٹ میں اہم ذمے داری پر فائز تھا، نہ اس کے نام سے اندازہ ہوتا تھا نہ اس کی تعلیم سے اندازہ ہوتا تھا، نہ اس کی گفت گو سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عیسائی ہے۔ اب پاکستان میں آپ کو بے شمار ملیں گے۔ عبدالقیوم کے نام کے ایک یہاں پروفیسر عبدالقیوم تھا جو کرسچئن سینٹر کا ڈائریکٹر تھا اور عیسائیت کا زبردست فاضل تھا، غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا لیکن عیسائی تھا، مشنریز کا

Marfat.com

سربراہ تھا اور پوری عیسائی سرگرمیوں کا ذمے دار تھا۔

بشیر الدین کے نام سے آپ کو بہت سے عیسائی ملیں گے اور اگر آپ غور کریں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے جو رسالے نکلتے ہیں اس کو آپ کبھی کبھی پڑھا کریں آپ کو عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے مسلمان نام رکھنے والے سیکڑوں کی تعداد میں ملیں گے، ان کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا مسلم معاشرے میں رہتے ہوں گے میڈیکل ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس کرتے ہوں گے، عبدالقیوم نام ہوگا، ڈاکٹر عبدالقیوم سیالکوٹی آپ کو ساری عمر پتہ نہیں چلے گا کہ یہ عیسائی ہے لیکن وہ ہوگا عیسائی عیسائیت کی تبلیغ کرتا ہوگا۔

ایک تجویز یہ آئی کہ آدمی جب مسلمان سے عیسائی ہوتا ہے تو مسلم معاشرے سے کٹ جاتا ہے اور مسلم معاشرے سے کٹ جانے کے خوف سے عیسائیت قبول نہیں کرتا، یہ بڑا دھڑکا ہوتا ہے، یہ انہوں نے غور وفکر کر کے پتہ لگا، یا اس کے حل انہوں نے یہ نکالا کہ وہ تمام تدابیر اختیار کی جائیں کہ ایک نیا عیسائی مسلم معاشرے سے کٹنے نہ پائے بل کہ اسی معاشرے کا عیسائی رہے، اور اس معاشرے کے نسبتاً جو زیادہ سیکولر لوگ ہیں ان میں وہ گھل مل جائے اور اس سیکولر طبقے کو وہ اپنے قریب لانے کی کوشش کرے۔ اس کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے، اس کی تدابیر ان کو بتائی گئیں کہ یہ تدابیر اختیار کی جائیں، پھر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم معاشرے میں عیسائی جب ایک خاص تعداد ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے مذہبی مراسم کے لئے کوئی گرجا گھر بناتے ہیں تو مسلم معاشرے میں بڑا ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ کسی مسلم شہر میں گرجا بنائیں تو ردعمل ہوتا ہے، لوگ نکیر کرتے ہیں اعتراض کرتے ہیں کہ گرجا بنایا جارہا ہے، اب انہوں نے یہ طے کیا ہے کہ جو گرجا بنایا جائے گا وہ ایک خاص طرز کا ہوگا۔ اور اسلام آباد میں لقمان حکیم روڈ سے آپ گذریں تو وہاں پر آپ کو ایک گرجا نظر آئے گا، جا کر اس کو دیکھ لیجئے گا انہوں نے یہ طے کیا ہے کہ گرجا اس طرح کے بنائے جائیں کہ باہر سے مسجد میں اور گرجے میں کوئی فرق معلوم نہ ہو، دور سے دیکھ کر پتہ نہ چلے کہ یہ مسجد ہے یا گرجا ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ مسلمان تو بنانے نہیں دیں گے، مسجد کی شکل کا بنائیں گے، گنبد ہوگا، مینارہ ہوگا تو مسلمان اعتراض کریں گے اور بعض مسلم

Marfat.com

ممالک میں قوانین ایسے موجود ہیں جیسے پاکستان میں ہیں کہ جو مسلم امتیازی شعائر ہیں، ان کو غیر مسلم اختیار نہیں کرسکتا، اس طرح اور ممالک میں بھی یہ قوانین ہیں اس کا حل انہوں نے یہ نکالا ہے کہ ہم آپ کو اس طرح کہ ڈیزائن بنا کر دیں گے کہ جو سو فی صد مسلمانوں کی مسجد کا نمونہ تو نہ ہو لیکن درمیانے طور پر بین بین اس طرح کی چیز ہو کہ انجان آدمی اس کو گرجا نہ سمجھے، مسجد تو شاید سمجھ لے لیکن گرجا پر کسی کا گمان نہ ہو۔ اگر آپ اس گرجا کی عمارت کو دیکھیں کہ تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اس نقشے کے مطابق بنا ہے۔

پھر ایک تجویز ان کو یہ دی گئی اور اس پر بعض جگہ عمل ہونا شروع ہو گیا، پاکستان میں یہ سلسلہ شروع ہوا ہے کہ گرجا کو گرجا نہ کہا جائے چرچ نہ کہا جائے بل کہ اس کو مسیحی مسجد کہا جائے اور یہ کہا گیا کہ دیہاتیوں کو جاہلوں کو اس طرح کا تاثر دیا جائے کہ جیسے مسلمانوں میں وہابیوں کی مسجد اور غیر مقلدوں کی مسجد اور سنیوں کی مسجد اور بریلویوں کی مسجد اور فلاں فلاں مسجد کے نام ہیں اسی طرح سے مسیحیوں کی مسجد کے نام سے اسے مشہور کردیا جائے اور عیسائی وہاں آنے جانے میں کوئی جھجک اور تامل محسوس نہ کریں۔

یہ چند مثالیں تو میں نے آپ کو دی ہیں کہ کس طرح سے نئے انداز سے عیسائیت کی تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ یہ تفصیلات ایک رپورٹ سے ماخوذ ہیں۔ جب ہم نے ایک مرتبہ اسلام آباد میں یہ کورس شروع کیا تو اس رپورٹ کا ترجمہ کروایا تھا، جو مطبوعہ بھی تھا، ممکن ہے کہ اس کی ایک کاپی دعوۃ اکیڈمی کی لائبریری میں محفوظ ہو، یہ ایک سیمینار ہوا تھا ۱۹۷۸، ۷۹، ۸۰ء وغیرہ میں اور یہ سیمینار بڑا قابل ذکر سیمینار تھا جو چھ مہینے جاری رہا تھا اور اس میں دنیائے اسلام کے ہر بڑے ملک کے ایک ایک یا دو دو ایسے پادریوں کو بلایا گیا تھا جنہوں نے ۴۰، ۴۰، ۵۰، ۵۰ سال عیسائیت کی تبلیغ کی تھی اور عیسائیت کی تبلیغ میں ان کا تجربہ ایسا تھا کہ کوئی اور اتنے تجربے کا حامل نہیں تھا، اس سیمینار کی شکل انہوں نے یہ رکھی کہ ایک ہفتے ایک مسلم ملک پر غور وفکر کے لئے صرف کیا کہ ایک سینئر آدمی ہوگا جس کا ۴۰، ۵۰ سال کا تجربہ ہوگا۔ مثلاً پاکستان میں کام کرنے کا، وہ ایک پورے دن اپنی مشکلات بیان کرے گا اور اسے دو سال پہلے بتایا گیا کہ وہ اپنی مشکلات کا پورا اندازہ کر کے

Marfat.com

ایک رپورٹ تیار کرے، اس میں یہ بتائے کہ میری یہ مشکلات ہیں یہ رکاوٹیں ہیں پھر پورے بقیہ ہفتے کے چھ دن اس پر تبادلہ خیال ہو۔ ساری دنیا کے تجربہ کار عیسائی پادری اس پر غور کریں اور غور کرنے کے بعد ان مشکلات کو دور کرنے کی تجاویز مرتب کریں۔ اگلے ہفتہ اگلا ملک، اس سے اگلے ہفتے اگلا ملک۔ چھ مہینے کے اس سیمینار کے جو مقالہ جات تھے وہ شائع ہوئے اور خفیہ طور پر شائع کیئے گئے، لیکن کسی مسلمان کے ہاتھ لگ گئے، اس نے بڑی تعداد میں شائع کر کے اہل علم کو فراہم کر دیئے اور کسی عرب مخیرّ نے اس کا عربی ترجمہ بھی کروا دیا اور وہ چھپ گیا، وہ تو عام ملتا ہے، انگریزی ذرا مشکل سے دست یاب ہوتا ہے، اس کو آپ پڑھیں اس میں مختلف مضامین غور وفکر کے لائق ہیں، خاص طور پر پاکستان کے بارے میں جو مضمون ہے وہ واقعی ایسا ہے کہ اگر کوئی پڑھے تو اس کو کئی دن تک نیند نہ آئے اور پریشان رہے۔

اس رپورٹ کو پڑھ کر ہماری کیفیت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے بالکل آپ دشمن کے سامنے کھلی پلیٹ کے طور پر رکھے ہوں اور آپ کی طرف سے کوئی مدافعانہ کارروائی نہ ہو رہی ہو اور دشمن نے ایک ایک چیز کا ایکسرے اور سروے کر لیا ہو کہ کیا اندر ہے اور کیا باہر ہے۔ اس طرح کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ سیمینار امریکا میں ہوا تھا۔ میرے پاس اس کی اصل رپورٹ بھی ہے، اس کی عربی کاپی بھی ہے، اس کی ایک کاپی میں نے یہاں لائبریری میں جمع کروائی تھی غالباً عربی کا ایک نسخہ بھی ایک لائبریری کے لئے دیا تھا، یہاں اکیڈمی کی لائبریری میں ہوگا، بل کہ اگر ممکن ہو تو ایک سیشن اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے رکھیں، اس رپورٹ کی بھی کچھ کاپیاں کروا کے سب کو دے دیں اور اس پر تبادلہ خیال کریں کہ اس میں کیا ہے۔

یہ تو وہ چیزیں تھیں جس مین عیسائیت کی تبلیغ کی رکاوٹیں اور مشکلات پر غور کیا گیا کہ انہیں کس طرح دور کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور طویل منصوبہ بندی بھی ہے۔ ایک عظیم حکمت عملی کہ پوری دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیسے اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔ آج سے کچھ عرصے پہلے ۱۹۷۵ء میں ایک اجلاس ہوا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں ہوا تھا، غالباً ویٹی کن میں ہوا تھا، یہ ورلڈ کونسل آف چرچز

Marfat.com

کا اجلاس تھا، یعنی مجلس کلیسائے عالم آپ اسے کہہ سکتے ہیں یا مجلس کنیسائے عالم، اسے عربی میں المجلس العلمی للکنائس کہتے ہیں۔ اس کا ایک اجلاس ہوا تھا اور اس میں اسی طرح سے کئی مہینے کے غور و فکر کے بعد دنیائے اسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا ایک نقشہ بنایا گیا تھا کہ کس طرح کام کیا جائے اور گویا آئندہ ۲۵ سال کام کا وہ نقشہ تھا جو آخر بیسویں صدی کے ۲۵ سال ہیں اس میں دنیائے اسلام میں کیسے کام کیا جائے۔ اس کی ایک رپورٹ اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور نقشہ بھی ہاتھ لگ گیا تھا، جو انہوں نے پوری دنیا کا نقشہ شائع کیا تھا اور اس نقشے میں بتایا گیا تھا کہاں کہاں کیا کیا جائے گا۔ اس میں مختلف ملکوں میں کام کرنے کا نقشہ بنایا گیا تھا خاص طور پر تین ممالک اس کا بڑا ٹارگٹ تھے: سوڈان بنگلہ دیش اور انڈونیشیا۔

ان تین ممالک کو کیوں منتخب کیا گیا اس میں بڑی تفصیل سے بحث تھی، لیکن ان تین ممالک میں جو چیز قدر مشترک تھی وہ یہ تھی کہ یہاں غیر مسلموں کی ایک بڑی قابل ذکر آبادی موجود تھی، بنگلہ دیش میں تو ۲۵ فی صد ہندو ہیں، جنوبی سوڈان میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، انڈونیشیا میں کوئی ۲۰، ۲۲ فی صد کے قریب غیر مسلم تھے۔ ایک قدر مشترک تو یہ تھا، دوسرا قدر مشترک یہ تھا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد دین سے ناواقف اور دینی تعلیم سے عاری تھی، بنگلہ دیش میں بھی سوڈان میں بھی اور انڈونیشیا میں بھی۔ تیسرا بڑا قدر مشترک ان سب میں یہ تھا کہ یہ تینوں علاقے دنیائے اسلام کے تین کونوں پر واقع تھے۔ سوڈان ایک ایسے محل وقوع پر واقع ہے کہ ایک طرف اس کے ساری غیر مسلم آبادیاں ہیں، ایک طرف سے مسلم آبادیوں سے ملا ہوا ہے اور مسلم آبادیوں کو ہدف بنانے کے لئے اس راستے کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور ان کا جو حصہ غیر مسلموں سے ملا ہوا ہے، وہاں سے غیر مسلم کو مدد فراہم کی جاسکتی ہے۔ ان علاقوں کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے۔ یہی محل وقوع انڈونیشیا کا ہے، یہی محل وقوع بنگلہ دیش کا ہے، جغرافیے کی اعتبار سے ان تینوں ممالک کا تقریباً ایک جیسا محل وقوع تھا اور غور کریں تو آپ کو بہت قدر مشترک نظر آئے گی۔ ایک قدر مشترک یہ تھی کہ جو مسلمان ہیں یہاں وہ اپنی تعلیم کی کمی کے باوجود

Marfat.com

بڑے پر جوش اور جذباتی مسلمان تھے اور ان کے جوش اور جذبے کو اسلام کے بہ جائے عیسائیت کے مفاد میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا کیا جانا چاہئے۔ یہ اس رپورٹ میں لکھا ہوا تھا۔ اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ آئندہ ۲۵ سال میں یہاں عیسائیت کا ارتکاز اتنا کیا جائے کہ ان علاقوں کی ۲۰، ۲۵ فی صد آبادی کو عیسائیت بنا لیا جائے اور وہ ۲۵ فی صد آبادی تعلیم میں، تمدن میں، ملازمت میں، تجارت میں، مال و دولت میں اتنی مضبوط ہو کہ وہ بقیہ ۷۰ فی صد سے آگے ہو۔ یہ پروگرام اس رپورٹ میں دیا گیا تھا۔ اور اس ہدف کے لئے انہوں نے انڈونیشیا میں کام کا آغاز کیا، بنگلہ دیش اور سوڈان میں کام کا آغاز کیا۔ وہ جو تین چار نقشے میرے پاس تھے ان میں سے ایک انڈونیشیا کا نقشہ تھا، انڈونیشیا آپ کو معلوم ہے دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے، افسوس ہے دنیائے اسلام میں مسلمانوں کو مسلمانوں کا پتہ نہیں، انڈونیشیا دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے اور ساڑھے سات ہزار جزائر پر مشتمل ہے، آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۲۰ کروڑ کے لگ بھگ اس کی آبادی ہو گئی ہے، اور جو موجودہ دنیا ہے اس میں تین چار بڑے بڑے ایریاز میں اس کی رسائی ہے۔ اگر دنیا کا نقشہ آپ کے سامنے ہو تو دنیا کا سب سے بڑا سمندر Pacific ہے، Pacific کے ایک طرف چین ہے ایک طرف امریکا ہے، گویا Pacific ایک ایسا سمندر ہے جس میں دو بڑی طاقتوں کا ارتکاز ہے اور دنیا کی دو بڑی نیویاں Pacific میں ہیں۔ چین کی نیوی اور امریکا کی نیوی Nave Force اور Pacific کے آگے کچھ نہیں، وہاں کوئی جا نہیں سکتا، اس لئے کہ منجمد شمالی ہے اس میں آپ سمندر کے راستے کچھ نہیں کر سکتے، جنوب کی طرف آسٹریلیا ہے۔ جہاں کئی سو سال پہلے مقامی آبادی پر قبضہ کر لیا گیا تھا اور انہوں نے مقامی آبادی کو مار پیٹ کے برابر کر کے ختم کر لیا تھا۔ اور اب وہ گوروں کا ملک ہے، گویا ایک طرف وہاں آسٹریلیا بیٹھا ہے، ایک طرف امریکا ہے، ایک طرف چین ہے اور یہ پورا علاقہ ان کے کنٹرول میں ہے۔

اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈاکٹر سکارنو نے یہ محسوس کیا کہ جب تک انڈونیشیا کی نیوی، بہت مضبوط نہ ہو اس وقت تک انڈونیشیا کو اور اس کے پیچھے جو مسلم ممالک ہیں انہیں خطرہ رہے گا۔ چناں چہ سکارنو نے بہت بڑی نیوی بنائی، چین کے تعاون سے

Marfat.com

بنائی، چین کے اس میں کیا مفادات تھے معلوم نہیں، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن چین کے تعاون سے ایک بہت بڑی نیوی بنائی اور اس نیوی کو بہت مضبوطی سے تیار کیا کہ اس علاقے میں اگر انڈونیشیا کے مفاد کے خلاف خطرہ ہوتو نیوی وہاں کام دے۔ لیکن عیسائیوں نے بھی یہ محسوس کیا ہوا تھا کہ جب تک یہ جزیروں کا سلسلہ ان کے کنٹرول میں نہ آئے اس وقت تک انڈونیشیا کو ان سے خطرہ رہے گا اور پورے Pacific پر ان کا سوفی صد کنٹرول نہیں ہو سکے گا، اس لئے کہ چین ان کے ہاتھ سے نکلے گا کبھی نہ کبھی جیسے اب نکل گیا ہے تو چین اور انڈونیشیا کی نیوی کے درمیان اتحاد ہو جائے تو یہ اس پورے علاقے پر عیسائیت کی بالادستی کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ اس لئے انہوں نے انڈونیشیا کی قوت کو توڑنا چاہا، اور انڈونیشیا کی نیوی کو ختم کرنا چاہا اور انڈونیشیا میں عیسائیوں کی ایک بڑی طاقت پیدا کرنی چاہی، یہ تھوڑا بہت اختصار کے ساتھ اس معاملے کا ایک پس منظر ہے کہ انڈونیشیا کو اتنی اہمیت انہوں نے کیوں دی۔

انہوں نے محسوس کیا ان ساڑھے سات ہزار جزائر میں تین ساڑھے تین ہزار جزائر غیر آباد ہیں، وہاں کوئی رہتا ہی نہیں اس لئے نہیں رہتا کہ تھوڑا دور ہے اور عام آدمی کے پاس کشتی رانی کے وسائل اتنے نہیں کہ وہاں آجا سکے یا وہاں اس جگہ کو آباد کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت ہے اور وسائل موجود نہیں ہیں، ٹریکٹر نہیں ہے، اب ایک آدمی ایک ٹریکٹر چھوٹی سی کشتی میں رکھ کر کیسے لے جائے، چار میل لمبا پانچ میل لمبا جزیرہ ہے، یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ٹریکٹر لے جائیں استعمال بھی کریں اور واپس بھی لے آئیں۔ فل ٹریکٹر رکھیں تو وہ ضرورت سے زیادہ ہے، وہاں اس طرح کے مسائل تھے جس کی وجہ سے زمینیں غیر آباد تھیں، وہ جزائر عیسائی پادریوں نے خریدے کہ ہم ان جزائر کو آباد کریں گے اور آباد کرنے کے بعد ہم ان جزیروں کو قابل کاشت بنائیں گے اور قابل کاشت بنانے کے بعد ہم غریب کسانوں کو دیں گے۔ ہمارے یہاں دنیائے اسلام میں کوئی گورا آکر وعدہ کرے کہ ہم آپ کو دو چار پیسے دیں گے تو ہمارا ہر آدمی آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے ہو جاتا ہے، کوئی نہیں سوچتا کہ کیوں دے رہا ہے، اس کو ہم سے کیا محبت پیدا ہوگئی، ہمارے

Marfat.com

لئے کیا اس کے اندر جذبہ پیدا ہو گیا، انہوں نے کہا ٹھیک ہے، بناؤ گورنمنٹ نے اجازت دے دی، سوئیکارنو صاحب نے انہیں اجازت دے دی۔ ان کے بعد سوہارتو نے بھی اجازت دے دی، انہوں نے اس طرح کئی سو جزیرے آباد کئے، ان میں ہیلی پیڈ بنائے ان کو کشتیوں کے ایک نظام سے منسلک کیا اور وہاں عیسائیت کی تبلیغ شروع کی، جو انڈونیشیا کے بڑے جزائر تھے جیسے جاوا، سماٹرا دو بڑے جزائر ہیں اور یہاں یہ طے کیا کہ جو آدمی عیسائیت قبول کرے گا اس کو اتنی زمین قابل کاشت مفت ملے گی، اور اس کو وہاں مفت لے جائیں گے، اور زمین اس کے حوالے کریں گے، مکان بنا ہوگا، سب کچھ بنا ہوگا۔

انڈونیشیا میں مکان بنانا مشکل نہیں، جنگلات بے شمار ہیں اور برساتی علاقہ ہے، نہ سردی ہوتی نہ گرمی ہوتی ہے، پورے سال ایک جیسا موسم رہتا ہے، جیسے ہمارے یہاں موسم اکتوبر میں رہتا ہے اس طرح کا موسم پورے سال رہتا ہے تو نہ وہاں ہیٹر کی ضرورت ہے نہ اے سی کی ضرورت ہے، نہ بجلی کی۔ لکڑی اور بانس لے کر چھت ڈال لیں، تاکہ بارش کا پانی اندر نہ جائے، یہ مکان ہو گیا، اس میں لوگ رہتے ہیں، بڑی تعداد میں اسی طرح کے مکان ہیں، اس طرح کے مکانات انہوں نے بنائے، زمین قابل کاشت کی اور جو شخص عیسائی ہو گیا اسے دے دی، اس طرح سے انہوں نے سیکڑوں جزیروں کو آباد کر کے وہاں عیسائیوں کو لا کر آباد کر دیا، اور عیسائیوں سے بھر دیا۔ ان جزائر کو اب وہ کہتے ہیں کہ انڈونیشیا کے اتنے ہزار جزائر میں سے اتنے سو جزائر ہیں جہاں سو فی صد آبادی عیسائیوں کی ہے۔ جیسے ہماری لیڈر شپ عقل کی اندھی ہے وہاں کی لیڈر شپ بھی عقل کی اندھی ہے، انہوں نے نہیں سوچا کہ یہ ایک خاص سمت میں جزائر میں عیسائی آبادیاں بن رہی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کسی نے نہیں سوچا کہ سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور تھرپارکر جیسے سرحدی علاقوں میں عیسائیوں کی مشنریاں کیوں پھیل رہی ہیں، یہاں عیسائیت کیوں پنپ رہی ہے، کیوں کوئی نہیں سوچتا۔ پاکستان میں کسی نے نہیں سوچا کہ یہ ملک مذہب کے نام پر بنا تھا، مسلم اکثریت کے صوبوں میں بنا تھا، یہ طے ہوا تھا کہ مسلم اکثریت پاکستان میں غیر مسلم اکثریت ہندوستان میں جائے گی۔ یہاں ایک غیر مسلم اکثریت ملک کے خاص

Marfat.com

حصے میں اپنی آبادی جمع کر رہے ہیں اگر کل وہ مطالبہ کریں کہ جس بنیاد پر کل آپ الگ ہوئے تھے اس بنیاد پر آج ہم الگ ہونا چاہتے ہیں اور دنیا ان کا ساتھ دے تو آپ کیا کریں گے، لیکن ان سے بات کریں تو کہے گا کہ یہ مولوی ہے، بے وقوف ہے، اسے کچھ پتہ نہیں۔ کسی ذمے دار آدمی سے بات کریں تو وہ اسے کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ لیکن جب یہ مسئلہ اٹھ جائے گا تو روئیں گے کہ اب کیا کریں۔ یہی کچھ انڈونیشیا میں ہو رہا ہے کہ جزائر انہوں نے بنا دیئے ہیں اور لگتا ہے کہ کسی موقع پر انڈونیشیا کو وہ دو حصوں میں تقسیم کریں گے، ایک عیسائی اکثریت والا انڈونیشیا ایک مسلم اکثریت والا انڈونیشیا۔(۱) اس لئے کہ جزائر میں سرحد بنانا بہت دشوار ہے۔ آپ یہ کیسے تعین کریں گے کہ یہ جزیرہ انڈونیشیا میں شامل ہے، یا فلپائن میں شامل ہے، یا یہ جزیرہ ہانگ کانگ کا حصہ ہے یا فلاں کا حصہ ہے یا قریبی ملک کا۔ یہ حد بندی جزائر میں بڑی دشوار ہے، یہ ایک کام عیسائیت کا وہاں ہو رہا ہے ان جزیروں میں بڑے جزیروں میں ہیلی پیڈ بنے ہوئے ہیں۔ ہیلی کاپٹروں کا سسٹم انہوں نے بنایا ہے اور زیادہ بڑے جزائر میں ہسپتال، مکانات، قابل کاشت زمینیں اور کشتیوں کے پورے نظام سے اس کو باہم ملا دیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ایک زمانہ ایسا تھا، ۷۳، ۱۹۷۴ء، اور ۷۵ سے لے کر ۸۲، ۸۳، ۸۴ تک آٹھ سال کا، دس سال کا زمانہ ایسا گزرا کہ عیسائیوں کا غلبہ انڈونیشیا پر پکا تھا کچھ عرصے پہلے جو صدر صاحب تھے بڑے مذہبی بتائے جاتے تھے، انہوں نے ایک عیسائی عورت سے شادی کر رکھی تھی اور وہ عورت بڑی بااثر تھی اس کا بھائی تھا وہ بھی عیسائی تھا اور فوج میں کسی معمولی عہدے پر تھا ترقی کرتے کرتے انہوں نے اسے فیلڈ مارشل بنا دیا تھا اور فیلڈ مارشل پنگابیان اس کا نام تھا، پھر اس کو وزیر دفاع بھی بنا دیا، مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بھی اسے بنا دیا۔ اس نے عیسائی افسران کو بڑے پیمانے پر ترقیاں دیں اور وہ نیوی جس سے پورا مغرب خائف تھا اس نیوی میں سارے عیسائیوں کو اس نے لا کر بھر دیا۔ بعض سالوں کے اعداد و شمار میرے پاس ہیں، تازہ ترین تو نہیں ہیں لیکن ۱۹۷۸ کے اعداد و شمار ہیں ۱۹۸۰ کے کئی اعداد و شمار ہیں

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات آج سے ۱۴ برس قبل کہی تھی۔ آج یہ پیشین گوئی مشرقی تیمور کی شکل میں حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔

Marfat.com

اس میں ایک سال میں جتنے افسران کی نیوی میں بھرتی ہوئی اس میں ۹۰ فی صد عیسائی ۹۵ فی صد عیسائی تھے، اس طرح سے انہوں نے بڑی تعداد میں عیسائی بھرتی کر لئے، ظاہر ہے وہ نیوی سے نکالے تو نہیں گئے، آگے چل کر ان ہی میں سے کوئی ایڈمرل بنے گا، کوئی کمانڈر ان چیف بنے گا، کوئی کچھ بنے گا کوئی کچھ بنے گا۔ ان سے کہا گیا کہ سیکولر ہونا چاہئے مذہبی غیر جانب داری ہونی چاہئے، سب برابر ہیں، سب کو برابر کے مواقع ملنے چاہئیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر برابری کا سوال امریکا میں پیدا نہیں ہوتا۔ امریکا میں کبھی مسلمان فوج کا جنرل نہیں ہوتا، حال آں کہ وہاں بھی ۶۰ لاکھ مسلمان ہیں، فرانس میں ۶۰ لاکھ مسلمان ہیں، مگر کسی نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ وہاں کسی مسلمان کو اس بنا پر وزیر بنا دیا گیا کہ سب برابر ہیں، مسلمان بھی وزیر بنا دو۔ ان کے ہاں اس قسم کی برابری نہیں چلتی، لیکن ہمارے ہاں پتہ نہیں کہ کس نے دماغ میں ان کے بٹھا دیا ہے اور ہر وہ چیز جس کا ان کی طرف سے مطالبہ بھی نہیں ہوتا وہ از خود دینے کو تیار ہوتے ہیں اور جب بات کی جائے تو سننے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

یہاں پاکستان کے بڑے فرماں روا تھے، انتقال ہو گیا، انہوں نے پتہ نہیں کس کے کہنے پر از خود کہہ دیا کہ وزارت مذہبی امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، وزارت مذہبی امور اور وزارت اقلیتی امور۔ اقلیتی امور کی وزارت الگ ہوگی، کسی موقع پر کہیں عیسائیوں کے جلسے میں گئے وہاں اعلان کر دیا اور ایک کسی عیسائی کو بنا کر انہوں نے وزیر مقرر کر دیا کہ وہ اقلیتی امور کا وزیر ہوگا۔ ان سے اتفاق سے ملاقات کا مجھے موقع ملا۔ میں نے ان سے بات کی جناب والا یہ آپ نے ایسا بیج بو دیا ہے جس کی کئی شاخیں بھی نکلیں گی درخت بنے گا، اور وہ برگ و بار لائے گا۔ جب آپ ایک وزارت ایک عیسائی کو ہمیشہ کے لئے دے دیں گے تو گویا آپ نے ہمیشہ اس بات کا بندوبست کر دیا کہ آپ کی کابینہ میں ایک غیر مسلم ضرور بیٹھا ہوا اور وہ موجود ہو، پھر جب وہ وزیر ہوگا تو وہ اپنی قوم سے ووٹ لینے کے لئے اپنے مطالبات بھی کرے گا۔ مطالبات ایسے کرے گا کہ اس کی قوم اس کے ساتھ ہو، اور وہ آپ کو اپنے سے الگ ظاہر کرے، آپ کی پالیسیوں سے اختلاف کرے، تاکہ اپنی قوم میں لیڈر شپ کو پکا کرے، جیسا کہ آج کل کی مروج سیاست

Marfat.com

کا تقاضا ہے، تو ایسے ایسے مطالبات سامنے آئیں گے، ایسے ایسے حالات سامنے آئیں گے کہ آپ اس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکیں گے۔ اس کا فائدہ کیا ہوگا، کیا کہیں مسلم اکثریت کی وزارت انگلستان میں ہے؟ امریکا میں ہے؟ جتنے غیر مسلم یہاں ہیں اس سے زیادہ مسلم وہاں ہیں، ہندوستان میں کہیں مسلمانوں کے امور کی وزارت ہے، کسی سیکولر ملک میں ایسی کوئی چیز ملتی ہو جو وہاں ہو رہی ہو تو آپ کرتے اچھے لگیں؟ اس کا کوئی فائدہ نہیں، البتہ نقصانات کا امکان ہے، لیکن جیسے ہمارے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور کوئی اس طرح کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا انہوں نے بھی نہیں سنی، لہٰذا وزارت اقلیت کی موجود ہے، اور اس میں ہمارے مختلف عیسائی وزیر بھی ہوتے رہے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً طرح طرح کے مطالبات کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے یہ کہا کہ مذہب کا خانہ شناختی کارڈ میں نہیں آنے دیں گے اور یہ جو قادیانیوں کے خلاف آرڈیننس ہے، حال آں کہ وہ صرف قادیانیوں کے بارے میں ہے، مگر عیسائی اس پر سب سے زیادہ معترض ہیں، اور حدود کے معاملات میں جو مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص ہے، اس پر معترض ہیں۔ عیسائیوں کے جو رسالے پاکستان میں چھپتے ہیں اگر آپ دیکھیں، اور وقتاً فوقتاً ان کو دیکھنے کا اتفاق ہو جائے تو ان میں اس طرح کے مطالبے ہوتے ہیں اور بڑی جارحانہ اور فاش زبان میں ہوتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جس کے پیچھے ایک بہت بڑی قوت ہے جو اپنے اندر بہت بڑا اعتماد رکھتی ہے اور اس اعتماد کی بنیاد پر پوری مسلم امت سے ٹکرانے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ حکومتوں میں جان نہیں ہے، حکم راں کم زور ہیں یا تو مغرب کی طاقت سے خائف ہیں یا ویسے اپنے اندر دلی کم زوری کی وجہ سے یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہر معاملے میں غیر مسلموں کا ساتھ دیں گے۔

یہ یاد رکھیں کہ مسلمانوں کے مطالبے سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں ہے، مسلمان اکثریت کیا سوچتی ہے، کیا اس کے عزائم ہیں اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے، اور جو ایسی چیز ہوگی جس سے مغرب کی نظر میں اپنے کو بہت اونچا اعلیٰ ثابت کرسکیں وہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور مغرب اس کم زوری کو اچھی طرح سمجھتا ہے، وہ خود اپنے کو مسلمانوں میں مقبول

Marfat.com

بنانے کے لئے ایک فی صد بھی ایسی حرکت نہیں کرتا، کبھی آپ نے نہیں سنا ہوگا کہ انگلستان میں کسی نے مسلمانوں کے لئے الگ سے کوئی قانون بنایا ہو کہ مسلمانوں کے نظام میں یہ ہے، لہٰذا انہیں سہولت فراہم کرنے کے لئے یہ ترمیم کر دیں، یا کوئی وزارت مذہبی امور کی بنائی ہو یا ہندوستان میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو، حال آں کہ وہاں ۱۵ کروڑ مسلمان رہتے ہیں، یا انہوں نے مسلمانوں کے کسی معقول مطالبے پر بھی کان دھرا ہو، ایسا بالکل نہیں ہوتا، لیکن ہمارے یہاں لوگ اس طرح کے اسباب پیدا کرتے ہیں کہ اس سے غیر مسلموں کو مدد ملتی ہے، ان کے مقاصد میں پیش رفت ہوتی ہے، اور مسلمانوں کے مقاصد میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

ساری گفت گو کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ جو عیسائی مشنریز بڑی خدمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ہسپتال کھولتے ہوئے آنکھوں کا علاج کرتے ہوئے، ٹھیک ہے آنکھوں کا علاج اچھی چیز ہے لیکن اس کے پیچھے بہت بڑے عزائم ہیں اور ان عزائم کا مقابلہ آپ محض انہیں برا کہہ کہ نہیں کر سکتے، ایک عیسائی پادری جو دس ڈاکٹروں کو لاتا ہے اور مفت آپریشن کر دیتا ہے آپ کیسے کہیں گے کہ یہ برا ہے، لوگ اس طرح آپ کی بات نہیں مانیں گے، اسی طرح کی کوئی چیز آپ اس وقت کر سکتے ہیں جب دینی شعور پیدا ہو، اس کے بعد دینی شعور کے ساتھ خدمت خلق کا وہ رویہ بھی پیدا ہو جو اس طرح کے لوگوں کو متاثر کر سکے، اس کے بغیر محض یہ کہنے سے کہ ہمارے دین اور عقیدے کے خلاف ایک کوشش ہے، یہ چیز کام یاب نہیں ہو سکتی۔

اس صورت حال میں علمائے کرام کی ذمے داری سب سے نمایاں ہے، اس لئے کہ ان کا معاشرے سے ہر وقت رابطہ رہتا ہے لوگ ان سے ہر وقت پانچ وقت ملتے ہیں ان کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے، کسی آدمی کو اتنی رسائی عوام تک حاصل نہیں جتنی علمائے اکرام کو حاصل ہے، وہ اگر ایسا کام کریں تو جس سے لوگوں میں اعتماد بہ حال ہو اور اعتماد بہ حال ہوتا ہے صرف ایک چیز سے، اور وہ چیز اخلاص ہے، اخلاص سے اگر کام ہو جس کے پیچھے کوئی مادی مفاد نہ ہو تو پھر اس کا اثر ہوتا ہے مادی مفاد ہونا ایسی کوئی چیز ہو تو اس کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

ان ہی الفاظ کے ساتھ میں اجازت چاہتا ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

علامہ اقبالؒ کی تنقید مغرب

ماہنامہ دعوہ

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی۔ اسلام آباد

۲۰۰۲ء

Marfat.com

علامہ اقبالؒ کی تنقید مغرب

بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے فکری نقشے پر نظر ڈالی جائے تو حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا نام نامی بہت سے پہلوؤں سے بہت منفرد نظر آتا ہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب، مغربی افکار اور مغربی فلسفے و نظریات کا جس باریک بینی اور دقت نظر سے مطالعہ کیا اور مغربی تہذیب کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کر کے اسلامی تصورات اور اسلامی تہذیب کی برتری کو واضح کیا، وہ دور جدید کی فکری تاریخ کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مغربی ادبیات، شعر و ادب، فلسفہ و سیاست اور تہذیب و تمدن کا نہ صرف نظری اور فلسفیانہ اعتبار سے بڑا گہرا مطالعہ کیا بلکہ ان کو مغربی تہذیب کو براہ راست دیکھنے اور پرکھنے کا بھی اس وقت موقع ملا، جب یہ موقع مشرق میں کم لوگوں کو ملتا تھا۔ اس عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کی بنیاد پر انہوں نے جدید اسلامی فکر کی تاریخ میں پہلی بار مغرب کا سنجیدہ، عمیق، آزادانہ اور ناقدانہ مطالعہ کیا۔ ان کا منظوم کلام اور نثری تحریریں اس مطالعے کی شاہد عادل ہیں۔

یوں تو علامہ اقبالؒ کی تنقیدِ مغرب، جدید فکر اسلامی کے ایک اہم باب کی حیثیت سے ایک مستقل حیثیت کی حامل ہے اور آئندہ ایک طویل عرصے تک اس کی علمی اہمیت برقرار رہے گی، لیکن موجودہ بین الاقوامی حالات نے علامہ اقبال کی تنقید مغرب کو ہمارے لئے خصوصی اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ آج اسلام اور مغرب دو متحارب کیمپوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اسلام اور مغرب کا یہ محاربہ نیا نہیں، لیکن کیمونزم کے زوال اور

Marfat.com

سوویت یونین کی شکست وریخت نے کرہ ارض کو ایک یک قطبی دنیا میں بدل دیا ہے۔ اب یہاں ایک ہی قوت کی بالادستی ہے اور ایک ہی نظریہ اور فلسفہ بہ زور شمشیر دنیا میں نافذ کیا جا رہا ہے۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی قوتوں نے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور آج کی بالادست قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ البتہ دنیائے اسلام کے خاکستر سے کہیں کہیں دبی ہوئی چنگاریاں چمکتی دکھائی دے رہی ہیں، جو وقتاً فوقتاً اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

اس صورت حال کے بطن سے جو نیا عالمی نظام جنم لے رہا ہے، اس کی فکری تشریح و توضیح اور فلسفیانہ توجیہ کا کام مغربی مفکرین زور وشور سے کر رہے ہیں۔ کہیں تہذیبوں کے تصادم کے ضمن میں آخری کامیابی کا خواب دیکھا جا رہا ہے اور کہیں تاریخ کے خاتمے کی صورت میں استعماری عزائم کو علمی رنگ دیا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور مغرب ایک ناگزیر تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ تصادم دنیائے اسلام کی طرف سے نہیں ہے۔ یہاں سے تو تعاون، اور ہم آہنگی بل کہ بعض بعض صورتوں میں مکمل خود سپردگی کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ تصادم کی دعوت اکثر و بیشتر مغرب ہی سے آ رہی ہے۔

اس صورت حال میں ہم نہ مکمل علیحدگی اور لاتعلقی کا رویہ اپنا سکتے ہیں، اور نہ مکمل خود سپردگی اختیار کر سکتے ہیں۔ مزید برآں ابھی تک یہ واضح نہیں کہ اس تصادم کا اصل میدان کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عسکری تصادم نہ اسلام کے مفاد میں ہے اور نہ مغرب کے۔ مشرق سے زیادہ مغرب میں عسکری تصادم کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ تصادم کا ایک اور ممکنہ میدان معاشی ہو سکتا ہے۔ لیکن معاشی میدان میں تصادم کے بہ جائے عادلانہ مسابقت ہی فریقین کے لئے مثبت منزل کی طرف جانے کا محفوظ راستہ ہے۔ ان دونوں میدانوں سے بڑھ کر اہمیت رکھنے والا میدان فکری، تہذیبی اور نظریاتی تصادم ہے، اسی کے لئے دنیائے اسلام کو تیار رہنا چاہئے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب مسلمانوں کا مختلف مغربی طاقتوں سے سابقہ

Marfat.com

پڑا تو مغربی تہذیب وثقافت کے بارے میں عموماً تین رویے سامنے آئے۔

ایک رویہ قدیم روایت کے حامل علمائے کرام کا تھا جنہوں نے انتہائی اخلاص اور دردمندی سے یہ محسوس کیا کہ مغرب کی ہر چیز سے حتی المقدور دور رہنا اور اپنے آپ کو مسجد، مدرسے اور خانقاہ کی محفوظ پناگاہ میں بند کر لینا ہی اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بقا اور تحفظ کا ضامن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرز عمل کی پشت پر اخلاص، قربانی اور استغنا کا بے مثال جذبہ کارفرما تھا، جس نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو مغربی تمدن کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا۔ لیکن یہ بھی ایک افسوس ناک امر واقعہ ہے کہ مدافعت کا یہ طریقہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ تحفظ کے یہ جزیرے مغرب کے تہذیبی استیلا کے بڑھتے ہوئے سمندر میں گھرتے چلے گئے اور بیسویں صدی کے وسط سے ان کا زوال شروع ہو گیا۔

دوسرا رویہ مغرب کے سامنے مکمل خود سپردگی اور مغرب کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کا تھا۔ کم از کم برصغیر میں اس رویے کو زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اور ابتداً اس کے اثرات بہت محدود رہے۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رویئے کے علم برداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔

تیسرا رویہ آزادانہ اخذ واستفادے کا متوازن اور معتدل رویہ تھا جس کے سب سے نمایاں اور موثر داعی حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ تھے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی ہر مثبت چیز کو سراہا اور اپنایا، ہر منفی چیز پر نہ صرف دلائل کی بنیاد پر تنقید کی بلکہ اپنے قارئین کو اس کے منفی نتائج اور مضر اثرات سے بھی باخبر کیا۔

بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی فکر اسی تیسرے رویے کے ظہور سے عبارت ہے۔ یہ رویہ سابقہ دونوں رویوں سے ہٹ کر ایک متوازن اور متوسط نقطہ نظر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ پہلے دونوں رویوں کی شکست خوردہ اور فراری ذہنیت سے نالاں ہے، لیکن دونوں کی مثبت باتوں کو قبول کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس رویے کے سب سے بڑے علم بردار علامہ اقبالؒ ہیں، جنہوں نے جدید دنیائے اسلام میں پہلی بار مغربی فکر کی کمزوریوں کو دلائل وبراہین سے ثابت کیا اور مغربی طرز استدلال سے کام لے کر اسلامی

Marfat.com

عقائد اور نظریات کو بیان کیا۔ اس معاملے میں ان کو بڑی حد تک امام غزالی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جنہوں نے اپنے زمانے میں یہی کام یونانی فکر و فلسفے کے بارے میں کیا تھا۔ امام غزالی نے ایک طرف یونانی فلسفے و منطق پر انتہائی شدید تنقیدیں کیں، لیکن دوسری طرف منطق کے اسلوب استدلال سے کام لے کر اسلامی تصورات کی وضاحت بھی کی۔ ان کے اول الذکر کام یعنی تنقید مغرب کا سب سے نمایاں نمونہ ان کی کتاب تہافت الفلاسفہ ہے اور موخر الذکر کام یعنی مغربی طرز استدلال سے استفادے کا بہترین نمونہ المستصفی ہے۔ جس میں انہوں نے اصول فقہ کے خالص اسلامی اور دینی تصورات کو منطقی اسلوب میں بیان کیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ غزالی سے اس گہری مماثلت کے باوجود (غزالی نے مشرقی یورپ کی فکر کو تنقید کا موضوع بنایا اور علامہ اقبالؒ نے مغربی یورپ کی فکر کو) خود اقبالؒ کو اس مماثلت کا یا تو احساس نہیں ہوا یا انہوں نے اس احساس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ غزالی کے برعکس انہوں نے اپنی مماثلت جابہ جا مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ کی ہے، جن کا وہ خود کو مرید اور مسترشد قرار دیتے ہیں۔ بلاشبہ رومی سے ان کی مماثلت بڑی شدید اور واضح ہے، لیکن غزالی سے ان کی مماثلت بھی کم اہم نہیں۔

علامہ اقبالؒ کی تنقیدِ مغرب کے عمل کو تاریخی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور جو کم و بیش ۱۸۹۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۵ء تک پھیلا ہوا ہے، ان کے مطالعۂ مغرب کا دور ہے۔ اس دور میں انہوں نے مغربی افکار و نظریات سے گہری علمی واقفیت پیدا کی، نہ صرف انگریزی ادب و شاعری بل کہ فلسفے اور سیاست، تاریخ و تمدن اور معاشیات کا خصوصی مطالعہ کیا۔ مغربی معاشیات سے ان کی واقفیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ نہ صرف معاشیات کے استاد رہے، بل کہ انہوں نے جدید علم الاقتصاد پر اردو میں پہلی کتاب بھی لکھی۔ انگریزی ادب کے وہ شروع ہی سے طالب علم تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے استاد بھی رہے۔ اور کئی سال انگریزی ادب

Marfat.com

کے طلبہ کو انگریزی نظم ونثر کی اعلیٰ تعلیم بھی دیتے رہے۔ انگریزی ادب سے ان کی واقفیت محض ایک اچھے استاد ہونے تک محدود نہ تھی، بل کہ انہوں نے خود بھی بہ طور ادیب وشاعر، انگریزی ادب میں ڈوب کر اس کا مطالعہ کیا، اس کو اپنے اندر سمویا، اس کا گہرا ذوق حاصل کیا اور پھر انگریزی ادب اور شاعری کے تصورات اور اسلوب کو اردو شاعری کا جامہ پہنایا۔ بانگ درا کے حصہ اول میں ایسی نظمیں کثرت سے ہیں جو مختلف انگریزی شاعروں کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ اگر خود اقبالؒ یہ نشان دہی نہ کرتے کہ کون سی نظم کس انگریز شاعر سے ماخوذ ہے تو ان کے قارئین کے لیے اس کا پتہ چلانا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی ادب میں ڈوب کر اس کے مضامین کو اس طرح اپنے اندر سمویا ہے کہ شہد کی طرح یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ اس میں کس کس پھول کا رس شامل ہے۔ انہوں نے ان خالص انگریزی مضامین کو جس خوب صورتی سے اردو کا لباس پہنایا ہے وہ ان دونوں زبانوں کے ادب سے ان کی انتہائی گہری اور وسیع واقفیت کا غماز ہے۔

ایک موقع پر انہوں نے خود بیان کیا کہ وہ اپنے کسی اردو یا فارسی شعر کا خود ترجمہ کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جوں ہی اس شاعرانہ خیال یا تصور کو انگریزی میں بیان کرنا شروع کرتے ہیں تو وہ ترجمہ خود ایک شعر بن جاتا ہے۔ ترجمہ نہیں رہتا۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ تک جاتا ہے۔ یہ دور مغربی افکار ونظریات پر گہرے غور وخوض کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس پندرہ بیس سالہ مدت میں اقبالؒ نے مغربی فکر وعمل کے مختلف پہلوؤں پر گہرائی سے غور وفکر کیا۔ اس دور میں سامنے آنے والی بیشتر کتابوں اور منظومات میں مغربی فکر وعمل کے مختلف پہلوؤں پر گہرائی سے غور وفکر کیا۔ اس دور میں سامنے آنے والی بیشتر کتابوں اور منظومات میں مغربی افکار کی وضاحت اور تبیین تو ملتی ہے لیکن تنقید برائے نام ہے۔ بانگ درا کے دوسرے حصے کی نظمیں اور حصہ سوم کی بیشتر نظمیں بہ راہ راست مغربی حوالوں سے خالی ہیں۔ اسرار خودی (۱۹۱۵ء) اور رموز بے خودی (۱۹۱۸ء) میں بھی مغرب کے کسی پہلو پر بہ راہ راست تنقید کی زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔

تیسرا دور پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں اپنائی

Marfat.com

جانے والی مغربی پالیسیوں پر تبصرے سے شروع ہوتا ہے اور علامہ اقبالؒ کی وفات (۱۹۳۸ء) تک جاری رہتا ہے۔ اس دور کے آغاز میں ان کی تنقید کا بیشتر حصہ مغرب کی سیاسی پالیسیوں اور سیاسی تصورات پر ناقدانہ تبصروں پر مشتمل ہے۔ بانگ درا کی طویل نظموں خضر راہ اور طلوع اسلام میں خاص طور پر یہ رنگ نظر آتا ہے۔ پیام مشرق (۱۹۲۲ء) میں یہ تنقیدی تبصرے مختلف مغربی فلاسفہ، شعرا اور ادبا تک پھیل جاتے ہیں، لیکن پیام مشرق کی نظموں، قطعات اور رباعیات میں وہ کاٹ محسوس نہیں ہوتی جو بعد کے کلام میں نظر آتی ہے۔ پیام مشرق کا پہلا حصہ یعنی لالہ طور ۱۶۳ رباعیات پر مشتمل ہے اور تنقید مغرب سے قریب قریب خالی ہے۔ پیام مشرق کے جن حصوں میں مغربی افکار پر ناقدانہ تبصرے ملتے ہیں وہ افکار اور نقش فرنگ ہیں۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ پیام مشرق کی غزلوں میں کہیں بھی مغربی افکار کو تنقیدی تبصرے کا موضوع نہیں بنایا گیا۔ مے باقی میں صرف ایک غزل میں گوئیٹے کے وطن ویمر کا تذکرہ ملتا ہے جس کو اقبالؒ نے صبا کی معرفت سلام کہلایا ہے۔ اس کے برعکس زبور عجم کی غزلوں میں تنقید مغرب کا رنگ بہت گہرا ہے اور ان کی کاٹ بھی بہت شدید ہے۔ پیام مشرق کے بعد کی کوئی کتاب تنقید مغرب کے مواد سے خالی نہیں۔

تنقید مغرب کا بیشتر مواد بال جبریل، ضرب کلیم، زبور عجم اور پس چہ باید کرد میں ملتا ہے۔ یوں بہت سے اہم مباحث و اشارات جاوید نامہ اور ارمغان حجاز میں بھی موجود ہیں۔

مغربی فکر و فلسفے کی اہم بنیادیں

بال جبریل کی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں علامہ نے مغربی فکر و فلسفے کی حسب ذیل چار اہم بنیادوں کی نشان دہی کی ہے:

۱۔ شورش اصلاح دین

۲۔ عصمت پیر کنشت

۳۔ آزادی فکر

۴۔ انقلاب فرانسیس

Marfat.com

اقبالؒ نے جا بہ جا اپنی نثری تحریروں اور منظوم کلام میں اس فکری اور مذہبی پس منظر کا جائزہ لیا ہے جس کے نتیجے میں یورپ میں ایک نئی مذہبی فکر نے جنم لیا۔ مسیحیت کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے رہبانیت اور اس کے ظہور کے اسباب پر گفت گو کی ہے۔ مسیحیت میں رہبانیت کے در آنے کے اسباب کیا ہیں اس پر بھی اقبالؒ نے بحث کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مشرقی یورپ میں مسیحیت سے پہلے ہی رہبانیت پر مبنی تصورات موجود تھے۔ ان ہی تصورات نے افلاطون کو متاثر کیا جس کو اقبالؒ نے راہب دیرینہ کا لقب دیا ہے اور اس کے راہبانہ تصورات پر مبنی نظریات کو مذہب گوسفنداں کا لقب دیا ہے۔ اسرار خودی میں ایک دوسرے سیاق و سباق میں انہوں نے اس مذہب گوسفندی پر شدید تنقید کی ہے اور اسلامی تصوف پر اس کے منفی اثرات پر اظہار افسوس کیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ افلاطون کے ان ہی راہبانہ خیالات نے ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں حقائقِ زندگی سے فرار نیکی بن کر رہ گیا۔ ایک مرتبہ زندگی کے حقائق سے فرار کا عمل شروع ہو جائے تو اس کے اثرات زندگی کے دوسرے گوشوں پر بھی پڑ کر رہتے ہیں۔

افلاطون کے بارے میں اسرار خودی میں ایک پوری فصل میں گفت گو کی گئی ہے۔ اس فصل میں مثنوی معنوی کے اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اقبالؒ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ نفی خودی اور انکار ذات کے منفی تصورات بنی نوع انسان کی تاریخ میں مغلوب اور شکست خوردہ اقوام کی ایجاد رہے ہیں۔ اسی خفیہ دراندازی سے کام لے کر مغلوب اقوام غالب قوموں کے اخلاق کو بگاڑتی رہی ہیں۔

اس کے بعد ایک اور فصل میں افلاطون کے خیالات پر تنقید کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان قوم کے تصوف اور ادبیات پر افلاطونی خیالات کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور مسلمانوں کے ایک طبقے میں جو مسلک گوسفند نظر آتا ہے وہ افلاطون ہی کے اثر سے ہے، لہٰذا افلاطون کے تخیلات سے احتراز واجب ہے۔ اس سلسلۂ گفت گو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم

Marfat.com

رخشِ او در ظلمت معقول گم
در کہستانِ وجود افگندہ سم
گفت برّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندے در لباسِ آدم است
حکم او بر جانِ صوفی محکم است
عقل خود را بر سرِ گردوں رساند
عالم اسباب را افسانہ خواند
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتہ معدوم بود
راہب ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغاے ایں عالم نداشت
قومہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطونی راہبانیت پر اقبالؒ کی تنقید

افلاطونی راہبانیت پر اقبالؒ کی تنقید کے اہم پہلو یہ ہیں۔

ا۔اس کا اشہب فکر معقولات کی ظلمتوں میں گم ہے، بہ الفاظ دیگر اس کے مسافر کو نہ قلب سلیم کی رہ نمائی میسر ہے نہ روحانیت کی روشنی۔

۲۔اس کے نزدیک زندگی کا راز اور کام یابی کی اساس زندگی سے فرار یعنی فکرِ اجتماعی اور شعورِ ملی کی موت میں مضمر ہے۔

Marfat.com

۳۔ اس کے نزدیک عالم اسباب، بالفاظ دیگر عالم حقیقت محض ایک افسانہ ہے۔

۴۔ اس کی نظر میں جو چیز سود ہے وہ درحقیقت قوموں کا زیاں ہے۔

۵۔ اس کی حکمت واقعات کے انکار اور بود کو نابود قرار دینے میں پوشیدہ ہے۔

۶۔ اس کے نظریات کی ساری اٹھان اور اس کے افکار کی فطرت ایک موہوم خواب پر ہے۔ اس کا نظریہ اعیان ایک خواب اور ایک سراب سے بڑھ کر نہیں۔

۷۔ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور یہاں نشیب و فراز کے جو پیمانے کارفرما ہیں ان کا افلاطون عملاً انکار کرتا ہے۔

یہ تھی افلاطونی رہبانیت جو آگے چل کر مذہب عیسوی کا جزو لاینفک بن گئی۔ ایک بار جب زندگی سے فرار اور حقائق زندگی کے انکار کو مذہبی نظریات کی اساس کے طور پر قبول کر لیا جائے تو انسانی زندگی توازن برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ان حالات میں اس کا غیر متوازن ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ بال جبریل ہی کی ایک نظم میں علامہ اقبالؒ نے مغرب کی موجودہ لادینیت کو رہبانیت کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ دین و سیاست کے عنوان سے انہوں نے جو اشعار کہے ہیں ان میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ چوں کہ مسیحی کلیسا کی بنیاد رہبانیت پر تھی اس لئے اس میں دین و دنیا کا توازن برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ سلطنت اور رہبانیت دو متعارض رجحانات رکھتے ہیں۔ سلطنت کا تقاضا قوت کا حصول اور سربلندی کا حصول ہے، جب کہ رہبانیت پستی اور سربزیری سکھاتی ہے۔ کلیسا نے کئی سو سال رہبانیت کے منطقی نتائج بالخصوص لادینیت کے ظہور اور بداخلاقی کے عروج کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا اور دین و دولت میں ایک طویل عرصے کے لیے جدائی واقع ہوگئی۔ اسی جدائی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر جگہ ہوس کی اسیری اور ہوس کی وزیری دکھائی دیتی ہے۔ یہ دوئی آج ملک و دین کے لئے نامرادی اور ناکامی کی نقیب بن گئی ہے۔ اس دوئی کے نتیجے میں چشم تہذیب نابصیر ہوگئی ہے۔

Marfat.com

مغرب کا نظریہ تعلیم

مغرب کی اس لادینیت اور لااخلاقیت، یعنی نظام تعلیم اور قانون اجتماعی کا اخلاقی اقدار سے لاتعلق ہو جانے کا سب سے گہرا اور برا اثر مغرب کے نظریہ علم اور تصور تعلیم پر ہوا ہے۔ آج مغرب کا نظریہ علم ان تمام اخلاقی خرابیوں اور فکری خامیوں کا پورے طور پر شکار ہو چکا ہے جن کی علامہ اقبالؒ نے آج سے کم و بیش پچھتر سال قبل نشان دہی کی تھی۔ آج مغرب میں علم اور تعلیم کے وہ تمام نتائج بہ چشم دیکھے جا سکتے ہیں جس کا مشاہدہ علامہ اقبالؒ نے بہ چشم بصیرت تین چوتھائی صدی قبل کر لیا تھا۔

مغرب کے نظریہ علم اور تصور تعلیم پر اقبالؒ کی تنقید کے اہم عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ خرد کی طغیانی

۲۔ وحی و رسالت سے بےزاری

۳۔ اخلاق سے انحراف

۴۔ تعلیم کے اعلیٰ انسانی مقاصد کی فراموشی

۵۔ تعلیم کا استعماری استعمال

۶۔ لادینیت

آئندہ سطور میں ان موضوعات پر علامہ اقبالؒ کے خیالات کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

مغرب کے سائنسی افکار سے مسلمانوں کی مرعوبیت انیسویں صدی کے اوائل سے ہی نمایاں ہونے لگی تھی۔ چوں کہ سائنس کی ترقی کا سارا دارومدار علوم تجربی اور علوم تطبیقی کی ترقی پر تھا، اس لیے جیسے جیسے سائنسی ایجادات میں وسعت پیدا ہوتی گئی علوم تجربی کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ علوم تجربی کی بنیاد چوں کہ صرف مشاہدے اور تجربے پر ہوتی ہے، اس لیے تجربے اور مشاہدے کو اہل مغرب کی نظر میں اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ علم کے وہ میدان اور معرفت کے وہ ذرائع جن کی اساس تجربے اور مشاہدے پر نہیں تھی یا جو سائنسی

Marfat.com

ایجادات اور ترقیات پر بہ راہ راست اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے ان کی اہمیت گھٹتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف عقل اور مشاہدہ ذرائع علم قرار پائے اور وحی و رسالت کو نظر انداز کیا جانے لگا اور یوں عقل و دل، قلب و خرد اور علم و اخلاق میں دوری پیدا ہوتی چلی گئی۔ علم حصولی اور علم حضوری باہم متعارض سمجھے جانے لگے۔ اقبالؒ نے جگہ جگہ اس صورت حال پر شدید تنقید کی ہے اور عقل و دل اور قلب و خرد کے اس رشتۂ شکستہ کو دوبارہ جوڑنے کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے ان تمام نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو صرف عقل کی بنیاد پر علوم و فنون کا ارتقا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں ہے۔ عقل کی بنیاد تجربے، مشاہدے اور استدلال پر ہے جن سے ظن و تخمین سے بڑھ کر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں:

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

عقل اندر حکمِ دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

اقبالؒ کو یقیناً عقل پر کوئی اعتراض نہیں، نہ وہ بہ طور ایک مفکر اور فلسفی عقل کی اہمیت کے منکر ہیں۔ ان کی دل چسپی صرف یہ ہے کہ عقل تن تنہا امامت اور قیادت کا پرچم تھام کر نہ نکلے بل کہ قیادت اور رہ نمائی کا اصل فریضہ دل یعنی روحانی اقدار اور اخلاقی اصولوں کے سپرد کرے اور خود ان دونوں کے معاون کا کردار سنبھالے۔ کہتے ہیں:

تکیہ بر عقلِ جہاں بینِ فلاطون نکنم
در کنارم دلکے شوخ و نظر بازے ہست
گرچہ شاہینِ خرد بر سرِ پروازے ہست
اندریں بادیہ پنہاں قدر اندازے ہست

Marfat.com

یہ روحانی اقدار اور اخلاقی اصول انسان کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں جس کے اثرات سے انسان اعلیٰ روحانی اور بلند اخلاقی مقاصد کا مجسم نمونہ بن جاتا ہے۔ یہ گہرا روحانی جذبہ، یہ عمیق اور اخلاقی شعور اور یہ بے پناہ باطنی احساس عمل وہ چیز ہے جس کے لئے صوفیائے اسلام نے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ جن کا اقبالؒ اپنے کو پیروکار اور مرید کہتے ہیں اسی نظریۂ عشق کے علم بردار تھے۔ جس طرح مولانا رومیؒ نے اپنے زمانے میں یونانی عقلیات کے طغیان کو روحانیت کے دائرے میں لانے کی کام یاب کوشش کی، اسی طرح اقبالؒ نے اپنے زمانے میں عقلیات مغرب کے طوفان کو عشق کے نور سے منور کیا۔ مولانا سے اقبالؒ کی یہی وہ مشابہت اور مناسبت ہے جس کا انہوں نے بار بار ذکر کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن، او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں، من

چناں چہ رومی کی تقلید میں اقبالؒ بھی یہی کہتے ہیں کہ علم سراپا حجاب ہے اگر عشق سے لاتعلق ہو، اور عشق سراپا حضور ہے، لہٰذا وہ علم کی صحیح رہ نمائی کر سکتا ہے۔ علم کا منتہائے مقصود تخمین وظن ہے جو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے اس جنون ذو فنون کی ضرورت ہے جس کے بغیر اعلیٰ مقاصد کا حصول ناممکن ہے۔ علم استدلالی، علم مشاہدات اور علم تجربی زیادہ سے زیادہ مخلوقات یعنی مظاہر صفات تک پہنچا سکتا ہے۔ جب کہ عشق میں یہ قوت پنہاں ہے کہ وہ تماشائے ذات کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ علم اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچ کر جو سوالات پوچھتا ہے عشق ان کا جواب پہلے ہی مرحلے میں دے دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال علم مغرب سے ناامید ہیں کہ وہ دردِ دل اور جذبۂ عشق سے خالی ہے۔ اقبالؒ نہ صرف اس علم سے بے زار ہیں بل کہ اس عقل کے بھی مخالف ہیں جو نور قلبی سے مستنیر نہ ہو۔ زبور عجم میں کہتے ہیں:

Marfat.com

بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ
یک ذرّۂ، دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ
آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکت دارا بہ، از فرّ فریدوں بہ

اقبالؒ کی نظر میں وہ علم علم نہیں بل کہ کم بصری ہے جس میں تجلیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم ہم کنار نہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر علم قلب ونظر کا ندیم ہو تو اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور انحرافات کی خود ہی اصلاح کرتا رہتا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل ونظر کا ندیم

مغرب کی سائنسی ترقیاں، فنی کمالات اور علمی تحقیقات اقبالؒ کی نظر میں قابل قدر ہیں بہ شرطے کہ ان سب چیزوں کو فطرت کے سرود ازلی سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ اگر بینائے کواکب اور دانائے نباتات فطرت کے سرود ازلی سے باخبر نہیں تو اس کی تحقیقات بالآخر انسانیت کے لیے تباہی اور بربادی ہی کا باعث ہوں گی۔ جو قومیں فیضان سماوی سے محروم ہو کر علم وتحقیق کے میدان میں اترتی ہیں، ان کے کمالات کی حد برق وبخارات کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

مقاصدِ علم مغرب

اس خالص مادہ پرستانہ تصور علم کے اثرات مقاصد علم پر بھی پڑتے ہیں۔ اگر علم وتحقیق کے کمالات کی حد برق و بخارات ہیں تو مقاصد علم بھی جسمانی سہولتوں اور مادی آسائشوں سے آگے نہیں جاتے۔ اقبالؒ اس علم کو احرار کے حق میں علم نہیں زہر سمجھتے ہیں، جس کا حاصل جہاں میں دو کف جو سے بڑھ کر نہ ہو۔ اگر یہ عقل جو مہ وپروین کا شکار کھیلتی ہے انسان کے قلبی احساسات اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ خالص مادہ پرستانہ عقل کو اگر دلائل کے زور سے اسلامی عقائد کا قائل بھی

Marfat.com

کرلیا جائے تو یہ ایمان صرف عقل تک محدود رہتا ہے، اس کے نتیجے میں دل و نگاہ مسلمان نہیں بن سکتے۔

علم مغرب کے مادہ پرستانہ تصور اور مادہ پرستانہ مقاصد مغرب کی استعماری قوتوں کے نقیب بن گئے ہیں۔ اقبالؒ نے ضرب کلیم میں ایک پوری فصل تعلیم و تربیت کے عنوان سے شامل کی ہے جس میں مغرب کے تصور تعلیم اور اسلام کے تصور تعلیم پر بڑی عمیق اور بلیغ گفت گو کی ہے۔ اسی طرح ادبیات اور فنون لطیفہ کے عنوان سے ایک الگ فصل میں اسلامی تصورات ادب و فن اور مغرب کے تصور فن و ادب کا خوب تقابل کیا ہے۔ ان کی رائے میں مغرب نے علم و عرفان کے سرچشموں کو مکدر کر کے رکھ دیا ہے اور مغرب کے فلسفوں نے دنیا کو تیرہ تر کر دینے میں کسر نہیں چھوڑی۔ اس صورت حال میں ایک طرف عقل و خرد نالاں ہیں کہ ان کے پاس اس زہر کا نہ کوئی تریاق ہے اور نہ کوئی جھاڑ پھونک۔ ان حالات میں دل گیتی سوائے اس فریاد کے کہ وہ زہر کا شکار ہو چکا ہے کر بھی کیا سکتا ہے۔

علم مغرب کے مقاصد ممکن ہے ابتدا میں مثبت اور انسان دوست رہے ہوں، لیکن اب وہ استعماری اغراض سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ دانشورانِ مغرب کی زبانوں پر خوش کن نعرے اور دلوں میں منفی عزائم پنہاں ہیں۔ علامہ اقبال نے اس مضمون کو پیام مشرق کے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

برون او ہمہ بزم، درون او ہمہ رزم
زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است

نتائج علم مغرب

اقبالؒ کی رائے میں قلب و نظر کا فساد علم مغرب کے نتائج میں شاید سب سے نمایاں ہے۔ عصر حاضر کا یہ فساد ان کی نظر میں اتنا آشکار ہے کہ فلک بھی اس کی خرابی اور زشتی پر شرم سار معلوم ہوتا ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ اس علم کے زور پر طاقت ور قومیں کم زور قوموں کو چراگاہ سمجھتی ہیں۔ کم زور قومیں کاشت کرتی ہیں اور طاقت ور قومیں فصل کاٹتی

Marfat.com

ہیں۔ علم مغرب نے عالم اسلام میں بھی فکر و تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ ارمغان حجاز میں مسلمانوں سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

بہ افرنگی بتاں خود را سپُردی
چہ نامردانہ در بت خانہ مُردی
خرد بیگانۂ دل، سینہ بے نور
کہ از تاکِ نیاگاں مے نخُوردی

خرد بیگانۂ ذوقِ یقین است
قمار علم و حکمت بد نشین است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد
بنادانے کہ چشمش راہ بین است

علم مغرب کے نتائج بد میں تفریقِ اقوام و ملل بھی شامل ہے۔ حکمت فرنگ کا مقصود تفریق ملل اور اسلام کا مقصود ملت آدم ہے۔ وطنیت کی بنیاد پر قوموں کی تشکیل اور جغرافیائی مفادات کے حصول کے لئے اقوام کے مابین کشاکش اقبالؒ کی رائے میں تہذیب مغرب کی دین ہے۔ یہ بات کہ وطن اور جغرافیہ ملت کی اساس نہیں ہے فکر اقبالؒ کا نہ صرف ایک اہم ستون ہے بل کہ اقبالؒ کی تنقید مغرب کا ایک اہم عنصر بھی۔ رموزِ بے خودی میں جہاں پوری ایک فصل اس موضوع پر لکھی ہے کہ وطن ملت کی اساس نہیں وہاں وطنیت پر مبنی نظام کی خرابیاں بھی بتائی ہیں۔ جہاں جہاں وطن کی بنیاد پر ملتیں اور قومیں تشکیل دی گئی ہیں وہاں اخوت اور بھائی چارہ کی جڑیں کٹتی چلی گئی ہیں۔ وطن کو مرکز توجہ بنانے والوں نے نوع انسان کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ رموزِ بے خودی کے یہ اشعار فلسفہ وطنیت اور اس کے آغاز و نتائج پر اچھی طرح روشنی ڈالتے ہیں:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

Marfat.com

تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انسان را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسندِ مذہب گرفت
این شجر در گلشن مغرب گرفت
دہریت چوں جامۂ مذہب درید
مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید
آں فلارنساویؔ باطل پرست
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
بت گری مانندِ آزر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

نظریہ لادینیت

تاہم علامہ اقبالؒ کی تنقید مغرب کا شاید سب سے موثر اور قوی اظہار نظریہ لادینیت یعنی Seculrism کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔ لادینیت مغرب کے تصور علم اور تہذیب نصب العین کا لازمی اور اہم عنصر ہے۔ لادینیت کی تعریف خود اقبالؒ نے پس چہ

Marfat.com

بایدکرد اے اقوام شرق کے ایک حاشیے میں ان الفاظ میں کی ہے:

رسم لادینی یعنی نظام امور سیاست میں دین سے بے تعلق ہو جانا۔

یہ بے تعلقی ایک ایسی تلوار کے مترادف ہے جس کا شکار خود مغرب بھی ہوا ہے۔ آج پوری انسانیت فرنگ کی اس عجیب وغریب ایجاد سے بے زار و نالاں ہے۔ آج انسانوں کی بیشتر مشکلات کا سبب یہی رسم لادینی ہے۔ آدمیت آج جس غم پنہاں کا شکار ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ ایک مرتبہ جب دین و مذہب کو نظام امور سیاست سے لاتعلق کر دیا جائے تو انسان محض ایک جسمانی وجود رہ جاتا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک مشت خاک اور مجموعہ آب وگل کی رہ جاتی ہے اور زندگی کا یہ سارا کارواں بے مقصد بے منزل اور بے ہدف ٹھہرتا ہے۔ پس چہ باید کرد میں اسلام کے تصور علم اور مغرب کے تصور لادینیت کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم اشیا (سائنس وحکمت) جب مسلمانوں کی میراث تھی تو مشت خاک کو کیمیا بناتی تھی، لیکن افسوس جب سے علم اشیا فرنگی نژاد ہوا ہے اس کی تاثیر بدل کر رہ گئی ہے اب وہاں کھوٹے اور کھرے کے اخلاقی پیمانے ختم ہو گئے ہیں۔ جب عقل وفکر کی قلمرو سے خوب وشت کے اخلاقی پیمانے نکال دیئے جائیں تو انسانوں کے دل سنگ وخشت سے بدل جاتے ہیں، اور چشم آدم بے نم ہو جاتی ہے۔ شہر ودشت ہر جگہ علم اور اہل علم رسوائی کا سامان بنتے ہیں۔ ہوتے ہوتے کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فرشتہ صفت روحیں ابلیس کا پیکر اختیار کر لیتی ہیں۔

اقبالؒ کے نزدیک مغرب کے اس علم کو علم کہنا زیادتی ہے۔ دانش فرنگی ایک تیغ براں ہے جو نوع انسانی کی ہلاکت اور تباہی میں انتہائی کارگر ہے۔ اس دانش کے علم برداروں نے خیر وشر کا امتیاز اٹھا دیا ہے اور علم وہنر کا حقیقی ذوق اور عشق مٹ گیا ہے:

آہ از افرنگ و از آئینِ او

آہ از اندیشۂ لادینِ او

اس اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ اقبالؒ نے اپنے قاری، بالخصوص مسلمان قاری کو اس ساحری بل کہ کافری کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تعلیم بھی دی ہے اور

Marfat.com

کہا ہے کہ علم کے نام پر کھینچی جانے والی یہ تلوار رہزنوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے، لہٰذا یہ تلوار رہزنوں کے ہاتھ سے چھین لینی چاہئے اور اس لادینی تہذیب کا سحر توڑ دینا چاہئے۔ آج دنیا میں نقش نو کی ضرورت ہے، اس لیے کہ جنیوا کے کفن چوروں سے کسی بہتری کی امید نہیں۔ جنیوا میں سوائے مکروفن کے اور کیا ہے۔

تہذیب لادینی

علوم وفنون کے اس لادینی تصور کی بنیاد پر جو تہذیب کھڑی ہوئی ہے وہ ان تمام مفاسد کا مجموعہ ہے جو مذہب و اخلاق سے دوری کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ضرب کلیم اور پس چہ باید کرد میں خصوصیت کے ساتھ تہذیب مغرب کی کم زوریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب تہذیب کے نام پر دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں کو مختلف مغربی طاقتوں کے انتظام میں دیا جانے لگا تو اس پر اقبالؒ نے طنز سے بھرپور تبصرہ کیا۔

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب وعمیق
طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پر دم ہے بچۂ بدوں
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمہ جاری
نظروران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمیں مَدَنیّت سے ہے ابھی عاری!

لیکن اس شدید تنقید کے باوجود اقبالؒ نے کبھی بھی مغربی فکر اور مغربی تہذیب

Marfat.com

کے مثبت پہلوؤں کا اعتراف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ پیام مشرق کے دیباچے میں افغانستان کے فرماں روا امیر امان اللہ کو جو مشورے دیے ہیں اس میں واضح طور پر اہل مغرب کے مثبت تجربات سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا ہے۔ انہوں نے امیر امان اللہ کو بتایا کہ حکمت قرآن مجید کی رو سے خیر کثیر ہے اور یہ خیر جہاں سے بھی دست یاب ہو اسے حاصل کرنے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ یہی وہ علم اشیا اور علم اسما ہے جو دور جدید میں چوب کلیم اور ید بیضا کے مترادف ہے۔ مغرب کو جو ترقی حاصل ہوئی وہ اسی علم اشیا اور علم اسما کے ذریعے حاصل ہوئی۔ کم وبیش گیارہ سال کے بعد یہی مشورہ انہوں نے افغانستان کے ایک اور حکمراں ظاہر شاہ کو بھی دیا۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ کی کتاب اور اس کی عطا کردہ حکمت ہی کے ذریعے ملت کا اعتبار قائم ہوسکتا ہے۔ کتاب اللہ کے ذریعے جہاں ذوق وشوق کی فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور علم وحکمت کے ذریعے جہانِ تحت وفوق کی کامیاں اور فتوحات ملتی ہیں۔ یہ دونوں قسم کی کامیابیاں اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں۔ ایک انعام سے مسلمانوں کی زندگی میں جمال اور پاکیزگی کی شان پیدا ہوتی ہے اور دوسرے انعام سے جلال اور دنیوی شان وشکوہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ:

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذتِ ایجاد نیست

یہاں وہ اس غلط فہمی کی بھی تردید کردیتے ہیں کہ یہ سائنسی اور تجربی علوم مغرب کی ایجاد ہیں اس لئے مسلمانوں کو ان سے دور رہنا چاہیے۔ اقبالؒ بتاتے ہیں کہ اگر سائنس کی تاریخ کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سائنسی علوم دراصل مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ یہ جوہر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اہل مغرب تک پہنچا۔ عرب کے صحرانشینوں نے علم وحکمت کا جو بیج بویا تھا وہ اپنے وقت پر جب برگ وبار لایا تو اہل فرنگ نے اس کی فصل کاٹ لی۔ لہٰذا یہ سب کچھ دراصل مسلمانوں ہی کی گم شدہ میراث ہے، لیکن ان چیزوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے منفی پہلوؤں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

اقبال کہتے ہیں:

Marfat.com

لیکن از تہذیب لادینے گریز
زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد
لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر
روح از بے آبی او تشنہ میر

مغربی تہذیب کے کم زور پہلو

علم اور نظریہ علم کی کم زوریوں اور خامیوں پر تنقید، لادینیت سے اظہار برات اور مغربی تہذیب کی کم زوریوں کے علاوہ فرنگی تہذیب سے اقبالؒ کو جو بڑی بڑی شکایات ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مادیت اور مادہ پرستی
۲۔ خدا بے زاری
۳۔ لااخلاقیت
۴۔ مغربی فکر و تہذیب کا روحانی افلاس

ان چاروں اہم عناصر کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات ان کے منظوم کلام اور نثری تحریروں میں بہ کثرت دست یاب ہیں۔ ان موضوعات پر اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے استعارہ، کنایہ، رمز و ایما اور دیگر شاعرانہ اسالیب کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ کہیں تن و شکم کو مادیت کے لئے رمز کے طور پر استعمال کیا ہے اور کہیں دل اور من کو روحانیت کی رمز کے طور پر۔ ان کی رائے میں من کی دنیا سوز و مستی اور جذب و شوق یعنی عشق کی دنیا ہے، اس کے برعکس تن کی دنیا تمام تر سود و سودا اور مکر و فن سے عبارت ہے۔ مغربی تہذیب کی خدا بے زاری اور روحانیت سے دوری کو انہوں نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ کہیں درس فرنگ کو یاد کر کے حضور کی لذت اور حجاب دلیل

Marfat.com

کے درمیان فرق بتایا ہے۔ کہیں فیضان سماوی سے محرومی کے نتائج بتائے ہیں، کہیں کہا ہے کہ عشق کی تیغ وجگر دار تو کسی نے اڑا لی اور علم کے ہاتھ میں خالی نیام رہ گئی۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اگر علم و دانش خدا بے زار ہوں تو وہ نورانیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور خالص عقل و برہان پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ دانش برہانی حیرت کی فراوانی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ یہ مضمون بال جبریل، ضرب کلیم اور پس چہ باید کرد میں اتنے بھرپور انداز میں بیان ہوا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کا حوالہ دینا بھی مشکل ہے۔

مغربی تہذیب کی لا اخلاقیات اور مغربی فکر کا روحانی افلاس دو نظموں میں خاص طور پر بیان ہوا ہے، بال جبرائیل کی طویل نظم، لینن خدا کے حضور میں، اور پیام مشرق کے نقش فرنگ کی پہلی طویل نظم پیام میں یہ مضمون بڑے منفرد انداز میں سامنے آیا ہے۔ لینن کی زبان سے خدا کے حضور جو گزارشات کی گئی ہیں ان میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس روحانی افلاس کے نتیجے میں مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی اور مغرب کے خداوند چمکتے دمکتے سکے (درخشندہ فلزات) بن کر رہ گئے ہیں۔ یورپ میں بہ ظاہر بہت روشنی علم و ہنر نظر آتی ہے لیکن روحانی اعتبار سے یہ ایک ظلمات ہے جہاں حقیقی زندگی کے سرچشمے ناپید ہیں۔ مسیحیت کے سارے دعوؤں کے باوجود رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں، بینکوں کی عمارتیں گرجوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ وہاں تجارتی سرگرمیاں بہ ظاہر آزادانہ کاروبار ولین دین ہے لیکن درحقیقت یہ سب ایک جوا ہے جس کا فائدہ بالآخر استعمار کو ہی پہنچتا ہے۔ آج مغرب کے سودی نظام میں بہ ظاہر سود لینے والا تو ایک ہی شخص ہوتا ہے لیکن دراصل وہ لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات کا پیغام لے کر آتا ہے۔ بہ ظاہر اہل مغرب علم، تدبر، حکومت اور مساوات کے علم بردار معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان خوش نما پردوں کے پیچھے وہ قوموں کا لہو پی رہے ہیں۔ فرنگی تہذیب مشرقی ممالک میں جہاں جہاں گئی ہے وہاں بے روزگاری، عریانی وفحاشی، مے خواری، اور فقر و افلاس کے تحفے لے کر گئی ہے۔

نظری مباحث کے علاوہ اقبالؒ نے مغرب کی جن چیزوں کو تنقید کا موضوع بنایا ان میں مغرب کا استعماری نظام، مغربی جمہوریت، وطنیت اور نظام ملوکیت شامل ہیں۔

Marfat.com

پس چہ باید کرد میں ان جہاں بانوں کا ذکر کیا ہے جو سوداگروں کے بھیس میں آئے تھے، جن کی زبانوں پر خیر کے جملے اور فلاح و بہبود کے نعرے تھے، لیکن دلوں میں منفی عزائم اور مقاصد شر پوشیدہ تھے۔

جمہوریت اور معاشیات

بانگ درا کی طویل نظم خضر راہ میں سلطنت اور سرمایہ ومحنت کے عنوان سے مغرب کی جمہوریت اور مغرب کے معاشی نظام پر انتہائی بلیغ تبصرے کیے گئے ہیں۔ جمہوریت کے مظاہر دراصل دیو استبداد اور نظام قیصری کا اصل چہرہ چھپانے کے لئے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ خوش نما عنوانات عامۃ الناس کو اصل حقائق سے دور رکھنے کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اعضائے مجالس کی گرمی گفتار سرمایہ داروں کی ایک جنگ زرگری کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب کچھ ایک سراب رنگ و بو ہے جس کو ظاہر بیں لوگ گلستاں سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایک نئے انداز کا استعماری قفس ہے جس کو نادان قومیں آشیاں سمجھ بیٹھتی ہیں۔ نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ، یہ سب خیالی دیوتا ہیں جن کے نام پر محکوم قوموں کو نشے میں مبتلا کیا جاتا ہے اور وہ سکر کی لذت میں نقد حیات بھی لٹوا دیتے ہیں۔ جمہوریت کے بارے میں بالِ جبریل کے یہ دو شعر ضرب المثل ہیں:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جغرافیائی قومیت

مغربی جمہوریت ہی کا ایک شاخسانہ وطنی اور جغرافیائی قومیت ہے جس پر شاید اقبالؒ نے سب سے زیادہ تنقید کی ہے۔ ان کی تنقید کسی وطن یا ملک پر، یا وطن سے محبت اور تعلق کے فطری داعیے پر نہیں، بل کہ وطنیت پر بہ حیثیت ایک نئے سیاسی تصور کے ہے۔

Marfat.com

اقبالؒ وطنیت اور اسلام کو ایک دوسرے سے متعارض اور متناقض سمجھتے ہیں۔ان کی رائے میں وطنیت ایک بہت بڑا بت ہے جو تہذیب مغرب نے پیدا کیا ہے۔اس بت کا پیرہن دین و مذہب کا کفن ہے۔ بانگ درا کے حصہ سوم کے آغاز سے ہی اقبالؒ کو وطنیت کے اس شدید اور مہلک خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔

تصور وطنیت پر تنقید اقبالؒ کا وہ اہم موضوع ہے جو ان کے ہر مجموعہ کلام میں، حتیٰ کہ بہت سی انگریزی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ یہاں تک کہ قادیانیت پر ان کے معرکہ آرا مضامین میں بھی یہ مضمون ایک نئے انداز سے نظر آتا ہے۔ بانی قادیانیت پر ان کی شدید تنقید کا ایک محرک یہ بھی ہے کہ ان کے اس نیم مذہبی و نیم سیاسی گروہ کے وجود سے تصور امت کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ایک غیر عربی ہندی قائد کا وجود علاقائی وطنیت کے تصور کو پختہ کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی مختصر انگریزی یادداشتوں کا مجموعہ Stray Reflections بھی وطنیت پر شدید تنقید سے خالی نہیں۔ان تحریروں میں ایک جگہ تصور وطنیت کو انسانیت کا سب سے تباہ کن Dreadful دشمن قرار دیا گیا ہے۔ اپنی حیات ارضی کے آخری ایام میں بستر مرگ سے انہوں نے جو فاضلانہ بیان جاری کیا تھا اس میں بھی جغرافیائی حدود اور امت مسلمہ کے تصور سے بحث کی تھی اور اس غیر اسلامی دعوے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ اس معرکہ دین و وطن کو اس دور میں معرکہ خیبر سے بڑھ کر اہم قرار دیتے ہیں۔ وہاں بھی یہودیوں سے سابقہ تھا، یہاں بھی یہود وہنود اس تصور کے سب سے بڑے داعی اور مرید تھے۔ اس معرکہ دین و وطن کے لئے وہ کسی حیدر کرار کے منتظر تھے کہ کون اٹھ کر اس معرکے میں دین کا دفاع کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ خود ہی اس معرکے کے حیدر کرار ثابت ہوئے۔

مغرب کے سیاسی نظام کا ایک اور پہلو جو اقبالؒ کی تنقید کا موضوع بنا اشتراکیت وملوکیت ہے۔ اقبالؒ ان دونوں نظاموں کو انسانیت کے خلاف ایک ابلیسی کوشش قرار

Marfat.com

دیتے ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں خود ابلیس اور اس کے مشیروں کی زبان سے اشتراکیت اور ملوکیت کو ان کی اپنی کاوش بل کہ سازش قرار دیا ہے۔

جاوید نامے میں افغانی کی زبان سے مغرب کے سراپا مکروفن قائدین کو اس باطل نظریے کا موجد بتایا ہے۔ یہ دونوں چکی کے دو پاٹ ہیں جن کے درمیان انسانیت شیشے کی طرح پس رہی ہے۔ یہ دونوں نظام مادیت پر مبنی ہیں جن کی موجودگی میں سینہ بے نور رہتا ہے اور جان بے رنگ و بو رہتی ہے۔

اقبالؒ کی تنقید مغرب کا خلاصہ زبور عجم کے درج ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

زبور عجم میں ہی ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزان و یزداں دیریاب

مغربی فکر و دانش اور تہذیب و تمدن کی ہول ناکی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

اس زہر سے بچنے کا واحد تریاق جو اقبالؒ تجویز کرتے ہیں، یہ ہے:

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو
مومنِ خود کافرِ افرنگ شو

Marfat.com

مولانا سید زوار حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ یادگاری خطبات

خطبات کراچی

مجموعہ محاضرات

☆ اسلام اور مغرب، موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز
☆ اسلامی شریعت، مقاصد و حکمت
☆ اسلامی سزاؤں کا تصور اور مغربی قوانین، ایک تقابل
☆ علم سیرت اور مستشرقین

ڈاکٹر محمود احمد غازی
رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین

سید عزیز الرحمٰن

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے-۴/۱۷-ناظم آباد نمبر۴، کراچی-فون: ۳۶۶۸۴۷۹۰

www.rahet.org E-mail: info@rahet.org

Marfat.com

اضافوں کے ساتھ جدید ایڈیشن

اسلام اور مغرب تعلقات

ڈاکٹر محمود احمد غازی

Research Academy for Higher Education & Technology
RAHET
دار العلم والتحقیق
برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

Marfat.com